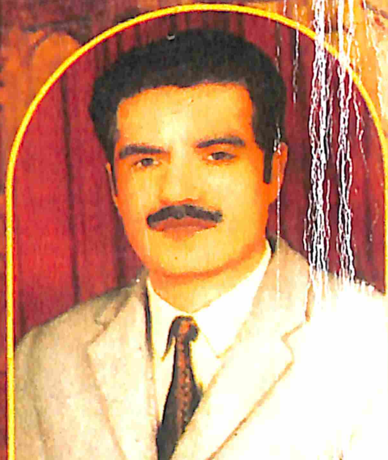
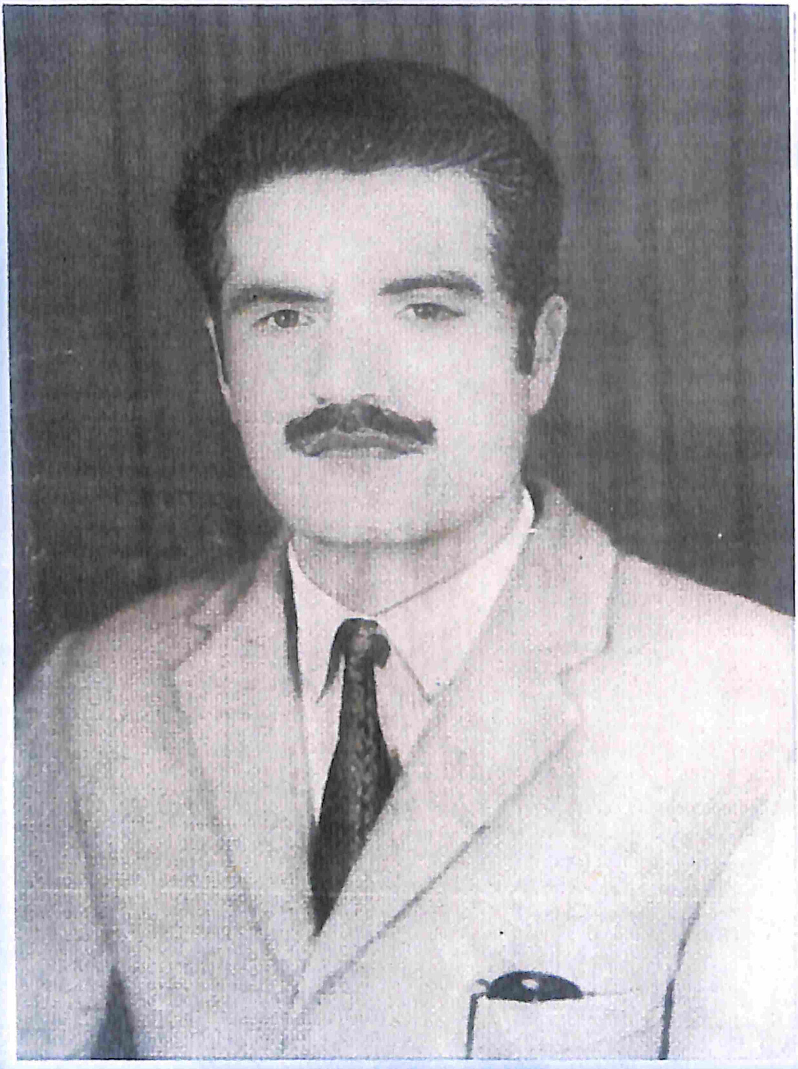
دیوانوں پہ کیا گزری

کشمیری حریت پسندوں پر پاکستان کے عقوبت خانوں
میں ڈھائے گئے ظلم وستم کی کہانیاں



محمد سعید اسعد

مقبول احمد بٹ



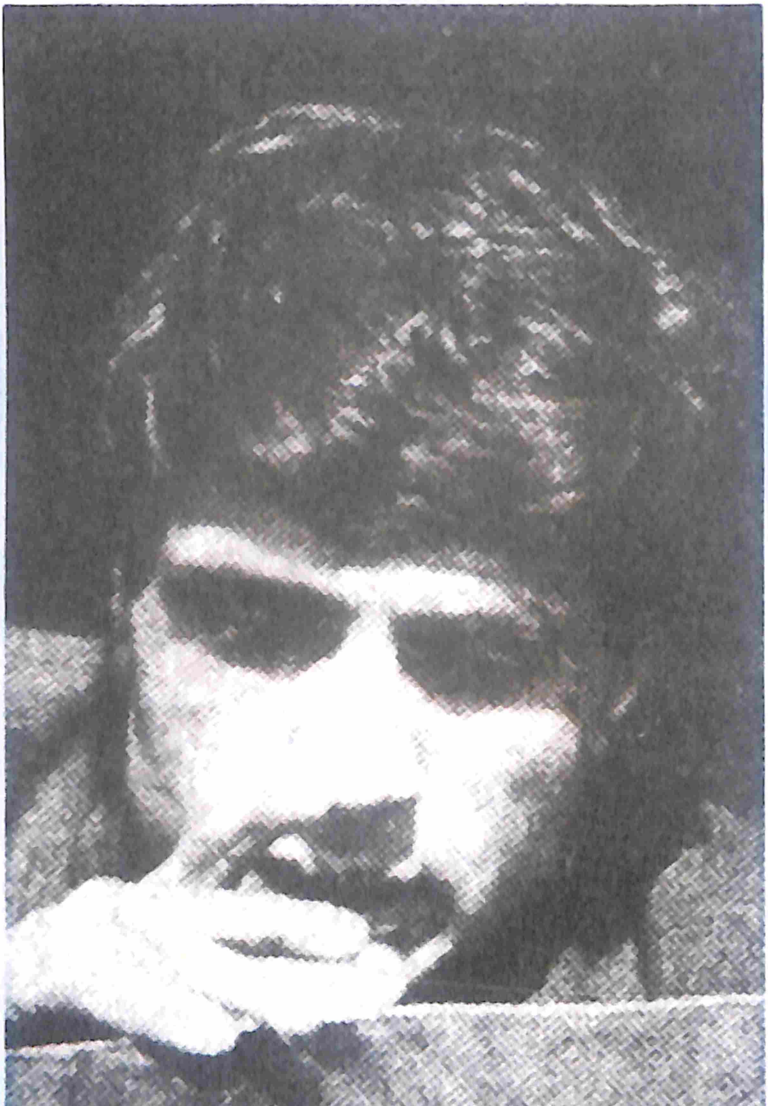
میر عبدالقیوم



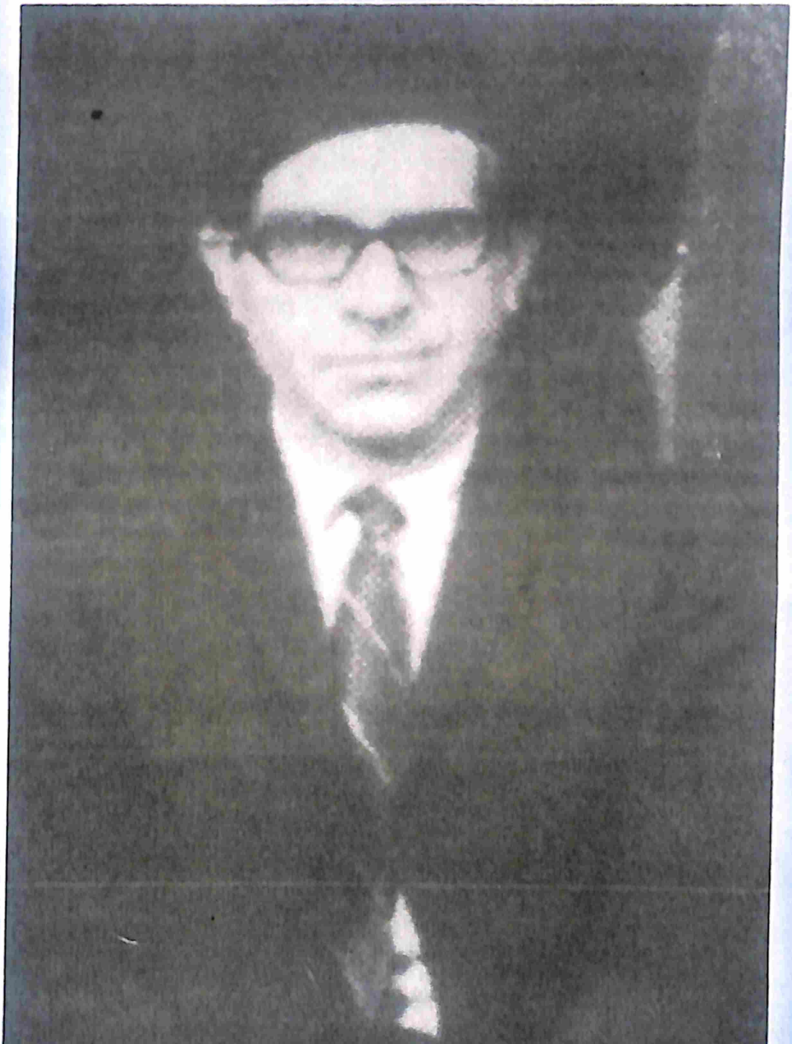
غلام محمد لون



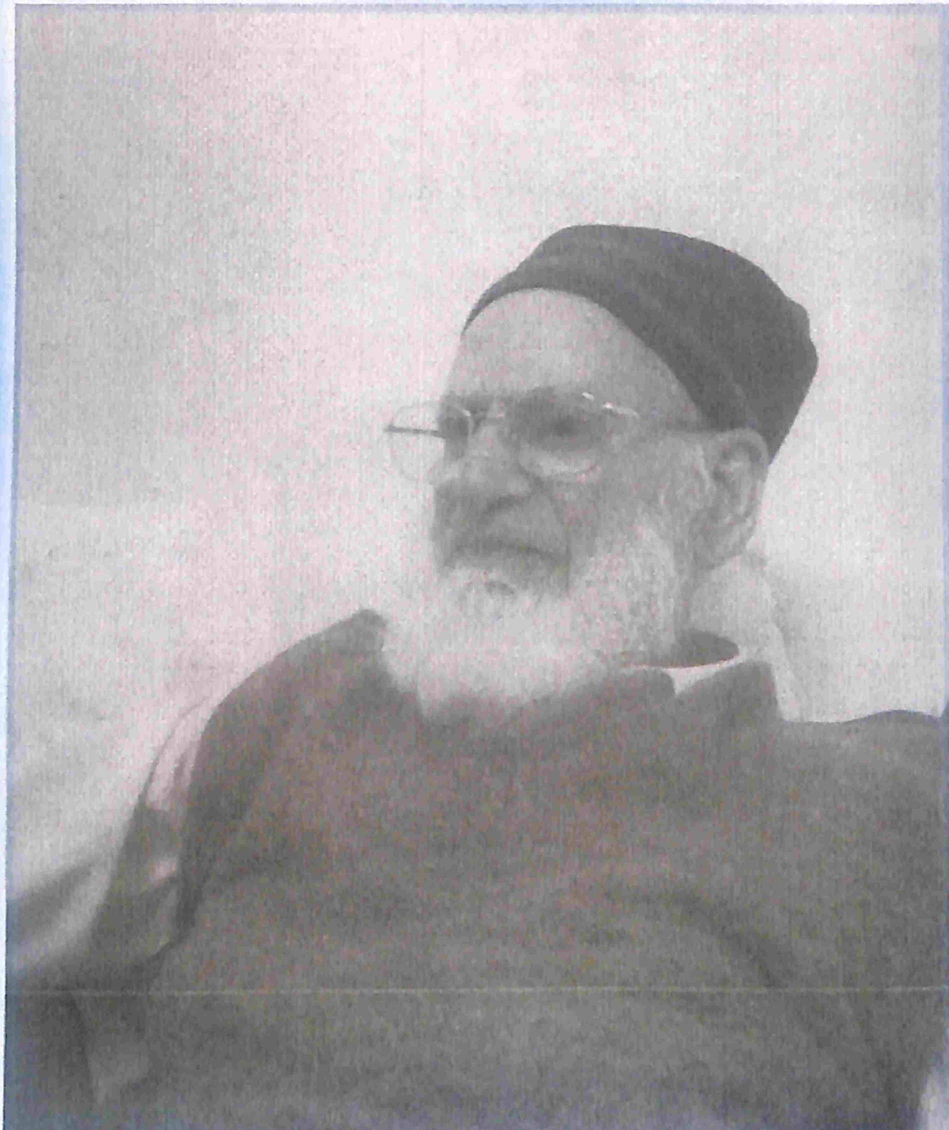
اشرف قریشی



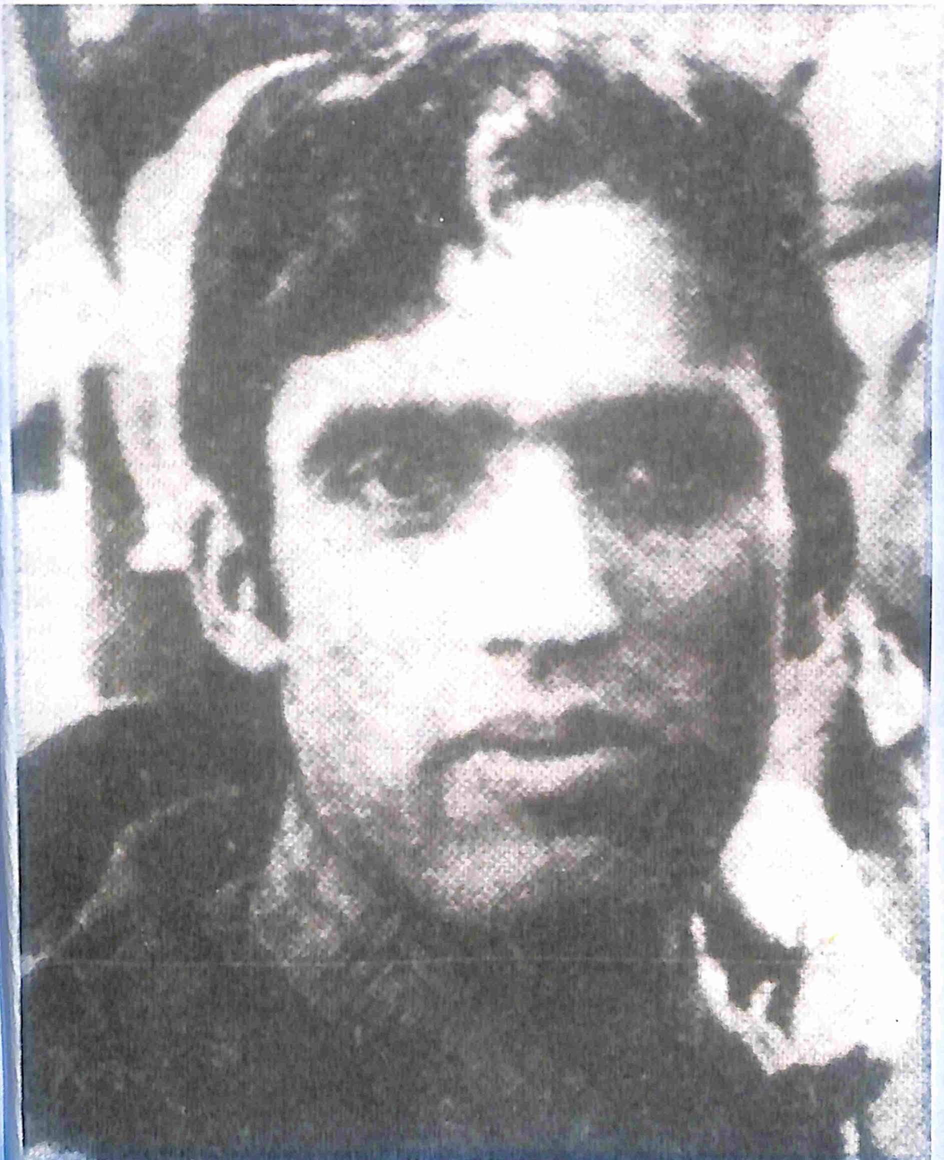
میر
عبدالمنان

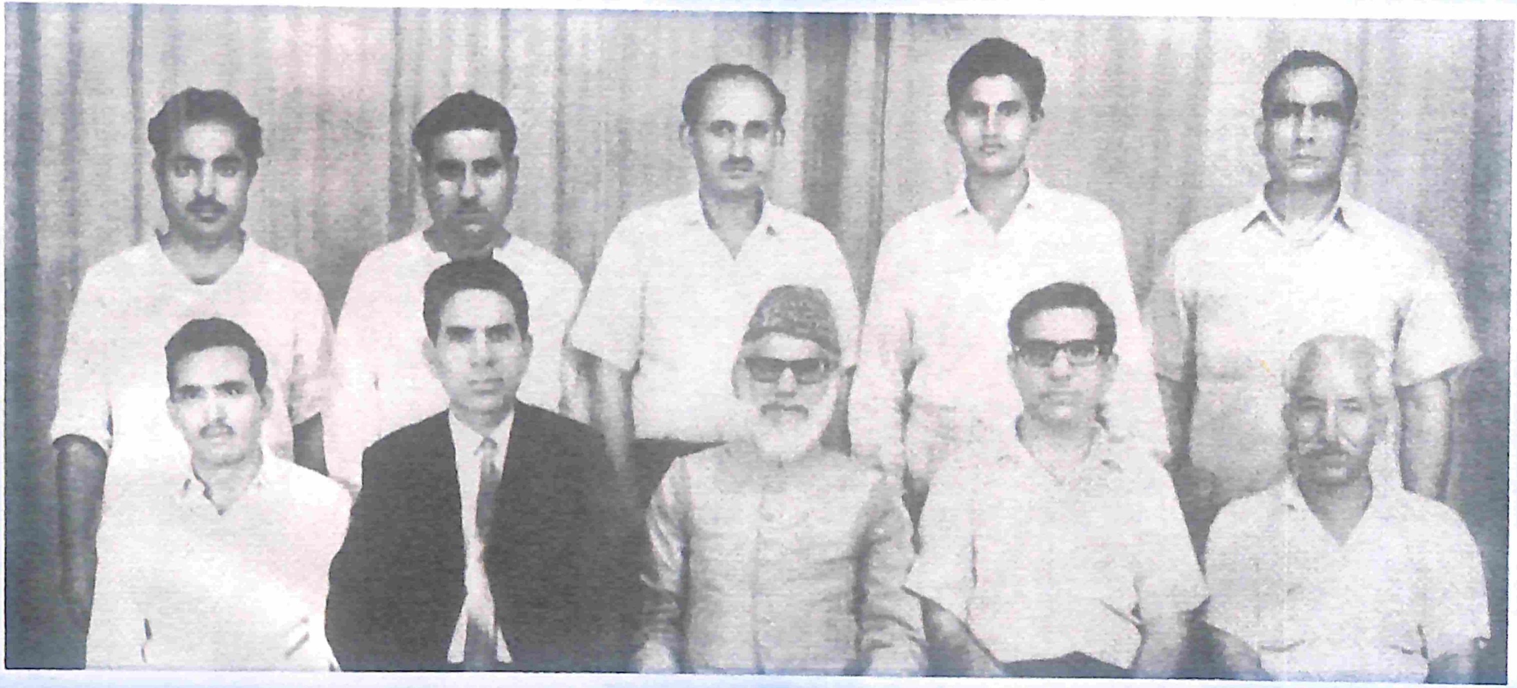


عبدالخالق انصاری



ہاشم قریشی





(بیٹھے ہوئے، بائیں سے دائیں) امان اللہ خان، میر عبدالقیوم، میر محمد نذیر، مسٹر عبدالمنان، خواجہ غلام محی الدین بانکا

(کھڑے ہوئے، بائیں سے دائیں) غلام محمد میر، ملک عبدالرشید، خواجہ عطاء اللہ، محمد صدیق اور شیخ عبدالرحمان



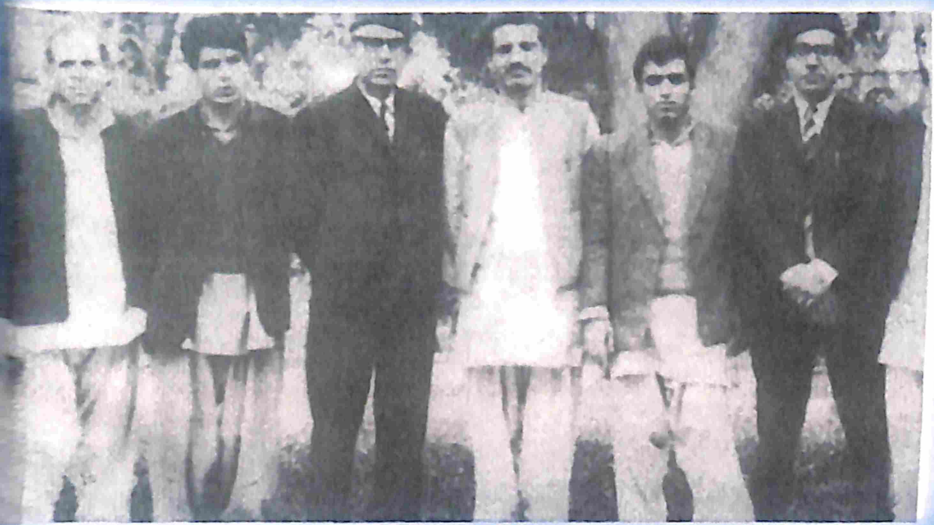
گنگا طیارہ لاہور ائیرپورٹ پر کھڑا ہے



(دائیں سے) محمد مقبول بٹ، میر عبدالقیوم اور ہاشم قریشی کوٹ لکھپت جیل، لاہور میں



پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو مجاہد اشرف سے بات چیت کر رہے ہیں۔
پیچھے گنگا کے کاک پٹ سے ہاشم جھانک رہا ہے



گنگا اغوا کیس میں ماخوذ (دائیں سے) میر عبدالمنان، ہاشم قریشی،
محمد مقبول بٹ، میر عبدالقیوم، اشرف قریشی اور جی ایم لون



اشرف قریشی اور ہاشم قریشی، محمد مقبول بٹ اور محاذ رائے شماری کے دیگر قائدین کے ہمراہ



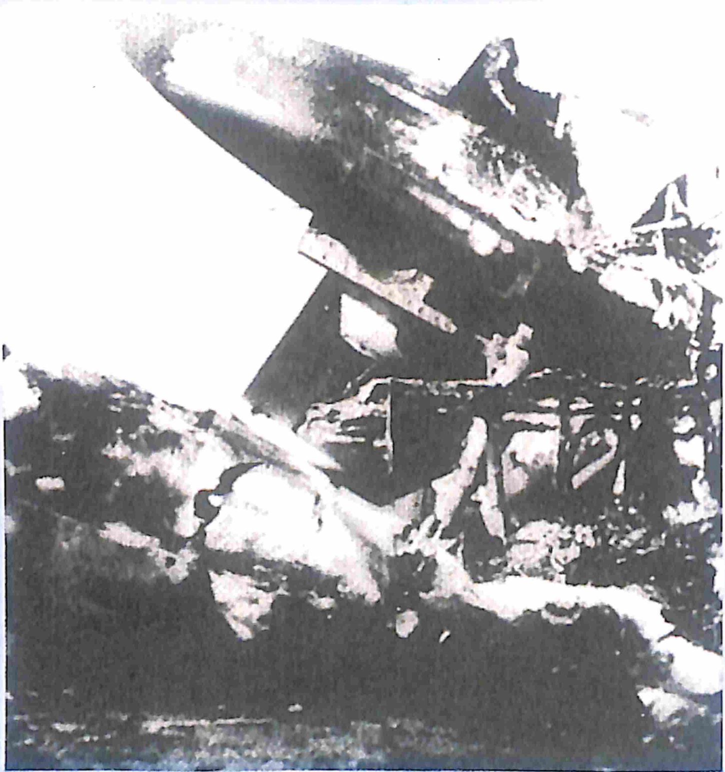
گنگا طیارے کو نذر آتش کرتے ہوئے اشرف قریشی اور ہاشم قریشی زخمی حالت میں



(دائیں سے بائیں) میر عبدالقیوم، جی ایم لون، شمیم احمد شمیم، امان اللہ خان اور میر عبدالمنان

(کھڑے) جی اے ناز، ملک عبدالغنی، جی ایم خان، جی ایم بانکا اور رضا حسرت لداخی

جو اشکوں نے بھڑکائی ہے   اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے



گنگا طیارہ جلتا ہوا





ہاشم قریشی، محمد مقبول بٹ سے گلے ملتے ہوئے



اشرف قریشی اور ہاشم قریشی گنگا طیارے کی کھڑکی سے جھانک رہے ہیں

1

دیوانوں پہ کیا گزری

(کشمیری حریت پسندوں پر پاکستان کے عقوبت خانوں میں ڈھائے گئے ظلم وستم کی کہانیاں)

محمد سعید اسعد

نکس
میرپور



لاہور ائیرپورٹ کی طرف بڑھتے ہوئے عوام کے جمِ غفیر پر پولیس کا لاٹھی چارج

انتساب

استادِ محترم

پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف قریشی (مرحوم)

کے

نام

محمد سعید اسعد

علم و آگہی کا تابناک سفر،

حقیقت کے متلاشیوں کے لئے،

قدم قدم حقیقتیں

نام کتاب : دیوانوں پہ کیا گزری

مرتب : محمد سعید اسعد

اشاعت اوّل : اپریل 2012ء

کمپوزنگ : محمد فداء الحق نیّر

ناشر : نیشنل انسٹیٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز (نِکس) میرپور

تعداد : 500

قیمت : 300

Published by:

NATIONAL INSTITUTE OF KASHMIR STUDIES

House No. 59 Sector F-2 Mirpur Jammu Kashmir.

Cell: 0092-344-5663443, E-mail: niks.mirpur@gmail.com

حرفِ آغاز

1947ء میں تقسیمِ ہند کی آڑ میں پاکستان اور ہندوستان کے سامراجی عزائم رکھنے والوں نے جب ریاست جموں کشمیر کو جبری طور پر تقسیم کرلیا تو کشمیری ''دو پاٹن کے بیچ میں ثابت رہا نہ کو'' کے مصداق کچلتے اور پستے چلے گئے۔ دونوں قابض ملکوں نے تہیہ کرلیا کہ فطری حسن و جمال اور قدرتی وسائل سے مالا مال اس ریاست کو تقسیم کر کے اس کے جداگانہ تشخص کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معدوم کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ گھناؤنے عزائم جب رفتہ رفتہ کشمیریوں پر آشکارا ہونے لگے تو جذبہ آزادی سے سرشار اور حریت پسند کشمیریوں نے جن کی آنکھیں اقوام متحدہ کے بھیجے ہوئے کسی نجات دھندہ کا راستہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں، یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اب ان کو اپنے دیس کی آزادی کے لئے خود ہی کوئی تدبیر کرنا ہوگی۔ چنانچہ جلسے، جلوسوں، قراردادوں، نعروں اور تقریروں کی روش سے ہٹ کر کچھ کر گزرنے کے منصوبے بننے لگے۔

اگست 1965ء میں محاذ رائے شماری کے خفیہ ونگ نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF) کا قیام عمل میں آیا تو این ایل ایف نے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں محدود پیمانے پر کشمیر میں عسکری کارروائیاں شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں تحریکِ آزادی کی عالمی تنظیموں نے اقوامِ عالم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے دشمن کے ہوائی جہازوں کو اغواء کرنے کے اقدامات عمل میں لائے تو NLF کے منصوبہ ساز بھی اپنے مسئلے کو اقوامِ عالم کے سامنے نمایاں کرنے کے لئے بھارت کا ہوائی جہاز اغواء کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ انہیں ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جو اس کارنامے کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ 1970ء میں سری نگر کا ایک پُر جوش اور جذباتی نوجوان ہاشم قریشی پاکستان میں مقیم اپنی بہن کی شادی کے سلسلے میں پشاور آیا تو یہاں اس کی ملاقات محاذ کے راہنما مقبول بٹ

فہرست

گیا۔ ان استقبالی پروگراموں کی وجہ سے اور عوامی جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے بھارتی حکومت بوکھلا اٹھی۔ اس نے کشمیر کو ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہائی جیکروں کو گرفتار کرے اور ان پر اغوا کا مقدمہ قائم کرے۔ چنانچہ شیطان صفت حکمران یحییٰ خان کی آمرانہ حکومت بھارتی دباؤ میں آ کر اسی ڈگر پر چل پڑی۔ پاکستانی پریس آمرانہ نظام کے سبب سخت پابندیوں کا شکار تھا۔ چنانچہ ذرائع ابلاغ میں یکطرفہ طور پر یہ گھناؤنا پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ گنگا جہاز کے ہائی جیکر بھارتی ایجنٹ ہیں اور انہوں نے پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے جہاز اغوا کیا ہے۔ حکومت نے ایک یک نفری تحقیقاتی کمیشن کراچی ہائی کورٹ کے ایک جج مسٹر نورالعارفین پر مشتمل ''نورالعارفین کمیشن'' قائم کیا جس نے ابتدائی عبوری رپورٹ پیش کی کہ جہاز کا اغوا بھارتی سازش کا نتیجہ ہے، چنانچہ 15 اپریل 1971ء کو ہائی جیکروں اور جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے قائدین و کارکنان کی باقاعدہ گرفتاریاں شروع کر دی گئیں جو پورا ایک برس تک جاری رہیں۔ اس دوران سینکڑوں بے گناہ کشمیریوں کو پکڑ پکڑ کر پاکستان اور آزاد کشمیر کے تشدد خانوں میں اُن پر بے پناہ اور انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے۔

محاذ رائے شماری اور اس کے عسکری ونگ NLF کے راہنماؤں اور کارکنوں پر ان انسانیت سوز مظالم کی چیخیں تشدد خانوں کے در و دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر دم توڑتی رہیں۔ پاکستانی پریس نے مکمل طور پر ان حالات سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ چنانچہ محاذ کے وہ کارکن جو گرفتاریوں سے بچ گئے تھے انہوں نے لاہور میں ''ڈیفنس کمیٹی برائے ہائی جیکنگ کیس'' قائم کر کے بروشر، پمفلٹ اور اشتہارات شائع کرنے شروع کیے تو تشدد خانوں کے باہر دنیا کو ان مظالم کی حقیقت معلوم ہوئی۔ اس کمیٹی کے سرکردہ اراکین میں میر ہدایت اللہ، جی ایم میر، نسیم لون، مجید امجد بٹ، غلام احمد بٹ، نصیر وانی اور سعید شاہ نازکی شامل تھے۔ کراچی کے ہفت روزہ الفتح اور لاہور کے ہفت روزہ جہاں نما، کہانی اور روزنامہ جمہور نے گرفتار شدگان کشمیریوں کی بھرپور ترجمانی کی۔

یحییٰ خان نے مقامی اور بین الاقوامی سطح پر اٹھنے والے دباؤ کے نتیجے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج جسٹس یعقوب علی اور سندھ ہائی کورٹ کے جج عبدالقادر شیخ پر مشتمل دو رکنی خصوصی بنچ

اور ڈاکٹر فاروق حیدر سے ہوئی۔ جب ان قائدین نے ہاشم کو مختلف زاویوں سے پرکھا تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ نوجوان کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہاشم کو NLF میں شامل کر کے اس کے سامنے بھارتی جہاز اغوا کرنے کا پروگرام رکھا گیا۔ ہاشم نے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی حامی بھر لی۔ ہاشم حالات کا جائزہ لینے سری نگر واپس چلا گیا، وہ جلد ہی پاکستان واپس آ گیا۔ تو اس نے حالات کو سازگار پاتے ہوئے NLF کی قیادت سے مطالبہ کیا کہ اُسے جہاز اغوا کرنے کی ضروری تربیت دی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر فاروق حیدر کے برادر نسبتی جمشید منٹو نے جن کا تعلق شعبہ ہوابازی سے رہ چکا تھا، ہاشم کو جہاز اغوا کرنے کی تربیت دی۔ ہاشم سری نگر واپس گیا تو اُس نے اِس منصوبے پر عمل کرنے کے لئے اشرف قریشی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ چنانچہ NLF سے وابستہ بھارتی مقبوضہ کشمیر سری نگر سے تعلق رکھنے والے ان دو نوجوانوں، اشرف قریشی (عمر 18 برس) اور ہاشم قریشی (عمر 16 برس) نے 30 جنوری 1971ء کو بھارتی مسافر بردار طیارہ گنگا دورانِ پرواز اغوا کر لیا۔ یہ جہاز سری نگر سے دہلی جا رہا تھا۔ برعظیم پاک و ہند اور کشمیر کی تاریخ میں یہ پہلا جہاز تھا جو اغواء کیا گیا۔ کشمیری ہائی جیکر جہاز کو لاہور لے آئے۔ طیارے کے اغواء کی خبر دنیا بھر میں آناً فاناً پھیل گئی۔ پاکستانی اور کشمیری عوام نے ان حریت پسندوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ پیپلز پارٹی کے راہنما ذوالفقار علی بھٹو سمیت دیگر راہنماؤں نے بھی حریت پسندوں کے جذبے کی تعریف کی۔ حکومتِ پاکستان کے اعلیٰ حکام نے حریت پسندوں سے مذاکرت کیے اور دھوکے سے سواریوں کو جہاز سے اتار کر بھارت بھیج دیا گیا اور پھر پاکستانی حکام کے کہنے پر 2 فروری کو لاہور ایئرپورٹ پر طیارے کو آگ لگا دی گئی۔ اشرف قریشی طیارے کو آگ لگنے کے سبب بری طرح جھلس گئے۔ آزاد کشمیر کے صدر اور نقلی مجاہد قیوم خان نے ہاشم اور اشرف قریشی کو پیغام بھیجا کہ وہ اگر اپنے آپ کو "المجاہد فورس" کے نمائندے ظاہر کریں تو انہیں حکومت آزاد کشمیر ہر ممکن مدد فراہم کرے گی لیکن حریت پسندوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا کر اپنے آپ کو محاذ آزادی کے مجاہد قرار دیا۔ قیوم خان نے مایوس ہو کر حریت پسندوں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ہائی جیکروں اور محاذ آزادی کے راہنماؤں کا لاہور سمیت پاکستان کے دیگر شہروں اور آزاد کشمیر میں زبردست استقبال کیا

Indian High Commission nor was any monetary assistance received by the accused from any foreign source."

(Judgement of Ganga)

گنگا ہائی جیکر ہاشم قریشی اپنی تصنیف ''کشمیر امن کی تلاش'' میں طیارے کے محرکات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک 1971ء میں طیارے کے اغواء کا تعلق ہے وہ اس دور یعنی چھٹی اور ساتویں دہائی میں وقوع پذیر ہوا جب پوری دنیا میں فلسطین، ویت نام اور دوسری مختلف جگہوں پر مسلح جدوجہد کے نام ہی سے اور حوالے سے قوموں کی جدوجہد کو پہچانا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی اس وقت مسلح جدوجہد کے نصب العین کو ہی سامنے رکھتے ہوئے کشمیری عوام اور قوم کی سوچ اور آواز سے پوری دنیا کو روشناس کرانے کے لئے طیارہ اغواء کیا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ پوری دنیا کو پتا چلے کہ یہ پاکستان اور بھارت کے درمیان زمین کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ ان ایک کروڑ عوام کا مسئلہ ہے جو جموں کشمیر کی پانچ اکائیوں میں رہتے ہیں۔ ہم نے ابتداء ہی سے قومی آزادی کی بات کی تھی، اس حوالے سے میں نہیں سمجھتا کہ اس کے پیچھے جیسا کہ بعد میں اس طرح کے الزامات لگائے گئے یا اس واقعہ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ روایتی سیاسی ہتھکنڈے تھے۔ اس جدوجہد کو دبانے کی وجہ یہ تھی کہ نہ تو یہ جدوجہد الحاق پاکستان کے لئے تھی نہ الحاق ہندوستان کے لئے، بلکہ یہ تو آزادی کی جنگ تھی اسی وجہ سے اس جدوجہد کو بدنام کیا گیا۔ جب کہ اس سلسلے میں جناب مقبول بٹ کے خلاف کیس کی کورٹ ہیئرنگ ہوئی۔ سپریم کورٹ کی ججمنٹ سامنے آئی اور انٹرنیشنل کورٹ میں مسئلہ چلا۔ میرے پاس فائلیں موجود ہیں کہ نیشنل لبریشن فرنٹ کا کیا ہوا اقدام تھا جس کی جناب مقبول بٹ نے ساری منصوبہ بندی کی تھی۔''

(کشمیر امن کی تلاش، صفحہ 198،197 مطبوعہ 1995 لاہور)

اشرف قریشی نے پاکستان کے عدالتی کٹہرے میں کھڑے ہو کر ان الفاظ میں اپنے عمل و عزم کی وضاحت کی تھی:

''میں کھلے الفاظ میں تسلیم کرتا ہوں کہ 30 جنوری 1971ء کو جو بھارتی طیارہ ''گنگا'' سری نگر

تشکیل دیا۔ کئی سو گرفتار شدگان میں سے چھ افراد اشرف قریشی، ہاشم قریشی، محمد مقبول بٹ، جی ایم لون، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان پر مقدمہ قائم ہوا۔ ملزمان کے مقدمے کی پیروی اعجاز بٹالوی ایڈووکیٹ، عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ، دوست محمد اعوان ایڈووکیٹ، ایم انور بار ایٹ لاء اور ڈاکٹر عبدالباسط ایڈووکیٹ نے کی۔ دوسرے سیکڑوں افراد کو بغیر مقدمہ چلائے تفتیشی مراکز اور جیلوں میں بند رکھا گیا۔ آزاد کشمیر میں گرفتار کئے گئے درجنوں کارکنان میں سے عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ اور پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی پر مقدمہ قائم کیا گیا۔

پولیس نے محاذ کے ایک سرگرم راہنما ڈاکٹر فاروق حیدر کو بے پناہ تشدد کر کے وعدہ معاف گواہ بنا لیا۔ ڈاکٹر فاروق حیدر نے حریت پسندوں کے خلاف گواہی دی۔ اس گواہی کو مقدمے کی بنیاد بنایا گیا تھا۔ 17، مئی 1973 کو خصوصی عدالت نے 407 صفحات پر مشتمل فیصلہ سنایا۔ یحییٰ خان کا آمرانہ دور ختم ہو چکا تھا۔ پاکستان دولخت ہو کر بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان میں بٹ چکا تھا۔

مقبول بٹ، جی ایم لون، میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان کو باقی تمام الزامات سے بری کر دیا گیا البتہ انہیں اسلحہ خرید کر مقبوضہ کشمیر بھیجنے کے الزام میں تابرخاست عدالت سزا دی گئی۔ اور اسی روز رہا کر دیا۔ اشرف قریشی کو عظیم آزادی پسند قرار دے کر بری کر دیا گیا۔ البتہ ہاشم قریشی کو 14 سال کی سزا سنائی گئی اور اسے سپریم کورٹ میں اپیل کا حق دیا گیا۔ سات سال بعد سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت کی باری آئی تو سپریم کورٹ نے 1980ء میں ہاشم قریشی کو بھی رہا کر دیا۔

407 صفحات پر مشتمل اس تاریخی فیصلے میں لکھا تھا:

"The Tribunal declared that both the Jammu and Kashmir Plebiscite front and the Jammu and Kashmir National Liberation front were patriotic organizations which were working for the liberation of the people of Jammu and Kashmir.

Neither of the two organizations was set up either at the instance of the Indian Intelligence or of the officials of the

جب میں وہاں سے اٹھا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور میرے آس پاس اندھیرا پھیل چکا تھا۔لیکن میں نے اس نشست سے اٹھتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنی دھرتی ماں کی خاطر جدوجہد کرنے والے ان عظیم حریت پسندوں کے قافلے میں شامل ہوں گا اور پاکستانی اور بھارتی سامراج کے خلاف اس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک میرے دیس کے افق پر آزادی کی صبح بہاراں طلوع نہیں ہو جاتی۔

حصولِ علم کے مراحل کامیابی سے طے کرنے کے سبب میں اپنے راستے پر آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔حتیٰ کہ پنجاب یونیورسٹی شعبہ کشمیریات میں جا پہنچا۔اس ''چشمہ علم و آگہی'' میں پہنچ کر جب مجھے علم ہوا کہ مجھے جموں کشمیر کا جغرافیہ وہ عظیم شخص پڑھائے گا جس کا نام اشرف قریشی ہے اور وہ گنگا ہائی جیکر ہے،تو میرے تجسس اور حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔بس پھر پروفیسر اشرف قریشی اور دیگر اساتذہ کرام کی شاگردی میں میرے لئے جدوجہد اور جنگ کا ایک نیا محاذ کھل گیا۔میں نے تلوار اٹھانے کا اور بندوق چلانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے ناتواں ہاتھوں میں قلم تھام لیا۔ پھر قلم تھا......... کشمیر تھا......... اور میں تھا۔''تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں'' کے مصداق یہ قلم آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔دشمن تیر و تفنگ سے لیس تھا،نشہ اقتدار میں بدمست تھا،تکبر و غرور کا فرعون بنا بیٹھا تھا......... اُس نے مجھ ناتواں سے قلم چھیننے اور مجھے سرنگوں کرنے کے لاکھ جتن کیے لیکن الحمدللہ، الحمدللہ میں نے ابھی تک ہتھیا نہیں ڈالے اور انشاءاللہ مرتے دم تک قلم کے محاذ پر لڑتا رہوں گا۔قلم کے محاذ سے میں نے ''**دیوانوں پہ کیا گزری**'' کی صورت میں جو نیا معرکہ لڑا ہے اس کی داستان بہت طویل ہے۔میں قارئین کو بوریت کا شکار نہیں کرنا چاہتا،مختصر عرض کروں گا کہ میں نے چند برس پہلے گنگا ہائی جیکنگ کیس کا ریکارڈ جمع کرنا شروع کیا تھا۔یہ ریکارڈ ہمارے قومی ادبی سرمائے کا قیمتی حصہ ہے،جسے نئی نسل تک پہنچنے نہیں دیا گیا۔بقولِ شاعر:

قصیدے کھول کر رکھ دیئے ہیں اس نے ہر چوک میں
مگر وہ سچ بولنے والی کتابیں دفن کر دی ہیں

یہ سچ بولنے والی کتابیں کشمیر کی نئی نسل سے چھپا دی گئی تھیں۔گنگا ہائی جیکنگ ڈیفنس کمیٹی نے

سے اغوا ہوا تھا وہ میں نے اغوا کیا تھا۔ یہ قدم میں نے پوری طرح سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا اور اسے قومی محاذِ آزادی کی ہائی کمان کے حکم کی تعمیل میں سرانجام دیا تھا۔ بہرحال یہ قدم میرا دیدہ ودانستہ ہے اور میں اپنے مقدس مقصد کی توہین سمجھتا ہوں کہ اپنے اس فعل کی صفائی میں کسی قسم کی تاویل یا حجت پیش کروں۔ پس اس عدالت پر واضح رہے کہ ''گنگا'' طیارے کی ہائی جیکنگ میرے یعنی محمد اشرف قریشی ولد عبدالعزیز قریشی ساکن نوہٹہ سری نگر کی اپنی مرضی ومنشا اور ارادے کا نتیجہ ہے۔ اس قدم کو اٹھانے میں میرا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا اس ہائی جیکنگ کو کشمیری عوام کے آزادی حاصل کرنے کے ارادے کو علامت کے طور پر دیکھے۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ ہائی جیکنگ کشمیری نوجوانوں کے ذہن میں مسلح جدوجہد کے آغاز کی علامت بن کر ابھرے۔

آج جب کہ میں اس عدالت میں ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوں، میں ان فولادی زنجیروں کو چومتا ہوں اور اس عدالت سے کہتا ہوں کہ میں اپنے کیے پر نادم نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی آئندہ ہوں گا۔ مجھے بھارتی جہاز ہائی جیک کرنے پر فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ممکن ہے کہ یہ فعل اس عدالت کی نظر میں جرم ثابت ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے جو اپنا فرض نظر آیا میں نے ادا کر دیا اور اس عدالت کو بھی جو اپنا فرض نظر آتا ہے وہ بھی ادا کر دے۔ مجھے اس عدالت سے رحم کی کوئی درخواست نہیں کرنی ہے۔''

بھارتی گنگا طیارہ اغواء کرنے کی پاداش میں پاکستان کے بدبخت فوجی آمر اور اس کے بدکردار ٹولے نے دونوں کشمیری ہائی جیکروں اور ان کی جماعت کے صفِ اوّل کے قائدین کو قید وبند اور جبر وتشدد کے جن المناک مراحل سے گزارا، اس کی تفصیلات پڑھ کر ہر انسان چونک اٹھتا ہے۔

راقم نے میٹرک کے زمانے میں ایک چھوٹا سا خوبصورت سرخ رنگ کا کتابچہ ''آتشِ چنار'' پڑھا تھا۔ یہ تو اب مجھے یاد نہیں کہ یہ کتابچہ میرے ہاتھ کیسے لگا تھا لیکن یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے تروتازہ ہے کہ میں اپنے گاؤں پٹوئیاں کوٹ جے مل میں اپنے کھیتوں کے کنارے بیٹھا یہ کتابچہ پڑھ رہا تھا اور تنہائی کے عالم میں جی ایم لون پر ڈھائے گئے ظلم وتشدد کے واقعات پڑھ پڑھ کر روتا جا رہا تھا۔ یہ کتابچہ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک وہاں بیٹھا روتا رہا۔

قارئینِ کرام! کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سلیم میر صاحب نے مجھے جب مطلوبہ دو صفحات ارسال کیے تو میری خوشی کا کیا ٹھکانا تھا۔ اس کتاب کے مسودے کا نوّے فیصد کام مکمل ہوا پڑا تھا، اب میں چند روزہ محنت کے بعد اس کا بقیہ کام مکمل کر کے اسے آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں جس کے لئے میں خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر گزار ہوں۔

میری اس تازہ معرکہ آرائی کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو میں اپنی تاریخ کے گم شدہ اوراق کو دوبارہ منظرِ عام پر لاؤں اور دوسرا کشمیر کی نئی نسل کو جھوٹ، فریب، مفروضات، قصائد اور فرسودگی کی گرد میں اٹے ہوئے نصابی کوڑا کرکٹ سے نکال کر ان کا رشتہ اپنی تابندہ تاریخ اور قربانیوں بھری تحریک سے جوڑوں۔

اس کتاب کو نئی نسل تک پہنچا کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ میں پچھلے 20 برسوں سے ریاستی جبر، انتقام، تشدد اور ناروا سلوک کا شکار چلا آ رہا ہوں۔ لیکن یہ کتاب منظرِ عام پر لاتے ہوئے میں اپنے اوپر ڈھائے گئے اس ظلم و جبر کو بھول گیا ہوں اور میری روح شاداں و فرحاں ہے کہ کوئی فرعونی اور یحییٰ خانی جبر مجھے راہِ راست سے ہٹا نہیں سکا۔ مجھے خوشی کیوں نہ ہو میں اپنے وطن کے عظیم آزادی پسند راہنماؤں کی خودنوشت کہانیاں کونوں کھدروں سے تلاش کر کے اور تباہیوں کے منہ سے بچا کر آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ یہ میرے پاس مقدس امانتیں تھیں جنہیں آج میں قوم کو لوٹا رہا ہوں۔

اے میری غلام قوم کے جوانو، بچو، بوڑھو، مردو، عورتو! یہ کہانیاں پڑھو........ ہوش و حواس سے پڑھو........ جگر تھام کر پڑھو اور دیکھو کیا کیا ظلم توڑے گئے تمہارے عظیم راہبروں پر........ کیا کیا قیامتیں ڈھائی گئیں ان معصوموں پر........ کیا کیا حربے آزمائے گئے انہیں راہِ آزادی سے ہٹانے کے لئے........ کیا کیا انسانیت سوز حرکتیں ہوئیں نام نہاد مملکت خداداد کے نام نہاد لیڈروں کے ہاتھوں........ پہچان لیں اپنی آزادی کے ان قاتلوں کو........ اسلام کے جھوٹے ٹھیکیداروں کو........ ہمارے محسنوں کو اذیتیں دینے والوں کو........ شیطان کے پجاریوں کو........ فرعون و نمرود کے رشتہ داروں کو........ امریکی اور بھارتی سامراج کے آلہ کاروں کو........

سچ بولنے والے ایسے درجنوں کتابچے اور چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی تھیں لیکن افسوس یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ پہلے میں بھی سوچتا تھا کہ شاید مرورِ ایام کے ساتھ یہ تحریکی وادبی ورثہ نایاب ہو گیا ہے لیکن جب میں نے گنگا کیس کے مرکزی ''ملزمان'' جناب مقبول بٹ شہید، جناب اشرف قریشی، جناب ہاشم قریشی، جناب جی ایم لون، جناب میر عبدالقیوم اور جناب میر عبدالمنان کے عدالتی بیانات کی تلاش شروع کی تو کچھ ایسے ٹھوس شواہد سامنے آئے کہ اس سے اندازہ ہوا کہ صرف ہمارے ریاستی تشخص، تہذیب وثقافت اور جغرافیے کو ہی نہیں مٹایا جا رہا بلکہ ہمارے علمی وادبی اور تحریکی ورثے کو بھی نیست ونابود کیا جا رہا ہے۔ ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے ہمارا لٹریچر تباہ کیا گیا۔ جناب میر عبدالقیوم کا عدالتی بیان ''اب منزل دور نہیں'' 120 صفحات پر مشتمل تھا جو کتابی صورت میں اکتوبر 1972ء میں لاہور سے ڈیفنس کمیٹی نے 1500 کی تعداد میں شائع کیا تھا۔ میں پچھلے چار برس سے اس کتاب کو ڈھونڈ رہا تھا لیکن کراچی سے پشاور اور بھمبر سے مظفر آباد تک کسی سے اس کی کوئی کاپی نہیں مل رہی تھی۔ بالآخر کوٹلی سے JKLF کے راہنما جناب راجہ حق نواز صاحب نے جو میدان کارزار اور خارزار سیاست کے شہسوار ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیر کے علمی، ادبی اور تاریخی ورثے کو بچانے کے لئے بھی عدیم المثال جدوجہد کر رہے ہیں، ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے مطلوبہ بیان اپنے ریکارڈ سے مہیا کیا لیکن اس کتاب سے بھی صفحہ 99، 100 غائب تھے۔ کتاب کے اس نقص کے سبب ٹھیک ایک سال تک میں اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی سے اس کتاب کی دوسری کاپی ملے۔ میں نے اب اندرونِ ملک کے علاوہ بیرونِ ملک کشمیریوں سے رابطے شروع کیے۔ برطانیہ میں یہ کتاب کسی سے نہ مل سکی۔ بالآخر کراچی میں عباس احمد آزاد صاحب نے بھی میری اس تلاش حق کی جدوجہد میں ہاتھ بٹاتے ہوئے میرا رابطہ میر عبدالقیوم صاحب کے چھوٹے بھائی غنی میر صاحب سے کروایا۔ غنی میر صاحب کو جب کراچی سے کتاب دستیاب نہ ہوئی تو انہوں نے امریکہ میں مقیم اپنے بھتیجے سلیم میر صاحب سے میرا رابطہ کروایا۔ میرے اُس اَن دیکھے مہربان نے اپنے ذاتی ریکارڈ میں محفوظ اس کتاب سے مطلوبہ دو صفحات بذریعہ ای میل ارسال کیے اور ایک ایسا نادر ڈاکومنٹ بھی بھیجا جو موصوف کے علاوہ کسی کے پاس نہیں تھا۔

پیشِ لفظ

اپنی مادرِ وطن جموں کشمیر کی قومی آزادی وخود مختاری اور مسئلہ کشمیر کی حقیقی نوعیت واہمیت کو دنیا پر آشکارا کرنے کے لئے مقبول بٹ کی قیادت میں کشمیری حریت پسندوں نے بھارتی طیارے گنگا کے اغوا کا منصوبہ بنایا۔ اشرف قریشی اور ہاشم قریشی وہ نوجوان حریت پسند تھے جنہوں نے صرف پاکستان کا نام سن رکھا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو حقیقی معنوں میں اسلام کا قلعہ ہے اور سارے عالم اسلام کے مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔ نیز یہ ملک کشمیریوں کے لئے کعبہ ثانی کا درجہ رکھتا ہے۔ کشمیریوں کو ایک منظم پروپیگنڈے کے ذریعے یہ تاثر بھی دیا گیا تھا کہ پاکستان ہی واحد ایسا ملک ہے جو کشمیریوں کی جدوجہدِ آزادی میں ان کی بڑھ چڑھ کر حمایت کر رہا ہے اور یہ کشمیریوں کا حامی اور خیر خواہ ہے۔ جھوٹ، منافقت اور مکروفریب سے بھرپور مذکورہ بالا پروپیگنڈے سے لاکھوں کشمیریوں کی طرح اشرف قریشی اور ہاشم قریشی بھی متاثر تھے۔ جذبہ آزادی سے سرشار جب ان بھولے بھالے معصوم نوجوانوں نے انڈین طیارہ گنگا اغواء کیا تو وہ اسے اپنے خوابوں کی سرزمین (پاکستان) کے شہر لاہور کے ہوائی اڈے پر لے آئے۔

بھارتی طیارہ پاکستان میں اتار کر اس ملک کے فوجی حکمرانوں، پولیس اور ایجنسیوں نے حریت پسندوں پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے یہ ان نوجوانوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ ان نوجوانوں پر جو قیامت ڈھائی گئی اس کے کچھ واقعات بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بسنے والے کشمیریوں تک بھی پہنچے تو انہیں اس حقیقت کا ادراک ہوگیا کہ پاکستان ان کی آزادی کا بدترین دشمن ہے جو دوست کے روپ میں ان کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔ چنانچہ کشمیریوں کو اب یہ حقیقت سمجھنے میں آسانی

ہاں! ہاں! پہچان لو انہیں......... اگر اس بار بھی نہیں پہچانو گے تو پھر تمہیں یہ پہچان کروانے والا اور کوئی نہیں آئے گا......... تم اور تمہاری نسلیں اندھیرے راستوں میں قیامت تک بھٹکتی رہیں گی.........

میرے کشمیر کے نوجوانو! جاگ جاؤ اپنے وطن کے دشمنوں کو پہچان لو اور نئے عزم و ہمت سے میدانِ عمل میں اترو......... تم آزادیٔ وطن کے متوالے ہو......... تم اگر اپنے عظیم مجاہدوں، شہیدوں اور غازیوں کے حقیقی رکھوالے ہو تو یحییٰ خان سے لے کر قمر عالم تک اور قمر عالم سے لے کر شاہی قلعے لاہور کے بھنگی تک تم نے ان سب سے انتقام لینا ہے، جنہوں نے تمہارے عزت مآب اور باوقار قائدین کرام کو اذیت ناک سزائیں دیں......... تمہاری تحریکِ آزادی کی پیٹھ میں چھرا گھونپا......... ان ظالموں سے انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے......... ان کا حساب چکانے کی گھڑی تمہارے سر پر کھڑی ہے......... اس ساعت کو پہچانو......... یزیدوں سے ہمارا انتقام ان کی قبروں سے شروع ہو گا اور ان کی نسلوں تک جائے گا۔ (انشاء اللہ)

میں اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے معاون دوستوں محمود کشمیری صاحب چیئرمین جموں کشمیر نیشنل انڈی پنڈنٹس الائنس (UK) صدیق مرزا صاحب (UK) اور یونس تریابی صاحب (UK) کا بے حد شکر گزار ہوں کہ ان دوستوں کے تعاون سے میں اس کتاب کو قارئین تک پہنچانے کے قابل ہوا۔ میں ایک بار پھر شکر گزار ہوں، سلیم میر صاحب، راجہ حق نواز صاحب، غنی میر صاحب، عباس احمد آزاد صاحب، تہدیہ مقبول اور فداء الحق کا کہ ان دوستوں کا خلوص اور محبت میرے شاملِ حال رہی۔

محمد سعید اسعد

میر پور، جموں کشمیر

Cell No: 0092-344-5663443

E-mail: niks.mirpur@gmail.com

facebook ID: saeedasad

Skype ID: mohammadsaeedasad

ہم اپنی ریاست جموں کشمیر کو مکمل آزاد اور خودمختار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم آزادی سے کم کسی چیز کو قبول نہیں کریں گے۔

''دیوانوں پہ کیا گزری'' مادرِ وطن کشمیر کے نامور محقق و مصنف محمد سعید اسعد کی گراں قدر کاوش ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ان کشمیری حریت پسندوں کے حالات و واقعات اور عدالتی بیانات جمع کیے ہیں جنہیں حقِ آزادی مانگنے کی پاداش میں پاکستان کے عقوبت خانوں اور تفتیشی مراکز میں انسانیت سوز سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کے آمر حکمران یحییٰ خان اور اس کے ایجنٹوں کی پوری کوشش تھی کہ ان حریت پسندوں کو بھارتی ایجنٹ اور پاکستان دشمن قرار دے کر سزائے موت دی جائے تاکہ مسئلہ کشمیر کا قلع قمع ہو جائے۔ اس گھناؤنے منصوبے میں یحییٰ خان کا ایک ادنیٰ ٹاؤٹ اور آلہ کار قیوم خان بھی پیش پیش تھا۔ یہ جھولی چیڑ باغ کا رہائشی تھا اور آزاد کشمیر کا سابق صدر بھی رہ چکا تھا۔ اس منافقِ اعظم نے گنگا کیس میں بڑا گندہ کردار ادا کیا۔ اس شخص نے پوری کوشش کی کہ مقبول بٹ اور اس کے تمام سرکردہ ساتھی سزائے موت سے ہمکنار ہوں تاکہ اسے اور اس کی آئندہ نسلوں کو الحاقِ پاکستان کے نام پر اقتدار کا مکروہ کھیل کھیلنے کی کھلی چھٹی مل جائے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یحییٰ خان اور اس کے یہ ایجنٹ اس منصوبے میں کامیاب نہ ہوئے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب پڑھ کر کشمیری قوم اپنے دشمنوں کو پہچاننے میں آئندہ کبھی غلطی نہیں کھائے گی۔ خاص طور پر کشمیر کی نئی نسل کو میں مخاطب کرتے ہوئے کہوں گا کہ وہ ''دیوانوں پہ کیا گزری'' ضرور پڑھیں اور دیکھیں اور سوچیں کہ پاکستان کے بدکردار اور شیطان صفت حکمرانوں نے اور ان کے آلہ کاروں نے کس طرح ہمارے عظیم حریت پسندوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا اور انہیں تحریکِ آزادی کشمیر سے دور رکھنے کے لئے کس طرح ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ یہ کہانیاں ہماری نئی نسل کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

محمود کشمیری

چیئرمین،

جموں کشمیر نیشنل انڈی پنڈنس الائنس (UK)

0044-787-0364399

پیدا ہوگئی کہ پاکستان پر تکیہ یا بھروسہ کرنا سراسر فضول اور بے کار ہے۔ کشمیریوں کی تحریکِ آزادی کچلنے کے لئے محاذِ رائے شماری کے راہنماؤں کو پاکستان کے ٹارچر سیلوں اور عقوبت خانوں میں بے پناہ جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ان سے یہ اقرار کروانے کی کوشش کی گئی کہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں اور انہوں نے بھارت کے ایما پر گنگا طیارہ اغوا کیا ہے۔

آفرین ہے اُن حریت پسندوں پر جنہوں نے پاکستان کے عقوبت خانوں میں جان توڑ مظالم برداشت کئے، لیکن وہ سچائی کے راستے سے پیچھے نہ ہٹے۔ وہ اپنے نظریات اور موقف پر سخت چٹان کی مانند ڈٹے رہے۔ پاکستان کے ظالم، جابر اور آمر حکمرانوں کے انسانیت سوز مظالم انہیں جھکا نہ سکے۔

پاکستان کا حکمران طبقہ آج بھی اپنے پیش روؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کشمیریوں پر ظلم و تشدد روا رکھے ہوئے ہے۔ گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر میں پاکستان کی فوج، ایجنسیاں اور حکمران طبقہ جو گھناؤنا کھیل کھیل رہا ہے اور کشمیریوں کی قومی آزادی کی تحریک میں جس طرح روڑے اٹکا رہا ہے یہ ایک شرمناک باب ہے۔ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ پاکستان کے ان ظالم حکمرانوں کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ وہ جس طرح ماضی میں مقبول بٹ شہید اور ان کے ساتھیوں کو جھکا نہیں سکے اس طرح آج بھی وہ کشمیر کی نئی نسل کو اپنے مقصد اور مشن سے ہٹا نہیں سکتے۔ یہ ماضی میں کشمیری آزادی پسندوں کی چیخ و پکار کو شاہی قلعہ لاہور کے در و دیوار میں مقید کرتے رہے ہیں اور انہوں نے باہر کی دنیا کو ان مظالم سے آگاہ نہیں ہونے دیا لیکن آج وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ آج کشمیری دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں وہ بھارت اور پاکستان کی طرف سے اپنے ہم وطنوں پر روا رکھے جانے والے مظالم پر خاموش نہیں رہ سکتے۔ وہ دنیا بھر میں صدائے احتجاج بلند کریں گے اور اپنے محکوم ہم وطنوں کو غیر ملکی سامراج کے پنجے سے آزاد کروانے کی کوشش کریں گے۔ ہم دنیا کو یہ باور کروائیں گے کہ پاکستان اور بھارت نے ہمارے ملک پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ کشمیری عوام کو محکوم بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے وسائل لوٹ رہے ہیں۔ ان کی تاریخ و تہذیب اور ادب و ثقافت کو ملیا میٹ کر رہے ہیں۔ ہم دنیا کو چیخ چیخ کر بتائیں گے کہ ہم کشمیری پاکستان اور بھارت کا حصہ نہیں بننا چاہتے۔

گام گام مقتل

(مقبول بٹ کی یاد میں)

خالد علیگ

ساتھیو! دیدہ ورو! ہم سفرو! خوش نصیبو!
''شہرِ زِنداں کے رفیقو!'' کوئی آواز تو دو
کوئی نغمہ، کوئی نوحہ، کوئی آہنگ نہیں
کیسے فرہاد ہو، سودائے سر و سنگ نہیں؟
میں .... کہ ایتھنز کے زِنداں کی صدا ہوں یارو
پھر اندھیرے کے تعاقب میں چلا آیا ہوں
میں ..... کہ آزادیٔ افکار کا سَرنامہ ہوں
اپنے مدفن سے پھر اک بار نکل آیا ہوں
میں .... کہ احساس کے بیداد اُجالے میں جیا
میں نے اِک زہر بھرا جام بھی ہنس ہنس کے پیا
میں .... کہ پھر ''ارضِ اسرائیل'' کی آواز بنا
''لحن داؤد'' بنا، نغمہ بنا، ساز بنا
میں ..... کہ پیغامِ محبت تھا کہاں تک پہنچا
''سرِ ہستی'' نفسِ کون و مکاں تک پہنچا

خوں کو ارزاں خریدنے والو!

محبوب اللہ مجیبؔ

ہمارے خون کو ارزاں خریدنے والو!
ہمارے رخ سے اجالوں کو چھیننے والو!

زمیں کے نور کو بے وجہ کوستے تو نہیں
کسی پہ مفت کا الزام تھوپتے تو نہیں
عزیزِ مصر کو بے دام بیچتے تو نہیں

ستم گرو یہ سلوکِ وفا روا کب ہے؟
ہر اک قدم پہ یہ طرزِ جفا روا کب ہے؟

ہم اس زمیں پہ اس طرح رہ نہیں سکتے
تمہارے ظلم کو تقدیر کہہ نہیں

محمد مقبول بٹ شہیدؒ

محمد مقبول بٹ شہیدؒ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ضلع کپواڑہ کی تحصیل ہندواڑہ کے ایک گاؤں تریہگام میں 18 فروری 1938ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام غلام قادر بٹ تھا جو محنت پیشہ آدمی تھے۔ مقبول بٹ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ بی اے سینٹ جوزف کالج بارہ مولا سے کیا۔ سکول اور کالج کے زمانے میں مقبول بٹ تحریکی و سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اس نوجوان کی انہی سرگرمیوں کو دیکھ کر کالج کے عیسائی پرنسپل مسٹر شنکس نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ نوجوان کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے گا یا پھر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

مقبول بٹ نے جب بی اے کا امتحان دیا اس وقت وادیء کشمیر شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے سبب شدید ہنگاموں کی لپیٹ میں تھی چنانچہ بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ 1958ء کو اپنے چچا عبدالعزیز کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کر کے آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ پاکستان کے سرحدی محافظوں نے انہیں پوچھ گچھ کے لیے قلعہ مظفر آباد میں نظر بند کر دیا۔ رہائی کے بعد مقبول بٹ پشاور میں سکونت پذیر ہوئے جہاں محبت خان نامی ایک کشمیری کی کاوش سے انہیں پشاور یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ مل گیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ پشاور سے شائع ہونے والے ایک اخبار ''انجام'' میں بھی کام کرتے رہے۔ انہوں نے ایک ہفتہ وار ''خیبر ویکلی'' رسالہ شروع کیا لیکن اسے مالی مجبوریوں کے سبب جاری نہ رکھ سکے۔ آپ نے پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم اے صحافت کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1961ء میں ان کی شادی اپنی ایک قرابت دار خاتون راجہ بیگم سے ہوئی جس سے یکے بعد دیگرے دو بیٹے جاوید مقبول اور شوکت مقبول پیدا ہوئے۔ مقبول بٹ نے کے ایچ

میں ..... کہ تھا کشتۂ الفت، مجھے مصلوب کیا
اہل دل ٹھیک کیا، اہلِ نظر خوب کیا
ذہن کے "بند دریچہ" پہ صدا دی میں نے
اپنے قاتل کو بھی جینے کی دعا دی میں نے
میں ..... کہ اب قلعۂ لاہور سے ہوتا ہوں طلوع
پھر اسی وضع، اسی طور سے ہوتا ہوں طلوع
میں ..... کہ ہر دور کی تہذیب کا معمار ہوں میں
پھر کسی خنجرِ قاتل کا طلب گار ہوں میں
میں ..... کہ انسان کی تقدیس کا سرمایہ ہوں
اپنے مقتل کی طرف آپ چلا آیا ہوں
مُجھ کو پھر دار پہ کھینچو کہ میں کچھ کہہ نہ سکوں
قتل ہی میرا مقدّر ہے تو پھر یوں ہی سہی
مُجھ پہ شب خوں ہی ضروری ہے تو شب خوں ہی سہی
ساتھیو! دیدہ ورو! ہم سفرو! خوش نفسو!
شہرِ زِنداں کے رفیقو! مگر آواز تو دو!
مگر آواز تو دو!

معرکے میں شہید ہو گیا۔ مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت پھیلانے کے جرم میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس مقدمے کی کارروائی کے دوران ایک مرحلے پر جب عدالت نے ملزم سے سوال کیا کہ کیا اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو مقبول بٹ نے اپنے مخصوص باوقار انداز میں چند الفاظ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر کہے تھے جن کی بازگشت کشمیر کی تاریخ میں تاقیامت سنائی دیتی رہے گی۔

مقبول بٹ نے ہندوستانی عدالت کے کٹہرے میں کہا تھا:

> ''مجھے اس عدالت سے صرف اتنا کہنا ہے کہ حکومت مجھ پر غلط قانون کے تحت مقدمہ چلا رہی ہے۔ بہرحال اگر اس قانون کا عنوان بدل دیا جائے تو میں استغاثہ کے لگائے ہوئے الزامات کو درست تسلیم کرلوں گا۔ میں اس قانون کے عنوان کو خصوصی طور پر رَد کرتا ہوں۔ مجھ پر بھارتی مقبوضہ حکومت یہ الزام لگاتی ہے کہ میں دشمن کا ایجنٹ ہوں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں کسی کا ایجنٹ نہیں ہوں۔ یہ ناممکن ہے کہ مقبول بٹ کسی کا ایجنٹ بن سکے۔ اس حکومت کو چاہیئے کہ مجھے اچھی طرح پہچان لے۔ میں ہی تو دراصل اس کا دشمن ہوں، حقیقی اور ازلی دشمن۔ میں کشمیری عوام کی آزادی حاصل کرنے کے ارادے کا مظہر ہوں۔ پس میں اس عدالت کو مشورہ دیتا ہوں کہ مجھ پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک نیا آرڈی نینس جاری کیا جائے جس کا عنوان ہو ''حقیقی دشمن کو سزا دینے کا آرڈی نینس''۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس آرڈی نینس کے تحت میں بخوشی اقرار کرلوں گا کہ میں بھارتی سامراج کا بدترین دشمن ہوں۔''

کشمیر ہائی کورٹ کے ایک جج نیل کنٹھ گنجو نے انہیں سزائے موت سنائی۔ مقبول بٹ نے سزائے موت سنانے والے جج کو عدالت کے کٹہرے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ''جج صاحب وہ رسی ابھی تیار نہیں ہوئی جو مقبول بٹ کے لیے پھانسی کا پھندہ بن سکے۔''

انہوں نے 9 دسمبر 1968ء کو اپنے دو ساتھیوں میر احمد اور چوہدری یسٰین کے ہمراہ سری نگر جیل میں سرنگ لگا کر راہِ فرار اختیار کی اور کئی روز تک برف پوش پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد

خورشید کے دورِ صدارت میں 1960ء میں بی ڈی سسٹم کے تحت ہونے والے آزاد کشمیر کے پہلے بلدیاتی انتخابات میں بطور امیدوار حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ 1965ء میں انہوں نے ایک سکول معلمہ ذاکرہ بیگم سے شادی کی جس سے ایک بیٹی لبنیٰ مقبول پیدا ہوئی۔

1965ء میں مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں نے محاذ رائے شماری کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی۔ اپریل 1965ء میں سیالکوٹ کے مقام پر محاذ کا پہلا کنونشن منعقد ہوا جس میں مقبول بٹ محاذ کے پبلسٹی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ کنونشن سے فارغ ہونے کے بعد محاذ کے مرکزی عہدیداروں نے سیالکوٹ اور جموں کے درمیان سوچیت گڑھ کے بارڈر پر جا کر مقبوضہ وطن جموں کشمیر کی مٹی ہاتھ میں اٹھا کر حلف اٹھایا کہ وہ اس دھرتی کی عزت و آزادی کے لیے جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مقبول بٹ اور ان کے ایک دوست امان اللہ خان نے 13 اگست 1965ء کو محاذ کے ایک خفیہ عسکری ونگ NLF کی بنیاد رکھی جس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ کشمیری نوجوانوں کو عسکری تربیت دے کر بھارت کی قابض افواج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کیا جائے۔ مقبول بٹ نے این ایل ایف کے پلیٹ فارم سے کشمیر کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کا نظریہ پیش کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی بلکہ غاصب سے چھین کر لینا پڑتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کشمیری ہتھیار اٹھا کر قابض افواج کے خلاف نہیں لڑیں گے اس وقت تک کشمیر کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ چنانچہ بھارت کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کرنے کے لیے وہ جون 1966ء میں اپنے چند ساتھیوں میجر امان اللہ خان، صوبیدار کالا خان اور اورنگزیب شہید (گلگت) کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کر کے وادی کشمیر میں داخل ہو گئے جہاں تین ماہ تک وہ خفیہ طور پر تنظیم سازی کرتے رہے اور نوجوانوں کو فکری تربیت دیتے رہے۔ بالآخر مخبری ہونے کے سبب وہ اپنے ساتھیوں میر احمد اور صوبیدار کالا خان سمیت گرفتار ہو گئے اور انہیں سنٹرل جیل سری نگر میں قید کر دیا گیا۔ ان پر Ordinance of Enemy Egents کے تحت مقدمہ چلا۔ جس میں الزام یہ تھا کہ وہ پاکستانی انٹیلی جنس کا ایک آفیسر ہے جو پاکستان کے منصوبہ سازوں کے ایماء پر تخریب کاری کے لئے وادیِ کشمیر میں داخل ہوا ہے۔ ان کا ایک ساتھی اورنگزیب اس

پاکستانی عدالت میں مقبول بٹ کے مذکورہ عدالتی بیان کی ادبی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو، یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ بیان کشمیر کی تاریخِ آزادی میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بیان کا مقبول بٹ کے قلم سے لکھا ہوا ایک ایک لفظ کشمیریوں کے لئے مقدم و معتبر ہے۔ ذیل کی سطور میں آپ یہ مکمل بیان ملاحظہ فرمائیں گے۔

مئی 1973ء میں گنگا کے مقدمہ سے رہائی کے بعد مقبول بٹ پھر سرگرمِ عمل ہو گئے۔ انہوں نے 1975ء میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے لیے ایبٹ آباد اور مری کے حلقوں سے دو نشستوں پر انتخاب لڑا، لیکن سیٹ حاصل نہ کر سکے۔ البتہ الیکشن مہم میں انہوں نے اپنے وطن کی آزادی کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ 1976ء میں مقبول بٹ اپنے دو نوجوان ساتھیوں ریاض ڈار اور حمید بٹ کے ہمراہ جدوجہدِ آزادی کو از سرِ نو منظم کرنے کے لیے ایک بار پھر جنگ بندی لائن توڑتے ہوئے وادی کشمیر میں داخل ہو گئے جہاں ایک معرکے میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے کچھ عرصہ بعد انہیں تہاڑ جیل دہلی میں منتقل کر دیا گیا جہاں بھارتی سپریم کورٹ نے ان کی سابقہ سزائے موت بحال کر دی اور پھانسی کا فیصلہ سنایا۔ 6، فروری 1984ء کو لندن میں بھارتی سفارت خانے کے ایک اہلکار رویندر مہاترے کو ''کشمیر لبریشن آرمی'' نامی ایک خفیہ تنظیم کے اہلکاروں نے اغواء کر لیا۔ اغواء کاروں نے 24 گھنٹوں کے اندر اندر مقبول بٹ، حمید بٹ، ریاض ڈار اور دیگر کشمیری حریت پسندوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا لیکن جب بھارتی حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو اغواء کاروں نے 54 گھنٹے گزرنے کے بعد مہاترے کو قتل کر دیا۔ مہاترے کے قتل کے بعد بھارتی حکومت نے مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا اعلان کر دیا۔ مقبول بٹ کو سزائے موت سے بچانے کے لیے کشمیریوں نے بہت کوششیں کیں لیکن بھارتی حکومت اپنے فیصلے پر کاربند رہی۔ چنانچہ 11، فروری 1984ء کو اتوار کے روز علی الصبح تہاڑ جیل میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کے پھندے پر لٹکتے ہوئے مقبول بٹ کے آخری الفاظ تھے:

''میرے وطن تو ضرور آزاد ہو گا.....''

مقبول بٹ کی لاش ان کے ورثاء کے حوالے کرنے سے بھارتی حکومت نے انکار کر دیا۔

قاضی ناگ چھم کے راستے آزاد کشمیر پہنچ آئے۔ جہاں پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے انہیں گرفتار کر لیا اور بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام لگا کر مظفر آباد کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اس قلعہ میں مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کو سخت اذیتیں دی گئی لیکن راہِ آزادی کے ان متوالوں کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ کچھ عرصہ تشدد سے گزرنے کے بعد انہیں رہائی ملی تو پھر تحریکِ آزادی کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ 1969ء میں مقبول بٹ کو محاذ رائے شماری کا مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ 30 جنوری 1971ء کو دو کشمیری نوجوانوں اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے بھارت کا گنگا طیارہ اغواء کیا اور لاہور لے آئے۔ گنگا کے اغواء سے مقبول بٹ اور ان کے سیکڑوں ساتھیوں کو پاکستان کی مختلف جیلوں اور عقوبت خانوں میں جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن ان حریّت پسندوں کے حوصلے پست نہ ہوئے۔

مقبول بٹ اور اس کے ساتھیوں کو پاکستانی عقوبت خانوں میں جبر و تشدد کی سختیوں سے گزار کر جب عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو ایک بار پھر پھانسی کا پھندہ ان حریّت پسندوں کے لئے تیار تھا۔ یحییٰ خانی آمریت کے تحت قائم کی گئی عدالت نے ایک بار پھر مقبول بٹ سے پوچھا کہ وہ اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتا ہے۔ مقبول بٹ اپنے مخصوص با تمکین انداز میں بپھرے ہوئے حریّت پسند کی طرح گرجے اس مقدمے میں مقبول بٹ نے اپنا بیان 23 جون 1972ء میں دیا۔ اس بیان کی حیثیت بھی کم تاریخی نہیں ہے گو کہ اس کی تمام کارروائی کا ماحول پہلے سے بہت مختلف تھا۔ اس مقدمے میں مقبول بٹ کا جج نیل کنٹھ گنجو نہ تھا بلکہ پاکستان کے دو جج جسٹس یعقوب علی اور شیخ عبدالقادر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مقبول بٹ کے اس بیان میں ایک عجیب روحانی اضطراب کا رنگ غالب ہے۔ اس بیان کے لہجے میں رنج ہے، افسردگی ہے، تاسف ہے، افہام و تفہیم کی خواہش، غلط فہمی دور کرنے کی کوشش۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں مقبول بٹ کا مخصوص بے باکانہ اور مجاہدانہ غرور کا انداز بھی صاف طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ مثلاً مقبول بٹ کہتے ہیں:

> ”جو لوگ حریّت پسندوں کا شیوہ اختیار کرتے ہیں وہ انتہائی صبر آزما حالات میں بھی بے چین یا مضطرب نہیں ہوا کرتے۔ میں کامل سکون اور صبر و استقامت کے ساتھ اس معزز عدالت کے فیصلے کو سنوں گا۔“

عدالتی بیان

اسے سوء اتفاق کہیے یا حالات کی ستم ظریفی، مجھے اس خاص عدالت کے سامنے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے اور ایک خاص حکم کے تحت مجھ پر چند ایسے الزامات کے تحت مقدمہ چلایا جا رہا ہے جو نہ صرف بے بنیاد اور حقیقت سے بعید ہیں بلکہ اگر انہیں میرے وطن کی آزادی کے دشمنوں کے ذہن کی اختراع اور جموں کشمیر کے مصروفِ جدوجہد عوام کے ساتھ ایک ظالمانہ مذاق قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

مجھے اور میرے ساتھیوں کو ملزموں کی صف میں کھڑا کرنے والے پاکستان کے خود ساختہ حکمرانوں اور ان حالات و کوائف کے متعلق جن کے تحت یہ مقدمہ ''معرضِ وجود'' میں لایا گیا تاریخ اپنا فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ تاریخ کا یہ فیصلہ اس قدر واضح ہے کہ اس پر مزید روشنی ڈالنے یا اس کی توضیح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس بیّن فیصلے کی روشنی میں جب میں اس مقدمے اور اس کے تحت کی جانے والی کارروائی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے یک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے اور اس تمام کارروائی کو میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں۔ تاریخ کے اس فیصلے نے ہمارے اور ہمارے مدِ مقابل گروہِ منافقین کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔ آئندہ نسلوں کو ہمارے تشخص کے بارے میں اب کوئی غلط فہمی نہ ہوگی اور یوں اس گروہِ منافقین کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد پورا ہو گیا۔

چنانچہ جیل کے مسلمان قیدیوں نے انہیں وہیں جیل کے احاطے میں دفن کر دیا۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں

کشمیر کی جدوجہدِ آزادی میں مقبول بٹ شہید کو سب سے اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے۔ راہِ آزادی میں مقبول بٹ کی قربانی نے کشمیریوں کو نیا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ بلا شبہ کشمیر کی نئی نسل میں مقبول بٹ کو جو عزت وقدر ومنزلت حاصل ہے وہ کسی دوسرے شخص کے حصہ میں نہیں آئی ۔نئی نسل مقبول بٹ کو جدوجہدِ آزادی کا ہیرو سمجھتی ہے۔اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ مقبول بٹ نے روایتی انداز سے ہٹ کر مصلحتوں اور مفادات کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے صدق وصفاء اور خلوص ووفا کا پیکر بن کر کشمیر کی نئی نسل کو آزادی وخود مختاری کا حقیقی تصور دیا اور اس تصور کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے استقامت واستقلال کی نئی تاریخ رقم کی۔ کشمیری ہر سال اپنے اس عظیم قائد کا یوم شہادت 11، فروری کو جوش وخروش سے مناتے ہیں۔اس سلسلے میں اندرونِ کشمیر اور بیرونِ کشمیر لاتعداد تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

شعور فردا :مقبول بٹ شہید نے بھارت اور پاکستان کے عقوبت خانوں سے جو فکر انگیز خطوط لکھے تھے ان کا مجموعہ ''شعورِ فردا'' کے عنوان سے راقم نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ خطوط مقبول بٹ کے فکر وکردار کا حقیقی آئینہ ہیں۔ 1998ء میں حکومت پاکستان نے ''شعورِ فردا'' پر اس بناء پر پابندی عائد کردی کہ اس کتاب کے مطالعے سے کشمیریوں میں حب الوطنی کے جذبات کو فروغ ملنے کا خطرہ ہے۔حکومت پاکستان کے اس گھناؤنے اقدام کی دنیا بھر میں آباد کشمیریوں نے زبردست مذمت کی۔ مذکورہ کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب مقبول شہید کے فکر وکردار کا حقیقی آئینہ ہے۔

منتج ہونے والی انسانی فلاح پر ہمیشہ کامل یقین رہا ہے۔

میں اس معزز عدالت کے نوٹس میں یہ بات لائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گو اس مقدمے میں بظاہر صرف چھ اشخاص کو ملوث کیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تمام کارروائی کا اصل مقصد ہماری تحریک حریت کو کچلنا اور اس کے مدعیوں کے راستے میں شدید قسم کی رکاوٹیں کھڑا کر کے انہیں راہِ عمل کو ترک کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ پاکستان کی نوکر شاہی کے ''مقدمہ ساز دماغوں'' کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس امر سے قطع نظر کہ اس مقدمے کے انجام کے طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کا مقدر خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، جس اصل مقصد کو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس میں سوائے رسوائی اور ناکامی کے انہیں اور کچھ نہیں ملے گا۔ آزادی کی قومی تحریکوں کو عدالتی فیصلوں کی مدد سے اگر رد کا جا سکتا تو دنیا میں شاید ہی کوئی قوم آزاد ہوتی۔ اگر انسانی تہذیب وتمدن اور جمہوریت وآزادی کے ارتقاء کو مروجہ عدالتی یا انتظامی کارروائیوں سے ختم کرنا ممکن ہوتا تو آفرینشِ آدم سے لے کر اب تک دنیا میں جتنے انقلاب آئے ہیں تاریخ میں ان کا وجود تک نہ ہوتا۔ انسانی فلاح وآزادی کی تحریکوں سے متعلق فیصلے مروجہ عدالتوں میں نہیں بلکہ خود تاریخ کے ارتقائی عمل کی عدالت میں کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ مروجہ عدالتیں بجائے خود اس نظام کی مرہونِ منت ہوتی ہیں جسے بدلنے کے لئے یہ تحریکیں جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے عدالتی فیصلے تاریخی عمل کی روشنی میں بسا اوقات ناکارہ اور متروک قرار دیئے جاتے ہیں۔

میرے وطن اور اس میں بسنے والے نصف کروڑ کے لگ بھگ عوام کی آزادی کے خلاف آج تک جو سازشیں ہوئی ہیں ان کا تفصیلی جائزہ اس مختصر سے بیان میں سا نہیں سکتا بہرحال ان سازشوں کے اس پہلو کو نمایاں کرنا ضروری ہے جس کے نتیجے میں یہ مقدمہ عدم سے وجود میں لایا گیا ہے۔

کشمیری عوام کے خلاف سازش کا یہ پہلو ہمارے اعلانیہ دشمنوں نے نہیں بلکہ ان کے کوتاہ

"وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾ (البقرہ، آیت 14، 15)

اس گروہ نے مظلوم عوام کے ساتھ جو ظالمانہ مذاق روا رکھا تھا اس کی پاداش میں یہ کچھ ہونا چاہئے تھا کہ وہ ایک ایسی طغیانی میں گھر جائیں جہاں سے ان کا فرار ناممکن ہو۔

میں نے یقیناً نہ تو خود کوئی سازش تیار کی اور نہ ہی سازشیوں کے کسی گروہ میں شامل رہا ہوں۔ میرا کردار ہمیشہ واضح اور غیر مبہم رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فرسودگی، دولت پسندی، استحصال، ظلم، غلامی اور منافقت کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہوا ہوں۔ استعماری نظام کا پروردہ پاکستانی حکمران طبقہ جس کی نمائندگی اس ملک کی نوکر شاہی اور فوجی آمریت انجام دیتی رہی ہے اگر اسے "**سازش**" قرار دے تو مجھے یہ الزام درست تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں۔

میرے نزدیک یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں استحصال اور غلامی کے خلاف جب بھی کوئی تحریک شروع کی گئی اسے دبانے کے لئے اقتدار و اختیار پر قابض روایتی حکمرانوں نے ہمیشہ قانون کی لغت کے اس لفظ جسے "سازش" کے نام سے پکارا جاتا ہے، کا سہارا لیا ہے۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ظالم اور مظلوم کی جنگ میں مآلِ کار فتح مظلوم کی ہوتی ہے اور ظلم کی عمارت مظلوم عوام کی انقلابی جدوجہد کے مقابلے میں دھڑام سے زمین بوس ہوتی ہے۔ میں نے ہمیشہ خودستائی سے نفرت کی ہے تاہم اب جبکہ میرے پاک کردار کو غلط رنگ دینے کی دانستہ کوشش کی جارہی ہے۔ مجھے یہ دعویٰ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کہ میں نے زندگی کے ہر موڑ پر حق و انصاف کا ساتھ دیا ہے اور ظلم و استحصال کے خلاف مصروفِ جنگ عوام کی نہ صرف حمایت کی ہے بلکہ اس جنگ میں مظلوم عوام کا نقیب اور مدعی رہا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے لئے یہ رول متعین کیا ہے اس لئے میں اسے انبیاء کی سنت اور انقلابیوں کا شیوہ تصور کرتا ہوں۔ مجھے اس رول کی کامیابی اور اس پر

مجھے اور میرے ساتھیوں کو وطن دشمن قرار دیئے جانے کا فیصلہ فوجی حکمرانوں نے عین اس وقت کیا جبکہ وہ اپنے ناجائز اقتدار کو سہارا دینے اور اس ملک پر فوجی آمریت کی سیاہ رات کو طول دینے کی مجرمانہ کوشش کے سلسلے میں ایک سازشی ڈرامہ کا آخری سین تیار کر رہے تھے۔ یہ فروری 1971ء کا آخری ہفتہ تھا اور راولپنڈی کے ''ایوانِ صدر'' میں قابض فوجی آمروں کا ٹولہ پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی روکنے کے لئے اپنے منصوبے تیار کرنے میں مصروف تھا۔

اپنی تاسیس سے لے کر 24 فروری 1971ء تک این۔ایل۔ایف کے بارے میں حکمرانوں کے کسی طبقے کی جانب سے نہ تو کسی قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کی کارروائیوں، جن میں گنگا کی ہائی جیکنگ کا واقعہ بھی شامل تھا، کے متعلق یہ باور کرنے کی کوئی وجہ موجود تھی کہ ان کے پیچھے کوئی خفیہ مقصد کارفرما ہے۔ تاہم محولہ بالا سازش کی تکمیل کے لئے حکمران ٹولے نے این۔ایل۔ایف اور ہائی جیکنگ کے واقعہ کو اپنے عوام دشمن اور جمہوریت کش منصوبوں کا جواز پیدا کرنے کی خاطر چند غیر حقیقی اور بے بنیاد اسباب کے سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ 24 فروری 1971ء کو ہی ایوانِ صدر راولپنڈی سے اس سلسلے میں اولین ہدایات جاری کر دی گئیں۔ انٹر سروسز انٹیلی جنس بیورو کو حکم دیا گیا کہ وہ ہائی جیکنگ کے واقعہ کی تحقیقات کرے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی گئی کہ حریت پسندوں کو عوام اور پریس سے دور رکھا جائے اور انہیں کسی خاموش مقام پر منتقل کیا جائے۔ جب ہم نے اس ہدایت کے پسِ منظر کے بارے میں دریافت کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ ''ملک ایک نازک سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ آئینی امور کے بارے میں جو آویزش شروع ہوئی ہے اسے حل کرنے کے لئے مغربی پاکستان میں سازگار ماحول پیدا کرنے کی غرض سے فی الحال کشمیر کے بارے میں عوام کے جذبات کو ٹھنڈا رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں سمجھایا گیا کہ شیخ مجیب چونکہ ہندوستان سے دوستی کے خواہشمند ہیں اس

اندیش اور بدخواہ "دوستوں" نے ترتیب دیا ہے جنہوں نے اس بدقسمت ملک کی قیادت پر اوچھے طریقوں سے قبضہ کر کے نہ صرف اس میں بسنے والے تیرہ کروڑ انسانوں کو طویل عرصے تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا بلکہ اپنی بساطِ اقتدار کو سہارا دینے کے سازشی عمل میں اس کے وجود کو ہی داؤ پر لگا دیا۔ ظاہر ہے ایسی قیادت جو خود اپنے عوام سے دشمنی اور غداری کی مرتکب ہوئی ہے۔ ایک ایسی قوم کی دوست اور خیر خواہ کیونکر ثابت ہو سکتی جو ہنوز غلامی سے چھٹکارا پانے کے لئے مصروفِ جنگ ہو۔ مجھے یہ بات کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا کہ پاکستان کی برسرِ اقتدار قیادت نے گذشتہ 25 برس کے دوران ہر مرحلے پر "آزادیٔ کشمیر" کے مسئلے کو اپنی ہوسِ اقتدار کے مقصد کے لئے ایکسپلائٹ (EXPLOIT) کیا اور ملک کے کروڑوں عوام جنہیں کشمیر کی آزادی سے سچی لگن تھی اور اب بھی ہے، کے معصوم جذبات کا سہارا لے کر اپنی غیر مخلص قیادت کا سنگھاسن قائم رکھنے کے لئے اس مسئلے کو ناجائز طور پر استعمال کیا۔ جب زمامِ اقتدار فوجی آمریت کے ہاتھوں میں آ گئی تو اس سازش نے مزید بھیانک روپ دھار لیا اور اس کے منطقی انجام کے طور پر نہ صرف پاکستان اپنا اصل وجود کھو بیٹھا بلکہ عملاً ہماری تحریکِ آزادی اگر صدیوں نہیں تو کم از کم برسوں پیچھے ضرور چلی گئی۔

یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ روزِ اوّل سے ہی ہماری تحریک اور اس ملک کی حکمران نوکر شاہی اور فوجی آمریت کے درمیان ایک قسم کا ٹکراؤ پیدا ہوا۔ اس ٹکراؤ کا بنیادی سبب مقاصد اور طریقِ کار کا اختلاف ہے۔ ہم نے اپنے وطن کی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا جو نظریہ پیش کیا اس ملک کے فوجی حکمرانوں نے محض بدنیتی کے باعث اسے کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس کو پسند نہیں کیا بلکہ اس نظریے کی بنیاد پر کسی عملی تحریک کے ابھرنے میں ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ یہ سلسلہ اس قدر طویل ہے کہ اس پر واقعات کی روشنی میں ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں تاہم یہ نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی کہ مقاصد اور طریقہ کار کے اس اختلاف کو بنیاد بنا کر ہمیں وطن دشمن قرار دیئے جانے کا فیصلہ کیا جاتا۔

گیا کہ اگر ضرورت محسوس کی گئی تو کمیشن قائم کیا جائے گا ورنہ شاید اس کو نوبت بھی نہ آئے۔

20 مارچ 1971ء کو عین اس وقت جبکہ ڈھاکہ میں یحییٰ مجیب مذاکرات فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکے تھے اور فوجی حکمرانوں نے اپنی سازش کی بساط بچھادی تھی اور صرف موزوں وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ مرکزی حکومت نے کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔ کمیشن کی شرائط استصواب کو جان بوجھ کر خفیہ رکھا گیا اور متعلقہ حکام برابر یہی تاثر دیتے رہے کہ کمیشن محض ایک Eye Wash ہے۔ 25 مارچ 1971ء کو یحییٰ خاں کے اصل عزائم بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے اور مشرقی پاکستان میں فوجی کاروائی شروع کر دی گئی۔ اس کے ٹھیک دو روز بعد 27 مارچ 1971ء کو تحقیقاتی کمیشن نے بھی کام شروع کر دیا۔ کمیشن میں شامل دو ارکان حکومت کے شعبہ ہائے سراغرسانی سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ تیسرے رکن مسٹر راحت سعید چھتاری وزارتِ خارجہ کے نمائندے تھے۔ یہ وہی مسٹر چھتاری ہیں جن کو اس ملک کی پہلی عوامی حکومت نے شدید بدعنوانیوں کے الزام کی بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیا ہے۔

واقعات کا یہ تسلسل ظاہر کرتا ہے کہ مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے خلاف اس مقدمے کے سلسلے میں جو کارروائی کی گئی اس کے پیچھے ایک خاص مقصد کارفرما تھا۔ یہ مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ فوجی حکمران ٹولے نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کر کے ملک کو جس شدید خانہ جنگی سے دوچار کر دیا تھا اس کے لیے اپنی مرضی کے مطابق علاوہ دیگر اسباب کے ایک اور جواز پیدا کیا جائے۔ تحقیقاتی کمیشن نے حکمرانوں کی خواہش کے مطابق ایک رپورٹ مرتب کر کے یہ مقصد پورا کر دیا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کمیشن کی رپورٹ صدر کو پیش کیے جانے سے چھ روز قبل یعنی 14 اپریل کو ہی مجھے اور میرے دیگر کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور کمیشن کی رپورٹ کے منظر عام پر لائے جانے کے بعد ہماری تحریک کو ختم کرنے کے لیے داروگیر کا جو سلسلہ شروع کیا گیا اس کے تصور سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اقتدار کے نشے میں دھت اور خود کو اس ملک

لئے وہ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ کسی بھی معاملے پر فی الوقت ہندوستان کے ساتھ کنفرنٹیشن (CONFRONTATION) کو ہوا دی جائے۔ محض اس جذبے کے تحت کہ مبادا ہماری تحریک کے باعث پاکستان کا آئینی بحران سنگین صورت نہ اختیار کر جائے اور یوں ہماری نیت کے بارے شکوک پیدا نہ ہو جائیں، ہم نے اس سلسلے میں تعاون کیا اور حریت پسندوں کو راولپنڈی سے ٹانڈہ ڈیم منتقل کئے جانے پر رضامند ہو گئے۔

چند ہی روز بعد ایوانِ صدر سے قومی اسمبلی کے مجوزہ اجلاس کے التوا کا اعلان کیا گیا اور یوں ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ملک کو درپیش آئینی بحران کی شدت میں اضافہ کیا گیا۔ سابق فوجی آمر کے اس اعلان کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں جو المناک واقعات پیش آئے انہیں برپا کرنے کا منصوبہ پہلے سے طے کیا جا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیخ مجیب کو راولپنڈی آکر سابق صدر سے مذاکرات کی دعوت دی گئی اور جب اس نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو مارچ 1971ء کے دوسرے ہفتے میں ایوانِ صدر سے ایک اور اعلان جاری ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ سابق صدر شیخ مجیب سے مذاکرات کے لئے ڈھاکہ جانے والے ہیں۔ یحییٰ خاں کی ڈھاکہ روانگی سے ایک روز قبل وزارتِ خارجہ کے ایک ترجمان نے اعلان کیا کہ ہائی جیکنگ کے واقعہ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے گی۔ عدالتی تحقیقات کے اس فیصلے کے بارے میں جب ہم نے حکومتِ پاکستان کے متعلقہ حکام سے وضاحت چاہی تو ہمیں بتایا گیا کہ یحییٰ مجیب مذکرات میں ہائی جیکنگ کے واقعہ پر گفتگو لازماً ہوگی اور شیخ صاحب جہاز کے جلائے جانے کے بارے میں تحقیقات کا مطالبہ کر چکے ہیں اس لئے اس اعلان سے ڈھاکہ مذاکرات میں تلخی کا ایک پہلو ختم ہو جائے گا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے خلاف دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے اور بین الاقوامی شہری ہوا بازی کی تنظیم کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے ایک سرسری سی تحقیقات ضروری ہو گئی ہے۔ تاکہ عالمی سطح پر اس واقعہ میں پاکستان کے ملوث نہ ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا جا سکے۔ ہمیں یہاں تک بتایا

آزمائشیں، آلام اور صعوبتیں اس صورتِ حالات کا ایک حصہ ہوتی ہیں جن سے حریت پسندوں کو ہر وقت سامنا رہتا ہے۔ حریت پسندانہ سرگرمیوں کی پاداش میں ان ابتلاؤں کے علاوہ ایک اور کٹھن مرحلہ سے بھی واسطہ پڑتا ہے جسے عرفِ عام میں **تشدد** کہا جاتا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر تشدد کے تین ادوار سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ دور میری اسیری کے ان ایام پر مشتمل ہیں جن میں مجھے مقبوضہ کشمیر کے قابض حکام آزاد کشمیر میں متعین ایف آئی یو کے گیسٹاپو قسم کے فوجی افسروں اور آخر میں لاہور کے رسوائے زمانہ اور دورِ غلامی کی یادگار شاہی قلعہ کے پولیس افسروں سے پوچھ گچھ اور تحقیقات کے دوران واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سے تشدد کے ہر دور کی داستان اس قدر طویل ہے کہ ان کی تفاصیل کے بیان کرنے کی اس بیان میں گنجائش ہی نہیں۔ البتہ ایک بنیادی حقیقت جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا یہ ہے کہ تینوں مقامات پر مجھ پر کیے جانے والے تشدد کے مقاصد بالکل مختلف تھے مقبوضہ کشمیر میں مجھ پر اس لیے تشدد کیا گیا کہ قابض حکام میری ذات اور تحریک کے بارے میں حقائق کی تلاش میں تھے۔ مظفر آباد کے ایف۔ آئی۔ یو والوں کو حقائق کی تلاش تو نہ تھی البتہ وہ اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے مفروضات کے بارے میں مجھ سے تائیدی شہادت حاصل کرنا چاہتے تھے اور شاہی قلعہ لاہور کے ''گسٹاپو'' مجھ سے صریح جھوٹ کہلوانا چاہتے تھے اور ایک سے شدہ سازشی منصوبے کی تکمیل کے لیے مجھ سے اپنی مرضی کے مطابق بیان دلوانا چاہتے تھے۔ یہ بات بھی اس ملک کے غاصب حکمران ٹولے کو ہی زیب دیتی تھی کہ اس کی انتظامی مشینری حقائق کو توڑ مروڑ کر خود ساختہ افسانوں کے لیے کردار گھڑنے کی مجرمانہ سعی میں بھی انسانیت سوز وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتی اور ظلم و سفاکی کے اس عمل میں اس حد تک جا پہنچتی جہاں انسان کو اس کے ضمیر سے ہی محروم کیا جاتا ہے۔ لاہور کے شاہی قلعہ میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو جس بہیمانہ تشدد کا شکار بنایا گیا اس کی چند تفاصیل میرے دیگر ساتھیوں نے اپنے تحریری بیانات میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شاہی قلعہ میں بہت کچھ ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ بعض

کے سیاہ و سفید کا مالک تصور کرنے والے ان حکمرانوں نے تاریخ کی اٹل حقیقتوں کو فراموش کر دیا تھا
انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ قدرت کی تعزیریں بڑی سخت ہوا کرتی ہیں حق کے مقابلے میں باطل کی
قوتیں بظاہر کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہوں آلِ کار انہیں شکست ہوتی ہے اور سچائی اپنا وجود منوا کر ہی
رہتی ہے۔ قدرت نے جلد ہی اپنا فیصلہ دے دیا اور وہ حکمران ٹولہ جو اپنی سازشوں کی قربانگاہ پر ہمیں
بھینٹ چڑھانے کی کوشش میں مصروف تھا، ہمارے مستقبل کو تاریک بنانے سے قبل ہی خود اپنے
انجام کو پہنچ گیا۔

حریت پسندی کا دعویٰ کرنا یوں تو بڑا آسان ہے مگر اس راستے پر چل پڑنے کے لیے
بڑے ہی دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس راستے کے مسافروں کو زندگی کے
ہر موڑ پر آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے بعض آزمائشیں ایسی سخت ہوتی ہیں کہ بیگانے تو کیا
اپنے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن سے دستگیری کی توقع ہوتی ہے
وہ نہ صرف دست کش ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے مفادات خصوصی کے پیش نظر رہزنوں کی صف میں بھی
شامل ہو جاتے ہیں۔ جدوجہد کا میدان یقیناً ایک کسوٹی ہے جو حق کے علمبرداروں اور باطل پرستوں کو
ہی نہیں بلکہ منافقین کو بھی اپنے اپنے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ زندگی کے اُس دور میں جو میں نے
اپنے وطن کی جنگ آزادی میں گزارا ہے، مجھے نہایت ہی کٹھن اور صبر آزما امتحانوں سے گزرنا پڑا
ہے۔ ایسے مراحل بھی آئے جب نہ صرف یہ کہ کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں تھا بلکہ خود اپنی صلاحیتیں
بھی جواب دے دیتی تھیں ایسے موقعوں پر صرف ایمان کی قوت اور ارادے کی پختگی ہی مقاصد کو
کامیابی سے ہمکنار کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔

یقیناً یہ بات حریت پسندوں کے شایانِ شان نہیں کہ وہ راہِ عمل میں پیش آنے والی
مشکلات اور آزمائشوں کے بارے میں گلہ گزار ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ آزمائشوں کے یہ دور حریت
پسندانہ زندگی کا لازمہ ہوتے ہیں اور انہیں خندہ پیشانی سے گلے لگانا ہی انقلابیوں کا شیوہ ہوتا ہے

کو سنوں گا۔ البتہ مجھے اس وقت کا انتظار ضرور رہے گا جب میں اپنا مقدمہ اپنے عوام کی عدالت میں پیش کروں گا یہ عدالت انشاء اللہ آزادی کی فضا میں میرے اپنے وطن میں لگائی جائے گی اس عدالت میں وہ تمام ریکارڈ اور گواہ پیش کئے جائینگے جو میرے کردار سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ عدالت میرے ساتھ ضرور انصاف کرے گی کیونکہ اس عدالت کے سامنے جو گواہ اور ریکارڈ پیش ہوگا اس کی تیاری میں نہ تو مقبوضہ سرینگر کے ''**مہتاب باغ**'' کے تفتیشی مرکز کا ہاتھ ہوگا اور نہ ہی مظفر آباد کے ''**دلائی کیمپ**'' اور لاہور کے ''**شاہی قلعہ**'' کے حکام استغاثہ کی فرضی کہانیاں تیار کرنے پر مامور ہوں گے، وہاں انصاف ہوگا اور صرف انصاف۔

اس خصوصی عدالت نے استفسارات کے دوارن مجھ سے ان اسباب کے بارے میں وضاحت طلب کی ہے جن کی بنا پر ایف۔آئی۔یو کے میجر نصیر گل خٹک نے اپنی رپورٹ میں سرینگر جیل سے میرے فرار کی صحت کو مشکوک قرار دیا تھا۔ عدالت میں دستاویزات کے معائنہ کے دوران ڈیڑھ سو کے قریب الفاظ پر مشتمل اس رپورٹ کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ رپورٹ نہ صرف واقعات کے بالکل منافی ہے بلکہ اگر اسے ایک کم فہم اور متعصب فوجی افسر کے ذہن کی پیداوار قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس رپورٹ کی بنیاد جن اسباب پر رکھی گئی ہے وہ تمام تر مفروضے ہیں اور انکا اصل صورتِ حال سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں اس بیان میں ان اسباب پر مفصل بحث نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کام میرے معزز وکیل صفائی کا ہے۔ تاہم ایک بات جس نے کم از کم مجھے حیران کیا یہ ہے کہ فوج کے اس بزعم خویش ماہر سراغرسان افسر کو میرے فرار کی کہانی میں بھی کچھ تضادات نظر آئے ہیں۔ فرار کی یہ کہانی اگر چہ ایک طویل داستان ہے تاہم میں نے اس کی تمام ضروری تفصیلات نہ صرف ایف۔آئی۔یو میں تحقیقات پر مامور ماہر حوالداروں اور ایک عدد صوبیدار کو بتائی تھی بلکہ ایف۔آئی۔سی میں منتقل ہونے پر اس مرکز میں پوچھ گچھ کرنے والے افسروں کو لکھ کر دی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ ایف۔آئی۔یو کے حوالداروں کے پلے کچھ بھی نہ آیا اور اپنی جان چھڑانے کے لئے یو

تفاصیل اس قدر شرمناک ہیں کہ انہیں ضبطِ تحریر میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔ شاہی قلعہ لاہور کے دو ماہ پر مشتمل دور میں تشدد و ظلم کا فیصلہ میں نے یومِ حساب پر اٹھا رکھا ہے۔

مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ یہ معزز عدالت اس مقدمے کے سلسلے میں میرے متعلق خواہ کیسا ہی فیصلہ کیوں نہ دے بہر حال میری ذات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ میرے اس احساس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اس معزز عدالت کے ارکان کی دیانت کے بارے میں کوئی شبہ ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ استغاثہ نے میرے خلاف اپنے من گھڑت الزامات ثابت کرنے کے لیے فرضی واقعات کا جو تانا بانا تیار کیا ہے ان کی حقیقت منظرِ عام پر لانے کیلئے میں موجودہ حالات میں کوئی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔ فرضی واقعات کی یہ کہانی اگرچہ بجائے خود الف لیلیٰ کی داستانوں سے بھی زیادہ افسانوی ہے تاہم استغاثہ کو اچھی طرح سے یہ معلوم تھا کہ میرے خلاف جو الزامات عائد کیے گئے ہیں ان کی حقیقت اس وقت تک منکشف نہیں ہو سکتی جب تک میرا وطن جنگ بندی کی منحوس لکیر کے باعث دو ناقابلِ عبور حصوں میں منقسم رہے گا۔ تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ میرے وطن کے اُفق پر آزادی کا حقیقی سورج طلوع ہو کر رہے گا۔ اور ہمارے دلوں پر کھینچی گئی یہ منحوس لکیر مٹ کر رہے گی۔ جس وقت یہ صورتِ حال پیدا ہوگی تو میرے کردار کے بارے میں اصل حقائق منظرِ عام پر آ کر رہیں گے۔ میرے ساتھ صرف اُس وقت انصاف ہوگا۔ یہ انصاف کشمیر کی تاریخ کی عدالت میں ہوگا۔ مجھ پر عائد کیا جانے والا ہندوستانی قابض حکام کا یہ الزام بھی غلط ثابت ہوگا کہ میں نے پاکستانی ایجنٹ بن کر مقبوضہ کشمیر میں حکومت کا تختہ الٹنے کی مجرمانہ سازش کی تکمیل کے لیے وہاں قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور پاکستانی نوکر شاہوں کا یہ الزام بھی بے بنیاد ثابت ہوگا کہ میں نے ہندوستانی ایجنٹ بن کر ہائی جیکنگ جیسا حریت پسندانہ اوپریشن کرایا۔

جو لوگ حریت پسندی کا شیوا اختیار کرتے ہیں وہ انتہائی صبر آزما حالات میں بھی بے چین یا مضطرب نہیں ہوا کرتے۔ میں کامل، سکون اور صبر و استقامت کے ساتھ اس معزز عدالت کے فیصلے

تنظیم کی کبھی نہ تو حمایت کی اور نہ ہی مدد۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں اور جرنیل یحییٰ خاں بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ روایتی جرنیلوں کی حکومتوں نے حریت پسندوں کے مخالف عناصر سے ایسے گٹھ جوڑ کیے جو حریت پسندوں کے لئے مشکلات کا باعث بنے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ الجزائر، ویت نام، فلسطینی اور افریقہ کی دوسری حریت پسند تنظیموں کو فوجی آمریت کے دور میں نہ صرف یہ کہ مناسب سرکاری پذیرائی حاصل نہ ہوئی بلکہ سرکاری پروپیگنڈا مشنری انہیں ''چھاپہ مار'' تنظیموں کے نام سے عوام میں متعارف کرتی رہی اور ''چھاپہ ماری'' کے تصور کو کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا گویا یہ اچھے اور سلیقہ مند سپاہیوں کا شعار نہیں بلکہ (GANGSTER) اور (DESPARADO) قسم کے پیشہ ور ڈاکوؤں اور رہزنوں کا شیوہ ہے۔ اپنی مخصوص ذہنی پرداخت کے باعث روایتی فوجیوں کا مسلح عوامی جدوجہد کے نظریے سے تطابق ممکن ہی نہیں اور جب روایتی جرنیلوں کو سیاسی قیادت کے باعث مفادات خصوصی بھی حاصل ہوں تو ایسی صورت میں وہ انسانوں کی آزادی کے لیے چلائی جانے والی مسلح عوامی تحریکوں کو اپنا حریف اور دشمن تصور کرتے ہیں۔ پاکستان کا فوجی حکمران ٹولہ اپنے دورِ اقتدار میں کبھی بھی کشمیر میں عوامی طرز کی مسلح جدوجہد آزادی کا حامی نہیں تھا۔ اس ٹولے کو اس نظریے سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو سور کے گوشت سے۔ یہی وجہ تھی کہ 1965ء کی جنگ اپنے مقصد کے اعتبار سے محض ایک کوششِ ناکام ثابت ہو کر رہ گئی اور کشمیری عوام کے لئے انجام کار اس دستاویز غلامی پر منتج ہوئی جسے عرفِ عام میں **معاہدہ تاشقند** کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو زیرِ عتاب لائے جانے کی اصل وجہ فوجی حکمرانوں کی یہی بنیادی مخاصمت ہے۔

استفسارات کے دوران مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں سروے آف پاکستان کی طرف سے جاری کردہ کسی بھی مفصل اور کلاسیفائیڈ نقشے پر اس راستے کی وضاحت کروں جو میں نے سرینگر جیل سے فرار کے بعد آزاد کشمیر کی سرحد تک اختیار کیا۔ یہ نقشہ فراہم نہیں کیا جاسکا۔ لہذا مجھے ایک

چھ کے آخری روز انہوں نے ایک نائب صوبیدار کو میرے بیان کی تکمیل پر مامور کیا جس کو میں گھنٹوں اپنی DICTATE کراتا رہا۔ ایف۔ آئی۔ سی میں البتہ میری کہانی کو سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کی گئی۔ چھ ہفتوں کے طویل عرصے میں فرار سے متعلق منصوبہ بندی اور اس کی تکمیل کے بارے میں مجھ پر شدید اور مفصل جرح ہوئی اور اس کے نتیجے میں جو کچھ منظر عام پر آیا وہ ایف۔ آئی۔ سی اور ریویو بورڈ کی رپورٹوں کی صورت میں اس عدالت کے سامنے ہے۔ مجھے فرار سے متعلق ان واقعات کو ایک مرتبہ پھر ضبط تحریر میں لانا پڑا تا کہ میرے معزز وکیل صفائی استغاثہ کے ان گواہوں پر جرح کر سکیں جو میرے فرار سے متعلق پولیس کی فرضی کہانی کے مطابق بیان دینے اس عدالت میں حاضر ہوئے تھے۔ یہ تحریر میں نے اپنے معزز وکیل صفائی جناب اعجاز حسین بٹالوی کے لئے بطور انسٹر کشنز لکھی تھی۔ میں اسے من وعن اس عدالت کی توجہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس میں وہ تضادات کہیں بھی نظر نہ آئے جو میجر خٹک کی سراغرساں آنکھ کو دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کے فوجی سراغرساں اداروں کے ریکارڈ میں ہر اُس شخص کو سیاہ (BLACK) قرار دیا جاتا رہا جو اس ملک پر مسلّط فوجی آمروں کی پالیسیوں اور طرزِ عمل سے اختلاف جیسے ''جرم'' کا مرتکب ہوا۔ بعینہٖ ہر وہ شخص غدار اور دشمن کا ایجنٹ قرار دیا جاتا رہا جو قومی معاملات میں حکمران ٹولے کی منشا اور مرضی سے ہٹ کر کسی دوسرے لائحہ عمل پر چل پڑا۔

مجھے میجر خٹک اور اس کی قبیل کے دیگر تمام فوجی افسروں پر رحم آتا ہے۔ غلط نتائج اخذ کرنے میں ان کا اپنا قصور کم اور ان پر مسلط پالیسی ساز جرنیلوں اور اس روایتی تربیت کا زیادہ ہے جو نوآبادیاتی حکمرانوں سے ہماری فوج کو ورثے میں ملی ہے، وہ روایتی فوجوں کے جرنیل یوں بھی مسلح عوامی جدوجہد کے نظریے سے بیر رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نظریہ فوجی مقاصد کے حصول کے لئے اسلحہ کے استعمال پر فوجیوں کی اجارہ داری کو ختم کرتا ہے۔ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فوجی آمروں نے دنیا کے کسی بھی حصے میں مسلح عوامی جدوجہد کی حامی کسی بھی مصروفِ جنگ حریت پسند

فٹ بلند ناقابلِ عبور برف پوش پہاڑوں کو بے سروسامانی کی حالت میں پورے چھ روز کے مسلسل سفر کے دوران عبور کرتا ہوا اس عافیت گاہ میں پہنچ سکا تھا جسے "آزاد کشمیر" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میرے ہم وطنوں نے لالچ اور سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر جس طرح مجھ سے تعاون کیا ہماری قومی تحریک آزادی میں وہ روشنی کا ایک مینار ثابت ہوگا اور آنے والی نسلیں اسے ایک قابلِ قدر نمونہ تصور کریں گے۔ یہ اس تعاون کا کرشمہ تھا کہ ہماری آزادی کی دشمن طاقتیں مجھے دوبارہ گرفتار نہ کر سکیں اور یوں عوامی تعاون کی مدد سے ہمارے خلاف دشمن کی جوابی کارروائی ناکام ہوگئی۔

استفسارات کے دوران مجھ سے نور العارفین کمیشن میں دیئے گئے میرے بیان کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا تھا جیسا کہ میں نے جواب دیا تھا یہ بیان بنیادی طور پر درست ہے البتہ اس میں چند مقامات پر وضاحتوں کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ بیان پہلی مرتبہ اس عدالت میں پڑھا اور جن نکات پر وضاحت اور تشریح کی ضرورت ہے، میں نے ان کو خط کشید کیا ہے۔ جب یہ بیان زیرِ بحث آئے گا وضاحت پیش کی جائے گی۔ ☆ میں اب اس عدالت کا مزید وقت لینا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خصوصی عدالت جلد سے جلد وہ فرض پورا کرے جو اسے ایک خصوصی حکم کے تحت تفویض کیا گیا ہے۔ میرے لئے سوائے اس کے فی الوقت اور کوئی راستہ نہیں کہ خود کو وقت کے بے رحم ہاتھوں کے سپرد کر دوں اور اس موقعہ کا انتظار کروں جب تعصب، بدنیتی، ظلم، استحصال اور مکر و فریب کے بادل چھٹ جائینگے اور حق و انصاف کی روشنی عام ہو جائے گی۔ اس موقعہ پر میرا اصل مقدمہ اس وقت کی اصل عدالت میں پیش ہوگا اور میں انصاف کے لئے اپنے دست دراز کروں گا۔

محمد مقبول بٹ

☆ مقبول بٹ شہید کے سری نگر جیل سے فرار کی خود نوشت کہانی کو ادارہ عکس میر پور نے خوبصورت کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

(UNRESTRICTED) نقشے پر ہی اس راستے کا تعین کرنا پڑا۔ چونکہ اس نقشے پر ان تمام مقامات کو دکھایا نہیں گیا ہے جن سے دورانِ سفر میرا گزر ہوا لہذا میں عدالت کی توجہ کے لئے از خود ایک نقشہ بنا کر پیش کرتا ہوں اس میں درج تفصیلات کی تصدیق اگر مقصود ہو تو میری تجویز ہے کہ فوج کے محکمہ سراغرسانی سے مفصل قسم کا ممنوعہ نقشہ کشمیر منگوا کر اس کی جانچ پڑتال کی جائے۔ میں نے اس نقشے میں سفر کی تفصیلات تاریخ وار بیان کی ہیں۔

سولہ روز کا یہ سفر میری زندگی کا تاریخی سفر تھا۔ اس دوران مجھے جن تجربات اور مشاہدات سے سابقہ پڑا، میں اسے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ تصور کرتا ہوں۔ جیل سے فرار کی تکمیل میں میرے اپنے ذہن کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ تائیدِ ایزدی کا دخل تھا مگر اس سولہ روزہ سفر نے میرے ایمان اور اعتقاد کو جلا بخشی۔ جس والہانہ عقیدت اور محبت کے ساتھ میرے وطن کے محکوم عوام نے میرے مشن کی تکمیل میں مجھ سے تعاون کیا اور قدم قدم پر میری دستگیری کی اس کے گہرے نقوش میں اپنے دل و دماغ سے کبھی مٹا نہیں سکتا۔ جس اخلاص اور جذبہ نیک نیتی کے مظاہرے اس دوران میں نے دیکھے اس کی روشنی میں میرا یہ یقین تازہ ہو گیا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب آزادی کا سورج طلوع ہو کر رہے گا اور غلامی کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ مجھے محبت اور تشکر کے وہ آنسو ہمیشہ یاد رہیں گے جو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف روانہ ہوتے وقت مجھے اور میرے ساتھیوں کو رخصت کرنے والوں کے معصوم چہروں پر قطار اندر قطار گرتے۔ قدرت اس قدر بے رحم یقیناً نہیں ہے کہ دلوں کی گہرائیوں سے نکلنے والی آہوں اور دعاؤں کو شرف قبولیت نہ بخشے۔ میں وہ رقت آمیز منظر کبھی نہیں بھولتا جب وادی کشمیر میں آباد اس آخری بستی سے میرے چند ہم وطنوں نے مجھے رخصت کیا۔ شام کے دھندلکے میں میرے مستقر پر موجود ان مقامی ساتھیوں اور دوستوں نے جس والہانہ عقیدت، آبدیدہ چہروں اور گلوگیر آوازوں کے ساتھ مجھے الوداع کہا، میں اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ انہیں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ میں دسمبر کی خون منجمد کرنے والی سردی میں 13 اور 14 ہزار

اُس مارے نی مِلنی مثال کوئی نہی
شاہی قلعے وچ سہی دشواری اُس نے
اوہ ایجنٹ نہ بنیا غاصباں ناں
اپنے نظریے ناں کیتی نہ غداری اُس نے
اوہ اشرؔف کردار ناں اشرف سا
اپنے عمل ناں ہستی سنواری اُس نے
صوفیؔ کشمیر ناں پُتر گیا کشمیر آخر
اس طرح دیس ناں کیتی وفاداری اُس نے

پروفیسر اشرف قریشی

ڈاکٹر آفتاب حسین صومی

اوہ دیس ناں عظیم پُتر
ناں دیس پر زندگی گزاری اُس نے
ہسن کھیڑ نال اُس نہ پیار کیتا
اپنی قوم وسطے کیتی آہ وزاری اُس نے
بدلے تقریر اُس عملی تدبیر کیتی
رکھی ذہن اِچ جنت ساری اُس نے
اپنے پرائے خیش قبیلہ پُھل کے
بس تہرتی ما ای رکھی پیاری اُس نے
کیتا گنگا اغوا اس نال ہاشم
توخنی تحریک وچ پھوک ماری اُس نے

اپنے دردی جہڑے پیارے وی سن
پائی اُنہاں نی دشمن داری اُس نے

محمد اشرف قریشی

مادرِ وطن جموں کشمیر کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کروانے اور اسے دنیا کے آزاد، خوشحال اور خودمختار ملکوں کی صف میں شامل کرنے کیلئے جن نوجوانوں نے اپنا ہنستا مسکراتا شباب، ماں باپ، عزیز واقارب، روشن مستقبل کے سہانے خواب، عیش وعشرت اور اپنا وطنِ عزیز چھوڑ کر کانٹوں پر چلنے اور موت کو سینے سے لگانے کو ترجیح دی، ان میں عظیم کشمیری حریت پسند، بے باک، نڈر، ناقابلِ تسخیر، عزم وہمت کے پیکر جناب اشرف قریشی کا نام تاریخ کشمیر میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

اشرف قریشی 1950ء کو ریاست جموں کشمیر کے دارالحکومت سری نگر کے معروف محلہ مجاہد منزل میں ایک غیور اور حریت پسند گھرانے میں پیدا ہوئے۔ محلہ مجاہد منزل اس عہد میں سیاسیاتِ کشمیر کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ علاقہ حکومتِ وقت اور آزادی پسند عوام کے درمیان معرکہ آرائیوں اور جھڑپوں کا مرکز تھا۔ اشرف قریشی نے جب آنکھ کھولی تو وادیٔ کشمیر میں ہر طرف گولہ بارود کی بو رچی بسی تھی۔ 1947ء میں جبری تقسیم کے سبب خطہ کشمیر بھارت اور پاکستان کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ اور دیگر آزادی پسند عناصر بھارت کے خلاف سرگرمِ عمل تھے۔ اشرف قریشی نے جب ہوش سنبھالا تو اسے اپنے اردگرد بھارت کے خلاف جلسے، جلوس، نعرے اور مظاہرے دیکھنے کو ملے۔ ننھا مجاہد، چُپ چاپ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اشرف قریشی کو حصول تعلیم کے لئے گورنمنٹ مڈل سکول حبہ کدل میں داخل کروایا گیا۔ سکول کے زمانے میں اشرف قریشی نے اپنے ننھے منھے طالب علم ساتھیوں کے ساتھ مل کر بھارت مخالف مظاہروں میں حصہ لیا اور بھارتی فوجیوں پر

غزل

تاج سعید

ہمیں سے رونق زنداں ہمیں سے عزتِ دار
ہمیں سے پھول کی رنگت، ہمیں سے رقصِ بہار

ہر اک اندھیرے اجالے سے بے نیاز ہیں ہم
ہمیں زمیں کے گلِ تر سے نوکِ خار سے پیار

دل و نظر پہ کئی بار بجلیاں برسیں
رکا نہیں ہے کبھی کاروانِ فصلِ بہار

یہ پیلی رُت بھی چمن پر نکھار لوٹے گی
جو دیکھ پائے ہیں اس گل بدن کے رخ کا نکھار

وہ شوخ پاس نہیں ہے تو کوئی بات نہیں
قرار جاں نہ سہی، ہے دل و نظر کا قرار

سے ہٹ گئی اور شرکاء جلوس نے شہداء کی تدفین کردی۔ میٹرک کا امتحان ایس پی ہائی سکول سے پاس کرنے کے بعد اشرف قریشی نے ایف ایس سی کا امتحان اسلامیہ کالج سے پاس کیا۔

اشرف قریشی کا خاندان بھارتی مقبوضہ کشمیر میں قائم محاذ رائے شماری کے ساتھ وابستہ تھا اور کشمیریوں کیلئے حقِ خودارادیت کا حامی تھا۔ شیخ عبداللہ ان دنوں کوڈائی کنال (جنوبی ہندوستان) میں نظربند تھے۔ اشرف قریشی شیخ عبداللہ کو جیل میں خطوط لکھتے اور شیخ صاحب انہیں باقاعدہ جواب دیتے۔

دسمبر 1968ء میں NLF کے راہنما مقبول بٹ اپنے دوساتھیوں میر احمد اور یاسین کے ہمراہ سری نگر جیل سے فرار ہوئے تو یہ خبر وادی کشمیر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور حریت پسند کشمیریوں کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ بھارتی حکومت اور اس کی سری نگر میں قائم کٹھ پتلی انتظامیہ نے اپنے پوری قوت اور وسائل استعمال میں لائے لیکن وہ ان مفرور قیدیوں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ اس واقعہ نے اشرف قریشی کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

1970ء میں اشرف قریشی ہاشم قریشی کے توسط سے NLF میں شامل ہو گئے۔ خوشنویسی اور مصوری اشرف قریشی کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ چنانچہ NLF میں شامل ہونے کے بعد انہیں تنظیم کے اشتہارات لکھنے اور دیواروں پر چسپاں کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اِن اشتہارات میں کشمیری نوجوانوں کو الجیریا، ویت نام اور فلسطین کی طرح مسلح گوریلہ جنگ کیلئے تیار ہونے کی تربیت دی جاتی تھی۔ بھارتی طیارہ اغوا کرنے کے منصوبے پر اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے اگست 1970ء سے کام شروع کردیا تھا۔ انہیں ایک تیسرے ساتھی کی عدم شمولیت کے سبب یہ کام ملتوی کرنا پڑا۔ بالآخر 30 جنوری 1970ء کو اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے یہ عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔

19 سال کی عمر میں اپنے مادرِ وطن کی غلامی اور کشمیری قوم کی غلامانہ حالتِ زار کی طرف عالمی رائے عامہ کو متوجہ کرنے اور بھارتی مظالم کو بے نقاب کرنے کیلئے اشرف قریشی نے اپنے ساتھی کے ہمراہ بھارتی طیارہ گنگا کو اغوا کر کے جو عظیم کارنامہ سرانجام دیا اُس کے نتیجے میں انہیں ظلم وتشدد کے جس وحشیانہ دور سے گزرنا پڑا، اُس کی چند جھلکیاں اشرف قریشی کے ذیل میں دیئے گئے عدالتی بیان

سنگ باری کی۔ ایک روز اشرف قریشی اپنے گھر کے باہر گلی کی نکر پر کھڑا تھا، باہر موئے مبارک گمشدگی کی تحریک کے سلسلے میں سری نگر کے گلی محلے میدانِ جنگ کا منظر پیش کررہے تھے۔ ایک بھارتی فوجی نے طیش میں آکر اشرف قریشی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ گولی اشرف کی دائیں ٹانگ پر لگی تو اشرف زمین پر گر پڑا۔ بھارتی فوجی نے اشرف قریشی کے سینے میں سنگین گھونپ دی۔ بھارتی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مظاہرین نے آگے بڑھ کر خون آلود اشرف کو اٹھا کر فوری طبی امداد مہیا کی۔ جس سے اشرف قریشی موت کے منہ میں جانے سے تو بچ گیا لیکن ٹانگ اور سینے پر لگے ہوئے زخموں نے بھارت کے خلاف نفرت کا لاوہ اُس کے رگ و ریشے میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔

اشرف قریشی کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کے بعد ان کے والد خواجہ عبدالعزیز قریشی نے محلہ مجاہد منزل کو خیرباد کہہ کر نوہٹہ کے محلہ سید محمد حصاری میں سکونت اختیار کرلی۔ ٹڈل سکول حبہ کدل سے آٹھویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھیں ایس پی سکول میں داخل کروادیا گیا۔ وہاں پہنچ کر اشرف قریشی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو مزید جلا ملی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کا گورنر کرن سنگھ ایس پی سکول میں ایک خصوصی تقریب میں شرکت کے لیے آیا۔ اشرف قریشی اور اس کے دوستوں نے تقریب میں گڑبڑ پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ایک طالبہ نے تقریر کرتے ہوئے جب اقوام متحدہ کے کردار پر کڑی تنقید کی تو اشرف قریشی اور اس کے ساتھی تقریر کرنے والی طالبہ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور شدید نعرہ بازی کرتے ہوئے تقریب کو درہم برہم کردیا۔

27,26 دسمبر 1963ء کی درمیانی رات کو کشمیر کی مشہور درگاہ حضرت بل سے حضور نبی اکرم ﷺ کا بال مبارک ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت چوری کرلیا گیا تو وادی کشمیر میں بھارت کے خلاف ایک زبردست تحریک برپا ہوگئی۔ اس تحریک میں بھی اشرف قریشی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک کے دوران ایک موقع پر جبکہ شہداء کی نعشیں جامع مسجد میں پڑی تھیں۔ ان کی تدفین کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ اشرف قریشی اور اس کے چند ساتھیوں نے ایک منصوبہ تیار کیا اور ایک خالی تابوت کو کندھوں پر اُٹھا کر گھر سے باہر نکلے۔ لوگ اس تابوت کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ کچھ ہی دیر میں اس جنازے نے ایک بڑے جلوس کی شکل اختیار کرلی۔ عوام کا جمِ غفیر دیکھ کر حکومت راستے

عدالتی بیان

(سوئے دار چلے)

میں محمد اشرف قریشی ایک کشمیری حریت پسند ہوں۔ میں سیاستدان نہیں ہوں، نہ ہی میں عالم فاضل شخص ہوں۔ میں نے بحث مباحثوں اور الیکشنوں وغیرہ میں بہت کم حصہ لیا۔ روائتی سیاست سے مجھے نہ آج دلچسپی ہے اور نہ پہلے کبھی رہی ہے۔ میری اصل حیثیت کشمیر کی آزادی کے ایک معمولی سپاہی کی ہے۔ میرے سیاسی عقائد بہت سیدھے سادھے ہیں۔ سب سے اوّل یہ کہ میں ہادی برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (میں اور میرے ماں باپ ان پر سو بار نثار ہوں) کا ایک ادنیٰ پیروکار ہوں۔ چونکہ میں مسلمان ہوں اس واسطے میں غلامی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اور میرا ایمان ہے کہ مجھ پر غلامی کے خلاف جہاد فرض ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے اپنے وطن سے عشق ہے۔ مجھے معلوم کہ دنیا کی دیگر آزاد قوموں کی نظر میں ہم کشمیریوں کی کچھ زیادہ وقعت نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کچھ لوگ ہم کشمیریوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم آزادی کے قابل ہی نہیں ہیں کیونکہ ہم میں آزادی کی جنگ لڑنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ لیکن میں ان طعنوں کو درست تسلیم نہیں کرتا۔ میرے دل میں ایک زبردست امنگ تھی اور آج بھی ہے کہ ہم کشمیری تمام دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہم غلامی سے شدید نفرت کرتے ہیں اور یہ کہ ہم اپنی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے غلامی سے شدید نفرت ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ خیال کیا ہے کہ وطن سے محبت کا اظہار غلامی کے خلاف جنگ کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ میں اس مقصد کے لئے جنگ کو جائز سمجھتا ہوں۔

میں ملاحظہ فرمائیں ۔ انہوں نے یہ عدالتی بیان 23 جون 1972ء کو پاکستان کی خصوصی عدالت کے سامنے ریکارڈ کروایا تھا، جسے بعد ازاں ڈیفنس کمیٹی نے "سوئے دار چلے" کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع کیا تھا۔

گنگا کیس سے رہائی کے بعد اشرف قریشی نے بی ایس سی اور ایم ایس سی (جیالوجی) کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔ انہوں نے ایم اے کشمیر سٹڈیز کا امتحان اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے 1989ء میں پاس کیا۔ اسی عرصے میں وہ مذکورہ شعبے میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ راقم کو پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف قریشی کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جدوجہد آزادی کا یہ عظیم مجاہد گزشتہ مسلسل دس برس تک سنگین بیماری کا شکار چلا آ رہا تھا گنگا کیس کے دوران لاہور کے شاہی قلعے میں اس عظیم حریت پسند پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے، جس کے سبب ان کی زندگی کے آخری کئی برس شدید تکلیف اور بیماری میں گزرے۔ یہ مردِ مجاہد برس ہا برس موت سے نبرد آزما رہا۔ انہوں نے کشمیر سٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ شعبہ کشمیریات میں تادمِ حیات خدمات سرانجام دیتے رہے۔ 19 برس کی عمر میں آزادی کی نیلم پری کو حاصل کرنے کے لئے وادئ جنت نظیر سے نکلنے والا یہ عظیم مسافر بالآخر 2، فروری 2012ء کو راولپنڈی میں علی الصبح 2:30 بجے داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ انہیں اپنے وطنِ عزیز کشمیر کی سرزمین میرپور میں سیکٹر الیف، ون کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

میرے بچو! مرے پرچم کو اُٹھا کر چلنا
میں رہوں یا نہ رہوں، قدم بڑھا کر چلنا
ظلم دنیا میں کبھی نہ پنپنے دینا
جبر اور جور سے تم آنکھ مِلا کر چلنا

(افضل ضیائی)

اشرف قریشی ولد عبدالعزیز قریشی ساکن نوہٹہ سری نگر کی اپنی مرضی ومنشا اور ارادے کا نتیجہ ہے۔ اس قدم کو اٹھانے میں میرا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیا اس ہائی جیکنگ کو کشمیری عوام کے آزادی حاصل کرنے کے ارادے کو علامت کے طور پر دیکھے۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ ہائی جیکنگ کشمیری نوجوانوں کے ذہن میں مسلح جدوجہد کے آغاز کی علامت بن کر ابھرے۔

آج جب کہ میں اس عدالت میں ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوں، میں ان فولادی زنجیروں کو چومتا ہوں اور اس عدالت سے کہتا ہوں کہ میں اپنے کیے پر نادم نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی آئندہ ہوں گا۔ مجھے بھارتی جہاز ہائی جیک کرنے پر فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ممکن ہے کہ یہ فعل اس عدالت کی نظر میں جرم ثابت ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے جو اپنا فرض نظر آیا میں نے ادا کر دیا اور اس عدالت کو بھی جو اپنا فرض نظر آتا ہے وہ بھی ادا کر دے۔ مجھے اس عدالت سے رحم کی کوئی درخواست نہیں کرنی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ مجھ پر ''بھارتی ایجنٹ'' ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ یہ نہ صرف جھوٹ ہے بلکہ لغو ہے۔ یہ نہ صرف لغو ہے بلکہ نجس ہے۔ مجھ پر یہ الزام ایک ذلیل سازش کے تحت لگایا گیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ مجھ پر یہ الزام یحییٰ خان کے ٹولے نے پاکستانی عوام میں ہماری مقبولیت سے خوف زدہ ہو کر لگایا ہے۔ دراصل ہماری مقبولیت مسلح جدوجہد کے نظریے کی مقبولیت تھی۔ یہ ہر آمریت کا خاصہ ہے کہ وہ عوامی جنگ کی حامی تحریکوں سے خائف ہو، یحییٰ خان پاکستانی عوام کو دھوکا دے رہا تھا کہ وہ کشمیر کی آزادی کا قائل تھا۔ درحقیقت وہ کشمیر کو بدستور بھارت کا حصہ بنا رہنا دیکھنا چاہتا تھا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ نہ صرف منحوس یحییٰ خان بلکہ اکثر پاکستانی سیاست دان پاکستانی عوام کو پچھلے چوبیس سال سے کشمیر کے مسئلہ پر دھوکا دیتے چلے آرہے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں وہ خود کوئی ٹھوس قدم اٹھانے سے ہچکچاتے رہے ہیں۔ لیکن اپنی بزدلی اور مصلحت کوشیوں کا قصور وہ ہم کشمیریوں کے سر پر تھوپ دیتے ہیں۔ بھارتی طیارے کے اغوا نے ثابت کر دیا تھا کہ کشمیری اپنی آزادی خود اپنے خون کے عوض حاصل کرنے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہیں۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ پاکستانی عوام کشمیر کی آزادی کے لیے کس قدر جوش وخروش رکھتے ہیں۔ اور

میں بیان کر چکا ہوں کہ مجھے احساس ہے کہ دنیا سمجھتی ہے کہ ہم کشمیری ایک طویل مدت تک اس واسطے غلام رہے کہ ہم ایک بزدل قوم ہیں۔ میرے جسم کا ایک ایک رونگٹا اس خیال کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ میں بزدلی کے اس طعنہ کو رد کرتا ہوں اور آخری دم تک رد کرتا رہوں گا۔ میں نہیں مانتا کہ کشمیری بزدل ہیں۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہم کشمیری لوگ کسی دوسری قوم سے کم بہادر نہیں۔ میں اس عدالت کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ ہم کشمیری ایک دلیر قوم ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ہم لوگوں کو آج تک صرف ظلم سہنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ ہمارے قائدین نے ہمیں ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی راہ نہیں دکھائی تھی۔ قومی محاذِ آزادی کے رابطہ سے پہلے میں خود بھی مسلح جدوجہد کرنے کیلئے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ یہی حال ایک عام کشمیری کا تھا۔ میں نے جناب مقبول احمد بٹ کی قیادت کو تسلیم ہی اس وجہ سے کیا کہ وہ عام کشمیری نوجوانوں کی نظر میں مسلح جدوجہد کی علامت بن چکے تھے۔

قائدِ انقلاب جناب مقبول احمد بٹ نے اپنے عمل سے میرے لئے اور میری طرح ہزاروں کشمیری نوجوانوں کے لئے مسلح جدوجہد کی راہ کی نشاندہی کی ہے۔ یہ ان ہی کی قیادت کا فیض ہے کہ قومی محاذِ آزادی میں شامل ہونے کے بعد میری زندگی کا مقصد اپنے وطن کو خود اپنے عوام کی طاقت پر بھروسہ کر کے بھارتی تسلط سے آزاد کرانا بن چکا ہے۔ میں اپنے پروردگار سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس مقصد میں تاحیات ثابت قدم رکھے۔ پس یہ میرا جزدِ ایمان ہے کہ کشمیری عوام اپنی قوت پر خود بھروسہ کر کے بھارت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کر سکتے ہیں اور اس جدوجہد میں کامیابی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

میں کھلے الفاظ میں تسلیم کرتا ہوں کہ 30 جنوری 1971ء کو جو بھارتی طیارہ ''گنگا'' سری نگر سے اغوا ہوا تھا وہ میں نے اغوا کیا تھا۔ یہ قدم میں نے پوری طرح سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا اور اسے قومی محاذِ آزادی کے ہائی کمان کے حکم کی تعمیل میں سرانجام دیا تھا۔ بہر حال یہ قدم میرا دیدہ ودانستہ ہے اور میں اپنے مقدس مقصد کی توہین سمجھتا ہوں کہ اپنے اس فعل کی صفائی میں کسی قسم کی تاویل یا حجت پیش کروں۔ پس اس عدالت پر واضح رہے کہ ''گنگا'' طیارے کی ہائی جیکنگ میرے یعنی محمد

اس کا ٹولہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ ان لغو باتوں پر کچھ کچھ کان دھرا۔ ہمارے پاس نہ کوئی ریڈیو سٹیشن تھا اور نہ اخبار کہ ہم جھوٹ اور بہتان کے اس طومار کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکتے۔ لیکن میرے پاکستانی بزرگوں اور بھائیوں کو اتنا تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ کیا وہ شخص جس کو آکاش وانی اپنا گلا پھاڑ پھاڑ کر ''ہوائی قزاق'' کے نام سے پکار رہی ہو بھاگ کر ہندوستان پناہ لینے جائے گا؟ اس سرزمین نے مجھ کو سینے سے لگایا تھا اور میں نے اس سرزمین کو سینے سے لگایا تھا۔ بھلا میں اس سرزمین کو چوروں کی طرح کیوں چھوڑتا؟ آخر میرے پاکستانی دوستوں کو یہ کیوں یاد نہ رہا کہ یحیٰی خان کے مقدمہ چلانے سے پہلے اندرا گاندھی نے ہم پر پاکستانی ایجنٹ ہونے کے الزام میں مقدمہ کی کارروائی شروع کر دی تھی؟ ہم تو اس خونیں عورت کے کھوٹے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ سری نگر میں میرے خاندان پر جو مظالم ڈھائے گئے ہیں وہ بھی ایک طویل داستان ہے اور ایک نہ ایک روز پاکستانی عوام کے سامنے آئے گی۔ اندرا گاندھی کے سینے میں ٹھنڈک تو اس روز پڑی جب پاکستان ریڈیو نے ہماری گرفتاری کی خبر نشر کی۔ کیا یہ عجیب اتفاق نہیں کہ ایک ہی وقت لاہور میں مجھ پر بھارتی ایجنٹ ہونے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہو اور سری نگر میں پاکستانی ایجنٹ ہونے کے الزام میں بھی بالکل اسی نوعیت کی کارروائی ہو رہی ہو؟ کاش کہ اس حکومت نے یہ سوچ لیا ہوتا کہ ہم پر مقدمہ چلا کر وہ ایک ایسا کام کر رہی ہے جو کہ صرف بھارتی حکومت کو زیب دیتا تھا۔ اپنی جگہ مجھے تو یہ خدشہ ہے کہ یحیٰی خان کے ٹولے میں چند خفیہ بھارتی ایجنٹ موجود تھے جنہوں نے ہم پر مقدمہ چلانے کی سازش کی تاکہ وہ کام جو بھارتی حکومت سرانجام نہیں دے سکتی تھی پاکستانی حکومت کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مجھے اطہر نامی ڈی آئی جی پر بہت شک ہے۔ یہ شخص ہندوستان کا مہاجر ہے اور اس کے رشتہ دار اور دوست اب بھی بھارتی حکومت کے نوکر ہیں۔ جس بے رحم انداز میں اس شخص نے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر تشدد کیا اور کروایا اس کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے یعنی دیگر کشمیری حریت پسندوں کو مسلح جدوجہد کرنے سے باز رکھنا۔ یہ شخص اعلانیہ طور پر دیگر کشمیریوں کو عبرت دینے کے لیے ہم پر تشدد کرواتا تھا۔ بعض اوقات جب میں اور میرے ساتھی درد کی شدت سے نڈھال ہو گئے ہوتے تو وہ ہمارے سامنے آ کر ہمارا منہ چڑاتا اور جہاد کشمیر

انہوں نے ہمارے اس اقدام کو کس والہانہ طور پر سراہا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ مرحلہ آ گیا ہے جب پاکستانی عوام اپنے پر مسلط حکمرانوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ کشمیر کی جنگ آزادی میں روڑے نہ اٹکائیں۔ قومی محاذ آزادی کا انقلابی مسلک ایک سیلاب بن کر پاکستانی عوام کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ میں نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا تھا کہ لاہور اور گوجرانوالہ میں میری اور ہاشم قریشی کی تقریروں کے دوران عوام کی جانب سے از خود "مجیب قیوم مردہ باد" "یحییٰ خان مردہ باد" اور "آمریت مردہ باد" کے نعرے بلند ہوتے رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں شارع قائداعظم پر پرانی یونیورسٹی کی عمارت کے سامنے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں تقریر کر رہا تھا تو جونہی میں نے اس بات کا ذکر کیا کہ مضبوط پاکستان ہی کشمیر کی آزادی کی ضمانت ہے۔ دفعتاً انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اجتماع سے "یحییٰ خان مردہ باد" اور "آمریت مردہ باد" کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ پاکستانی عوام کو اس بات کا کس قدر گہرا شعور حاصل تھا کہ اس سرزمین کی جڑوں کو آمرانہ نظام ہی کھوکھلا کر رہا تھا۔ اس نعرۂ رندانہ کی گونج اس وقت کے اخباروں میں تو شاید نہ ملے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے یحییٰ خان کی آمریت کے ایوان میں کھلبلی مچا دی ہوگی۔ میں نے اپنی گوجرانوالہ والی تقریر میں بھی پاکستان میں جمہوریت کی بحالی پر زور دیا تھا۔ موجودہ مقدمہ اور یہ گھناؤنے الزام اس گستاخی کی پاداش ہیں۔ ہم سے یہ ایک خوف زدہ، بزدل آمر کا انتقام ہے۔ دراصل یحییٰ خان کی سازش جموں کشمیر کے قومی محاذ آزادی کو سیاسی طور پر قتل کر دینے کی تھی۔

یحییٰ خان نے مجھ پر بھارتی جاسوس ہونے کا الزام لگایا ہے یعنی پاکستانی عوام کا غدار مجھے جاسوس کہہ رہا ہے۔ مارشل لاء کے کالے دور میں میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف آمریت کے پروپیگنڈہ کے تمام تر وسائل حرکت میں آ گئے۔ یحییٰ خان کے مقبوضہ اخباروں اور ریڈیو نے ہمارے خلاف افواہوں، وسوسوں اور شکوک کی ایک منظم مہم چلائی۔ دن رات عوام کے کانوں میں من گھڑت خبریں انڈیلی جاتی رہیں۔ مثلاً یہ بیہودہ بات کہ میں نے اور ہاشم نے پاکستان سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ مجھے رنج ہے کہ میرے پاکستانی بھائیوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یحییٰ خان اور

ترین اذیت پہنچائی گئی۔ کیوں؟ پولیس مجھ سے کہتی تھی کہ میں مان لوں کہ میں بھارتی ایجنٹ ہوں۔ بھلا میں کیونکر مان سکتا تھا کہ میں بھارتی ایجنٹ ہوں۔ میں بھارت کا دشمن ہوں۔ میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بھارتی طیارے کو اغوا کیا تھا۔ بھلا مجھ سے یہ کیوں منوانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ میں اپنا دشمن خود ہوں؟ کیا مجھ پر تشدد کرنے والے مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے تھے کہ ہم کشمیری بہادری کا کوئی بھی کارنامہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ اگر اس مرحلہ پر میں نے کمزوری دکھائی تو یہ معاملہ صرف میری ذات تک ہی محدود نہ رہے گا بلکہ تمام کشمیری قوم کے منہ پر کالک لگ جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ میں آخری دم تک اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا۔ اقبالِ جرم کی وہ دستاویز جو پولیس نے عدالت میں پیش کی ہے فرضی اور مصنوعی ہے۔ میں نے مجسٹریٹ کے سامنے اس ''اقبالِ جرم'' کا ایک لفظ بھی پڑھ کر نہیں سنایا۔ میں یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ آخر سفید کو سیاہ بنانے کی یہ کوشش کیوں کی گئی؟ یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اب بھی مجھ پر ایسے لمحے آتے ہیں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں کبھی لاہور کے شاہی قلعہ گیا ہی نہیں........ گویا کہ تشدد کے وہ تمام لرزہ خیز تجربات جن سے میں گزر چکا ہوں کبھی ظہور پذیر ہی نہیں ہوئے۔ گویا سال 1971ء کی خون آلود گرمیاں کبھی گزری ہی نہیں........ گویا تاریک تہہ خانوں کے وہ آسیب زدہ شب وروز سب ایک بھیانک خواب ہے۔

میں نے بہت سوچا ہے کہ کیا واقعی مجھ سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہوا جس کی پاداش میں یہ سزا مجھے ملی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے زندان کی دیوار سے باہر عوام کے ذہن میں یہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان کا سقوط ''گنگا'' طیارے کے جلنے کی وجہ سے عمل میں آیا۔ یہ جھوٹ ہے ایک بہت بڑا بہتان ہے! مجھے تسلیم ہے کہ اس طیارے کے جلانے کے عمل میں میں شامل تھا لیکن مجھے اس بات پر اصرار کرنا ہے کہ میں نے محض ایک عدد بھارتی طیارہ جلایا ہے۔ میں نے مشرقی پاکستان کو آگ نہیں لگائی۔۔۔۔ مشرقی پاکستان کو آگ لگانے والے اور لوگ ہیں۔ میری لگائی ہوئی آگ میں صرف بھارتی تسلط کا غرور جل مٹا تھا۔ اس آگ کے شعلے ڈھاکہ نہیں پہنچے تھے۔ ڈھاکہ میں لگائی ہوئی آگ کا مجرم ''گنگا'' کیس کے ملزموں کے جھرمٹ میں شامل نہیں ہے۔ وہ آج بھی

کے بارے میں فحش مذاق کرتا۔ ہمیں اذیتیں دے دے کر اکثر کہا کرتا تھا۔ ''او ئے کشمیریو! ہور
بنو!''۔ اس شخص نے شاہی قلعہ لاہور میں کشمیر، کشمیر کی آزادی اور کشمیریوں کو ایسی ایسی غلیظ گالیاں
ہیں کہ ہماری زبان انہیں دہرانے سے قاصر ہے۔ اس شخص کے رویے کو دیکھ کر میں تو اس نتیجہ پر
ہوں کہ حکومت پاکستان کے اعلیٰ عہدوں کی آڑ میں بھی کچھ بھارتی ایجنٹ چھپے ہیں اور ہمارے خلا
زہریلے پروپیگنڈے کی مہم اور مقدمے کا آغاز انہی خفیہ بھارتی ایجنٹوں کی سرگرمی کا نتیجہ ہے۔

میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ مجھ پر پاکستان میں بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام
جانا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ الزام سن کر میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ میں نے جس نیت اور جذ
سے جو قربانی دی تھی وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ میں اس سرزمین میں اپنی قربانی کا صلہ وصو
کرنے نہیں آیا تھا لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن آئے گا جب شاہی قلعہ لا
میں مجھے مادر زاد ننگا کر دیا جائے گا اور میری ننگی پیٹھ پر ہنٹر برسائے جائیں گے اور میرے گلے
غلاظت کے توبرے آویزاں ہوں گے اور کچھ درندہ صفت سپاہی اس نجاست کو میرا منہ کھول کھول
اس میں زبردستی ٹھونس رہے ہوں گے، حیف! صد حیف! میری زندگی میں ایک ایسا دن بھی آیا کہ
نے پیاس سے تڑپ کر لاہور کے شاہی قلعہ کے یزیدوں سے پانی کے دو گھونٹ مانگے اور انہوں
مجھے پینے کے لیے پیشاب پیش کیا۔ کسی شخص سے حقارت اور نفرت کا اس سے شدید تر اظہار
نہیں۔ میں آسانی سے بھول نہ سکوں گا کہ اس سرزمین میں جس کی بقاء اور مضبوطی کی خاطر میں ا
خون کا آخری قطرہ پیش کرنے کو تیار تھا پینے کے لیے پیشاب ملا۔ اس لمحہ مجھے معلوم نہ ہو رہا تھا کہ
بدنصیبی پر قہقہے لگا کر ہنسوں یا ان گمراہ ظالموں کی کج عقلی کا نوحہ کروں۔ اے فاضل عدالت! میں آ
سے مخاطب ہوں اور بتاتا ہوں کہ لاہور کے قلعہ میں محمد اشرف قریشی ہائی جیکر کے منہ میں نجا
ٹھونسی گئی یہ کیوں ہوا؟ کیا یہ تفتیش کا حصہ تھا؟ کیا اس پاک سرزمین میں تفتیش کا یہ طریقہ رائج ہے؟
یہ میری قربانی کا پھل تھا؟ کیا آزادی حاصل کرنے کی تمنا رکھنے والوں کو یہاں یہ صلہ ملتا ہے؟
بیان کر چکا ہوں کہ یہاں میں اپنی کارگزاری کا صلہ لینے نہیں آیا تھا۔ لیکن میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ
سے یہ کیا کھیل کھیلا گیا ہے؟ یہ مبالغہ نہیں کہ میرے جسم کے ایک ایک حصہ کو چن چن کر شدید سے

کون سی چیز مانع آئی کہ ہماری غیر موجودگی میں انہوں نے اس طیارے پر قبضہ نہیں کرلیا۔ اگر آج یہ عذر پیش کیا جائے کہ یہ لوگ اس حرکت پر عوامی ردِعمل سے خائف تھے تو میں کہوں گا کہ یہ محض ایک عذر لنگ ہے۔ اس ٹولے نے عوامی ردعمل کی تب تو پرواہ نہ کی جب انہوں نے "گنگا" کے مسافروں کو ہم سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے واپس بھارت بھیج دیا۔ ان مسافروں میں بڑے بڑے سیاسی مگرمچھ شامل تھے۔ ہماری نظریں خاص طور پر چند ایسے افراد پر تھیں جو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں اہم عہدوں پر فائز تھے، غداری میں بدنام تھے۔ ہماری نیت یہ ضرور تھی کہ ان قوم فروشوں کو تب تک حراست میں رکھا جائے جب تک کہ بھارت کشمیری حریّت پسندوں کو رہا نہ کردے۔ لیکن میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس اہم مرحلہ پر یحییٰ خان کے ٹولے نے ہمیں دھوکہ دیا۔ اگر ہمیں یہ دھوکہ نہ دیا جاتا اور ان مسافروں کو ہماری مرضی کے بغیر ہماری تحویل سے رہا نہ کردیا جاتا تو مجھے مکمل یقین ہے کہ آج ہمارے بہت سے حریّت پسند ساتھی بھارتی جیلوں سے رہا ہو کر ہمارے ساتھ ہوتے۔ میں نے بارہا سوچا ہے کہ اگر ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوجاتے تو کیا اس صورت میں بھی لوگ ہمارے بھارتی ایجنٹ ہونے کے مجہول الزام کو قبول کرلیتے؟

پاکستان کے سیاسی ماحول میں ایک عرصہ تک پیالے بھر بھر کر ہمارے خلاف زہر انڈیلا جاتا رہا ہے۔ ہمیں "بھارتی ایجنٹ" ثابت کرنے کے لیے عجیب وغریب باتیں نشر کی گئیں۔ اور عجیب وغریب حربے استعمال کئے گئے۔ اس تمام کارروائی کا مقصد پاکستانی عوام کو یقین دلانا تھا کہ جو کچھ بھی نقصان پاکستان کو یحییٰ خان کے اس خبیث ٹولہ نے پہنچایا ہے اس تمام کے ذمہ دار ہم ہیں۔ رائے عامہ کو باور کرانے کی سرتوڑ کوشش کی گئی ہے کہ اگر مشرقی پاکستان میں بغاوت ہوئی تو اس کی وجہ ہم ہیں۔ اگر مشرقی پاکستان میں قتل عام ہوا تو اس کی وجہ ہم ہیں۔ اگر بھارت اور پاکستان میں جنگ ہوئی تو اس کی وجہ بھی ہم ہیں! قصہ مختصر، میرے اور ہاشم کے کارنامے کو یحییٰ خان کی جملہ شرمناک ناکامیوں اور شکستوں پر پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارے خلاف اتنے جھوٹ نشر کئے گئے ہیں کہ میرے لیے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ جواب دینا ناممکن ہے، لیکن میں جھوٹ کے اس پلندے سے ایک شاہکار جھوٹ چنتا ہوں تاکہ میں اس کو خاص طور پر رد کرسکوں۔ یوں تو یہ

قانون کی گرفت سے آزاد ہے۔ اگر میں ایک لمحہ کے لیے فرض بھی کرلوں کہ بھارتی طیارے کو جلانے سے پاکستان کی تباہی کا آغاز ہوا ہے تو اے فاضل عدالت! آپ پر یہ فرض ہے کہ اس وقت کے حکمران ٹولہ کو ہمارے ساتھ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہونے کا حکم صادر کریں۔ یہ اس ٹولے کا ایک کارکن تھا جس نے ہاتھ جوڑ کر ہاشم سے کہا تھا۔ خدا کے واسطے اس طیارے کو آگ لگاؤ تاکہ ہماری جان چھوٹے۔ اے فاضل عدالت! ہمارے پاس تو نہ پٹرول تھا اور نہ ہی ماچس۔ ہمیں تو آگ لگانے کا تمام سامان بھی اس ٹولہ کے وسیلہ ہی سے دستیاب ہوا۔ یہ درست ہے کہ طیارے کے اندر کپڑے میں نے جمع کیے اور پڑول میں نے چھڑکا۔ یہ بھی درست ہے کہ ماچس کی اس تیلی نے بھی جس کی لو سے ''گنگا'' نذرآتش ہوا تھا ہمارے ہاتھ کی حرکت ہی سے شعلہ اُگلا تھا۔ لیکن ہمارے ہاتھ کی یہ نامراد حرکت یحییٰ خان کے ٹولہ کی مرضی کے خلاف نہیں تھی۔ ہمیں اب افسوس ہے کہ ہم نے ان سرکاری کارندوں کی باتوں پر کان دھرا۔ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم اس وقت پاکستان میں نئے نئے وارد ہوئے تھے اور پاکستان کی ہر چیز کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہمیں علم نہ تھا کہ ایئرپورٹ پر متعین پاکستانی پولیس اور فوجی افسروں کی بات مان کر ہم ایک دن ''بھارتی جاسوس'' کہلوائیں گے۔ میں اور میرے ساتھی شیطانوں کے پروپیگنڈے کا شکار ہوئے ہیں۔ ہمارے خلاف طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے رہے ہیں۔ سرگوشیوں اور افواہوں کی مہمات چلا چلا کر عوام کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ ہم جہاز کو جلانے کا منصوبہ بھارت سے ساتھ لے کر آئے تھے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگر ہمارا واقعی شروع ہی سے طیارے کو جلانے کا ارادہ ہوتا تو ہم فوج اور پولیس کے درجنوں افسروں کو طیارے میں کھلے بندوں آنے جانے کی اجازت نہ دیتے۔ ہم غیر مسلح تھے اور ان افسروں کو معلوم تھا کہ ہمارے پاس محض دکھاوے کا اسلحہ ہے۔ میرا ساتھی ہاشم تو اکثر طیارے سے باہر ہی رہتا تھا۔ کم از کم دو مواقع ایسے بھی آئے ہیں کہ طیارے میں ہم دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ یاد رہے کہ طیارے کا دروازہ باہر سے باآسانی کھل جاتا ہے۔ مسلح پولیس کے سیکڑوں کارندے بھارتی طیارے کے گرد حلقہ بنا کر دن رات ڈیوٹی پر کھڑے رہتے۔ اگر یحییٰ خان کے ٹولے کو پی۔ آئی۔ اے کی پروازوں کے منسوخ ہونے کا اتنا ہی خدشہ تھا تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ

کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ پس ہم کو پہلے ہی یہ ہدایت کردی گئی ہوتی ہے کہ لاہور کے ہوائی اڈے پر تمہیں ایک اداس اداس لمبی ناک والا پولیس افسر ملے گا۔ جس سے تم پٹرول ادھار لے لینا اور ایک اور موٹا سا بے ہنگھم انسان جس سے کہ ماچس بطور فارن ایڈ حاصل کرنا۔ اس کے بعد مجہولیت کا نقطہ عروج آتا ہے اور جنوری کی سرد راتوں میں باہر سونے کا مزہ حاصل کرنے کے بعد ہم دو جاسوس ان دو پلسیوں سے طیارہ جلانے کا سامان حاصل کرتے ہیں اور ہنسی خوشی طیارے کو جلا کر بھارت کے خلاف جلوس نکالنے چلے جاتے ہیں۔ مزید ایک اور ڈرامہ یہ بھی ہوتا ہے کہ میں طیارہ جلانے کے دوران سچ مچ کی آگ میں جھلس جاتا ہوں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے دو دن بے ہوش رہتا ہوں۔ یہ ہے وہ قصہ جس کی تشہیر کر کے یحییٰ خان کے ٹولہ نے مجھے اور ہاشم کو پاکستانیوں کی نظر میں ''بھارتی جاسوس'' ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں دکھ ہے کہ پاکستان میں آج بھی کچھ لوگ اس بے ہودہ بات کو ہم پر ایک سنجیدہ الزام سمجھتے ہیں۔ میں اس قصہ میں کس کس عنصر کی مجہولیت کا ذکر کروں۔ کیا واقعی بھارت کو اپنے علاقہ پر سے پاکستانی پروازیں بند کرنے کے لیے کسی بہانہ کی ضرورت تھی۔ جب بھارت نے کشمیر کو اپنا ''اٹوٹ انگ'' بنانے کا اعلان کیا تو اس وقت تو اس کو کسی بہانہ کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ اقوام متحدہ کی قراردادیں موجود تھیں کہ بھارت ایسا کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اپنے ہی علاقے پر سے غیر ملکی پرواز روکنا تو کوئی بڑا کام ہی نہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں تو یہ آئے دن کی واردات ہے۔

فرض کر لیا جائے کہ بھارت کو ایسے بہانے کی ضرورت تھی۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دو کشمیریوں سے اپنا جہاز ہائی جیک کروانے کے علاوہ بھارت کو کوئی معقول بہانہ سوجھ ہی نہ سکا؟ میں کہتا ہوں کہ معمولی سے معمولی ذہانت کا آدمی بھی اس سے بہتر درجنوں بہانے سوچ سکتا ہے۔ ذرا غور تو کیجئے بھارت کے نقطہ نظر کے کشمیریوں سے اپنا ہوائی جہاز ہائی جیک کروانا تو بہانوں میں کوئی معقول بہانہ ہی نہیں۔ ہمارے بارے میں تو بھارت کا بنیادی مطالبہ ہی یہ ہے کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے اور اس حوالے سے ہم بھارت کے شہری ہیں۔ بھلا اگر ہم بھارت کے شہری ہوں اور خود بھارت ہماری شہریت تسلیم کرتا ہو تو پھر دنیا کا کون سا غیر جانبدار ملک ہے جو ہمارے کیے کی

شاہکار جھوٹ نہ صرف جھوٹ ہے بلکہ ایک اچھی خاصی بھاری بھر کم مجہول بات بھی ہے لیکن وائے قسمت کہ اس خالص جھوٹ کو اس چابکدستی کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے کہ ایک عام شہری کو ابھی تک نہ تو اس بات کی مجہولیت اور نہ ہی اس کے جھوٹ ہونے کا احساس ہو سکا ہے۔ الف لیلیٰ کی جو داستان یحییٰ خان کی زبانی بیان کی جاتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ بھارت کو اپنے علاقے پر سے پاکستانی طیاروں کی پروازیں بند کرنے کے لیے ایک بہانہ درکار تھا اور اس بہانے کا موقع بھارت نے خود اپنے خلاف ایک سازش تیار کر کے فراہم کیا۔ یہاں یہ بیان کر دوں کہ سازش کا تصور خاص طور پر الف لیلوی ہے۔ اس عجیب و غریب سازش کے خدوخال بہت دلچسپ ہیں۔ بیان ہوتا ہے کہ ایک طیارے میں بھارت کے چند اہم افسر، چند بوڑھی عورتیں، چند بچے، اور فوجی وردی میں ملبوس سپاہی بٹھا دیئے جاتے ہیں تاکہ پاکستان ان سے فائدہ اٹھا سکے پھر ہاشم کے ہاتھ میں ایک نقلی پستول اور میرے ہاتھ میں ایک نقلی گرنیڈ تھما دیا جاتا ہے۔ پھر جموں سیالکوٹ کی فضا میں ہاشم اور میں طیارے کے پائلٹوں سے بلی چوہے کا ایک ایسا کھیل کھیلتے ہیں جس سے تمام کا تمام طیارہ تباہ ہو سکتا تھا۔ ازراہ تفنن طبع یہ طیارہ وزیر آباد سے لاہور کی جانب جی ٹی روڈ کے اوپر پرواز کرتا ہے اور یہ پرواز اتنی نیچی ہوتی ہے کہ طیارے کے پنکھ درختوں کی چوٹیوں کو چھو کر گزر جاتے ہیں۔ طیارے کی ایئر ہوسٹس دہشت سے نڈھال ہو کر جھوٹ موٹ بے ہوش ہو جاتی ہے تاکہ سواریوں کے لیے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچائیں اور سواریوں میں عورتیں چیخیں مارتی ہیں اور مرد ہوش و حواس گم کر بیٹھتے ہیں کیونکہ انہیں اندرا گاندھی نے بوقت نزع یہی سوانگ رچانے کی ہدایت کر رکھی تھی اور پھر یہ طیارہ لاہور کے ہوائی اڈہ پر اتر جاتا ہے جہاں پروگرام کے مطابق بھارت کے ہم دو جاسوسوں نے اس کو تل کر جلانا ہے لیکن ہمیں یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ لاہور پہنچتے ہی طیارے کو تباہ نہ کر دینا۔ بلکہ پورے اسی گھنٹے انتظار کے بعد یہ "شبھ کام" سرانجام دینا تاکہ اس دوران پاکستان کے محکمہ سراغرساں اور پولیس فوج کے افسر جہاز کی پوری طرح تلاشی لے سکیں۔ ڈاک میں اپنے مطلب کے درجنوں خطوط اور دیگر دستاویزات حاصل کر سکیں۔

چونکہ بھارت غریب ملک ہے اس واسطے وہ اس مشن پر ہم کو ماچس جیسی انمول چیز سپلائی

خلیج وسیع ہو جاتی۔ میں اس عدالت سے پوچھتا ہوں کہ یہ جو ہمارے دشمن ہائی جیکنگ کے ''بہانہ'' ہونے کی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں وہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ اگر بھارت کو پاکستانی پروازیں بند کرنے کے لیے ایک بہانہ ہی کی تلاش تھی تو پھر انہوں نے مشرقی پاکستان میں قتل عام روکنے کا زیادہ منطقی اور مؤثر بہانہ کیوں استعمال نہ کیا؟ بھارت کو کشمیری نوجوانوں سے اپنا طیارہ اغوا کروانے میں اگر ایک فائدہ ہے تو ہزار نقصان تھا۔ بھارت کو بخوبی معلوم ہے کہ کشمیر ایک سویا ہوا جوالامکھی ہے۔ کشمیری نوجوانوں کے ذہن میں مسلح جدوجہد کا خیال متواتر ابھر رہا ہے۔ آج بھی وہ مسلح جدوجہد کی علامتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی پالیسی کی اساس ہی یہ ہے کہ وہاں نوجوانوں کی توجہ مسلح جدوجہد کے خیال پر مرکوز نہ ہونے دی جائے۔ کیا ہمارے دشمنوں کو یہ معلوم نہیں کہ مقبوضہ انتظامیہ جان بوجھ کر ہر حریت پسند لیڈر اور ہیرو کے بارے میں ''بھارتی جاسوس'' ہونے کی افواہیں پھیلاتی ہے؟ مولوی فاروق جیسے پاکستان نواز لیڈر کے لیے بھی ''بھارتی جاسوس'' ہونے کی افواہیں خود بھارتی حکومت نے پھیلائی ہیں۔ ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ صرف اس واسطے کہ کشمیری نوجوان کو مسلح جدوجہد کی علامتیں حاصل نہ ہوسکیں۔ یہ بھارتی سامراج کے مفاد میں ہے کہ ہر حریت پسند جان نثار کے کردار کو خود کشمیری عوام ہی میں مشتبہ بنا دیا جائے۔ بھارتی سامراج کو کشمیر میں یہ جو لمبی رسی مل رہی ہے اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ اس نے مسلح جدوجہد کے خیال کو ابھرنے سے روکنے کے لیے نہایت دوررس نفسیاتی حربے استعمال میں لائے ہوئے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کے اس پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا یہ ایک لمحہ کے لیے بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ بھارت اپنے خزانہ سے خرچ کر کے کشمیری نوجوانوں کے لیے مسلح جدوجہد کی علامتیں فراہم کرے گا؟ میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر بھارت کو سازش کروا کر خود اپنا ہی طیارہ اغوا کرنا تھا تو وہ یہ کام کسی سندھی سے کروالیتا، کسی پنجابی، پٹھان، بلوچی یا بنگالی سے کروالیتا۔ لیکن یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ دکھاوے کی ہائی جیکنگ کے لیے بھی مجھے یا ہاشم کو چنتا۔ مت بھولیے کہ ہم کشمیری نوجوان ہیں۔ آج جبکہ یحییٰ خان کے ٹولہ نے وہ سب کچھ کر دیا جو کہ بھارت کی خواہش تھی یعنی ہمارے حریت پسندانہ کردار کو کشمیری عوام کی نظروں میں مشکوک بنانے کی سرتوڑ کوشش کر دی۔ پھر بھی اس عدالت نے چشم دید گواہوں کی

سزا پاکستان کو دینے کے اقدام کی حمایت کرسکتا تھا؟ کیا اس صورت میں بہانہ بنانے کا مقصد یعنی بین
الاقوامی رائے عامہ کی موافقت، ہی فوت نہ ہوجاتا؟ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ بنیوں کا سازشی ذہن
اس قدر نامستعد ہے کہ وہ سازش کرنے سے پہلے اس موٹی سی بات کو سمجھ نہ سکا۔ میرے پاکستانی
بھائیوں کو چاہیے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے اس معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ میں دعویٰ کرتا ہوں
کہ اگر بھارت کو بہانہ ہی تلاش کرنا تھا تو پھر اس دور کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ایک
ایسا بہانہ آسانی سے دستیاب ہوسکتا تھا جس سے اوّل تو ساری دنیا پاکستانی پروازوں کی منسوخی پر
بھارت کی حمایت کرتی اور دوسرا اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے لیے کسی پی آئی اے کی پرواز کو
بھارتی علاقہ پر سے گزرتے ہوئے روک کر اس کی تلاشی لے لینا اور پھر زیر حراست طیارے سے
جھوٹ موٹ اسلحہ برآمد کرنے کا ڈھونگ رچانا کس قدر آسان تھا۔ یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ محض
اس ڈھونگ کے رچانے سے بھارت کو قانونی جواز فراہم ہوجاتا کہ وہ بین الاقوامی معاہدوں کے عین
مطابق پاکستانی طیاروں کی پرواز روک لے۔ اس صورت میں بھارت کو نہ صرف ایک قانونی جواز
مہیا ہوجاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی خطرناک پروپیگنڈہ لائن بھی اس کے ہاتھ لگ جاتی
بھارت کہہ سکتا تھا کہ پی آئی اے کی یہ اسلحہ برداری دراصل مشرقی پاکستان کے عوام کے قتل عام کے
منصوبے کی ایک کڑی ہے۔ اس صورت میں آکاش وانی کو دن رات یہ پروپیگنڈہ کرنے سے کون
روک سکتا تھا کہ یہ بھارت ہے جس نے مشرقی پاکستان کے عوام کو قتل عام سے بچانے کے لیے
کارروائی کی ہے؟ بین الاقوامی قانون کے مطابق ہر ملک پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ شہری آبادی
کے قتل عام کے تدارک میں کارروائی کرے۔ قتل عام کو روکنے کی بات عالمی رائے عامہ میں آسانی
سے مقبول ہوجاتی۔ یہ اس دور کا ذکر ہے کہ جب پاکستان کے اندرونی حالات بھی اس نوعیت کے
تھے کہ مشرقی پاکستان میں قتل عام کی تیاری کا محض الزام بھی ایک خوفناک سیاسی زلزلے کا پیش خیمہ
بن سکتا تھا۔ یہ اس مرحلہ کا ذکر ہے کہ جب مغربی اور مشرقی پاکستان میں غلط فہمیاں اور کدورت پہلے
سے موجود تھی۔ اور بھارت کے محض مشرقی پاکستانیوں سے دکھاوے کی ہمدردی کے لیے بھی پی آئی
اے کی پروازوں پر پابندی عائد کردینے کا فطری نتیجہ یہ ہوتا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں نفرت کی

میں پیشاب کیا جائے۔

ہمیں ہمارے دوست بتاتے ہیں کہ رائے عامہ کو یحییٰ خاں کے ٹولے نے ہمارے اس قدر خلاف کر دیا تھا کہ بہت سے لوگ ہاشم اور اشرف کے نام سے ہی نفرت کرنے لگ پڑے تھے۔ اے فاضل عدالت! یہ نفرت بھی بڑی عجیب چیز ہے ہم تو یہاں کی پولیس کے ہزاروں کوڑے سہنے کے بعد بھی پاکستان اور پاکستانی عوام پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار تھے اور باہر سڑکوں اور بازاروں میں ہمارے چند ایسے بزرگ اور بھائی تھے جو صرف جھوٹا پروپیگنڈا سن کر ہی ہم سے نفرت کرنے لگ پڑے تھے۔ لیکن یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ماضی میں میرے کسی بھی پاکستانی بھائی نے میرے بارے میں کتنا ہی بُرا خیال کیوں نہ کیا ہو۔ خواہ مجھے ''بھارتی جاسوس ہی کیوں نہ سمجھا ہو۔ میں اسے قصوروار نہیں سمجھتا۔ مجھے اس کا اچھی طرح احساس ہے اگر کسی شخص نے ہمیں ''بھارتی جاسوس'' سمجھا ہے تو یہ صرف جھوٹے پروپیگنڈے کا اثر تھا۔ ریڈیو، سرکاری اعلانات، اخبارات اور نوکر شاہی کی چلائی ہوئی افواہوں کی مہمات، سب ہی میں تو ہمارے خلاف زہر اُگلا ہے اور متواتر اُگلا ہے۔ ہماری اپنی ریاست کا وہ سرکاری مسخرہ قیوم خان بھی تو اپنے گلے میں ڈھول ڈال کر دن رات ہماری ہجویں کہتا پھرتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ ہماری زبانوں کو تالے لگا دیئے گئے تھے۔ اس دور میں تو ہماری صفائی کا ایک لفظ بھی عوام کے کانوں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ مجھے حال ہی میں معلوم ہوا تھا کہ اس تمام زہریلے ماحول کے باوجود بھی اس سرزمین میں کچھ دلیر نوجوان ایسے تھے جو ہمارے خلاف کی گئی گھناؤنی سازش سمجھ گئے تھے اور جنہوں نے بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے خلاف تراشے ہوئے بہتانوں کو رد کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ یاد رکھے گی کہ ہمت کے ان شیروں نے مارشل لاء کے اس کالے دور میں بھی یحییٰ خاں کے غدار ٹولہ کو مخاطب کر کے ان سے پوچھا تھا ''پاکستان میں کشمیری مجاہدوں کے لئے دار و رسن کیوں؟'' مجھے یہ سن کر شدید صدمہ ہوا کہ محض ایک اشتہار چھپوانے کے ''جرم'' میں بہت سے گھروں سے سیکڑوں نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ اے کاش! ان جوانوں پر یہ تشدد نہ کیا جاتا۔ اے کاش! اُن کے حصے کے کوڑے کھانے کا شرف بھی ہم گنہگاروں کو ہی بخش دیا جاتا۔ لیکن اے نصیر وانی، اے صادق قریشی، اے طارق سلیم،

زبانی سن لیا ہے کہ ہمارے کارنامہ کے لوک گیت سری نگر میں عورتیں شادی بیاہ کے موقع پر گاتی ہیں۔ اس فاضل عدالت کو نوٹ کرنا چاہیے کہ یہ ہے اثر ہمارے مسلح جدوجہد کے نشان بن جانے کا۔ جو عورتیں آج ہاشم، اشرف کے گیت شادی بیاہ کے موقع پر گائیں گی وہ کل اپنے نونہالوں کو ہائی جیکنگ کی لوری بھی سنائیں گی۔ اس عدالت نے ایک چشم دید گواہ کی زبانی یہ سن ہی لیا ہے کہ سری نگر میں نوجوان کھلے بندوں اپنے کوٹوں پر ہاشم، اشرف کے نام کے بلے لگا کر پھرتے تھے اور انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلباء ہر دن بھارتی طیارے اغوا کرنے کا عزم بلند آواز سے کر رہے تھے۔ کیا ہمارے دشمن اب بھی کہیں گے کہ گنگا کی ہائی جیکنگ ایک بھارتی سازش تھی؟ کیا بھارتی سازش یہ تھی کہ کشمیر میں اپنے تسلط کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کروا دیا جائے؟ کیا بھارتی سازش یہ تھی کہ خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری جائے۔ پس اے فاضل عدالت! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ بھارتی سازش کی بات خرافات نہیں تو اور کیا ہے؟

اے فاضل عدالت! کیا میں بھارتی جاسوس ہوں؟ اگر میں بھارتی جاسوس ہوں تو کیا وجہ ہے کہ مجھ پر مقدمہ چلانے سے پہلے یحیٰی خاں کے ایجنٹوں نے مجھے طرح طرح کے لالچ دے کر مسلح جدوجہد کے مؤقف سے باز رکھنے کی کوشش کی؟ میں انکشاف کرتا ہوں کہ مجھے باقاعدہ ورغلایا جاتا رہا ہے۔ مجھ سے کہا جاتا تھا "چھوڑو کشمیر کی جنگِ آزادی کی بات، یہ تو پاگلوں کا کام ہے........ تم تعلیم حاصل کرو کوٹھی بنالو شادی کر لو........" مجھے پاکستان میں خوش و خرم زندگی بسر کرنے کے بہت سے سنہرے خواب دکھائے گئے۔ میں نے ان دلالوں سے ہر بار یہ کہا کہ مجھے معاف رکھو۔ میں تو اپنا بسایا گھر چھوڑ کر کشمیر کی آزادی کے لئے جہاد پر نکلا ہوں۔ مجھے ان چکروں میں مت پھنساؤ۔ جب ان لوگوں کو احساس ہو گیا کہ اشرف بکاؤ مال نہیں ہے تو انہوں نے مجھے اپنے مقصد سے روکنے کی بات سوچی کہ مجھ کو ہی "بھارتی جاسوس" ثابت کر دیا جائے۔

یہ ہے حقیقت میرے بھارتی جاسوس ہونے کی۔ اللہ کی شان ہے کہ کشمیر کی آزادی کے بدترین دشمن اس ملک میں عزت اور وقار کے مالک بنے رہے ہیں اور میں گنہگار جو اپنی جان کشمیر کی آزادی کے لئے نثار کرنے کو تیار تھا اس ملک میں جاسوس کہلوایا اور اس قابل سمجھا گیا کہ میرے م

ہتھکڑیوں سے گھسیٹ کر لائے جاتے ہیں۔ ہم تو اس انقلابی تصوّر کے محض چھ مظہر ہیں۔ آپ کے کٹہرے میں اصل ملزم تو انقلاب کی روح ہے۔ آپ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں کہ اس مقدمہ کو ''سیاسی رنگ'' نہ دیا جائے۔ یہ اٹل ہے کہ اس مقدمے کو سیاسی رنگ ملے گا اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ رنگ ہوگا بھی لہو کی سرخی کا۔ اس مقدمے کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ انقلاب کا رنگ ہے۔ یہ ہم ملزموں کے بس کی بات بھی نہیں کہ اس مقدمے کو رنگ ملنے سے روک سکیں۔ جس مقدمے کی اساس ہی سیاست ہو اُسے سیاسی رنگ دینے سے کون روک سکتا ہے؟ میں نے اور ہاشم نے ''گنگا'' کو گلبرک میں کوٹھیاں خریدنے کے لیے اغوا نہیں کیا تھا۔ ہم نے بھارتی مسافروں کو کسی ذاتی عناد کی بناء پر حراست میں نہیں رکھا تھا۔ مقبول بٹ نے کسی ذاتی عناد کی بنیاد پر بھارتی فوجیوں پر گولیاں نہیں چلائی تھیں۔ غلام محمد لون نے خود دادِ عیش دینے کے لیے اپنی دولت کو دونوں ہاتھوں سے نہیں لٹایا تھا۔ میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان نے اپنی آنکھوں کا نور اور راتوں کی نیند دولت جمع کرنے کے لیے صرف نہیں کی تھی۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ یحییٰ خان اور اس کے منحوس ٹولے نے بھی ہمیں کسی ذاتی دشمنی کی بناء پر شاہی قلعے کے تہہ خانوں میں نہیں جکڑا تھا۔ ہمارا مقدمہ تو حق و باطل کی پرانی کشمکش کا ہے۔ یہ انفرادی سطح کی بات نہیں۔ اس نوعیت کے مقدموں میں یوں تو افراد ملزم بنتے ہیں۔ اور گواہ بھی، استغاثہ کے وکیل اور صفائی کے بھی، منصف بھی اور جلاد بھی لیکن حقیقی کشمکش تصورات کے درمیان ہوتی ہے۔ اس مقدمے کو ہی لیجیے جس کی سماعت آپ پچھلے پانچ ماہ سے ہر روز کرتے آ رہے ہیں۔ کیا آپ کو ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا کہ یہاں استغاثہ کی جانب آمریت، حریّت دشمنی اور رجعت پسندی کی طاقتیں کھڑی ہیں۔ اور ملزموں کے کٹہرے میں ایک محکوم قوم کی ہر قیمت پر آزادی حاصل کرنے کی اُمنگ؟ اس ازلی کشمکش کا صحیح مقام میدان کارزار ہے۔ عدالت کے کمرے میں تو یوں بھی یہ کشمکش کچھ بے محل سی نظر آتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ قانون کی کتابوں میں وہ نظائر موجود نہیں ہیں کہ جن کا اطلاق ہونے پر یہ مقدمہ فیصل ہو سکے گا۔ میں نہیں جانتا کہ اس فاضل عدالت کے اراکین کا ذہنی جھکاؤ کس جانب ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے منصفی کے چوغے کے نیچے بھی ایک حریّت پسند شخص کا دل دھڑکتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں کسی گواہ

اے نواز ملک، اے انیس احمد، اے امتیاز حسین، اے رفیق خواجہ، اے چوہدری رفیق خود سن لو اور اپنے دیگر ساتھیوں کو میرا یہ پیام دے دو، تمہاری جراتِ رندانہ نے اس قوم کی لاج رکھ لی ہے۔ تم نے ہم پر ثابت کر دیا کہ ہم جو پیار پاکستان اور پاکستانیوں سے کرتے ہیں بلاوجہ نہیں کرتے۔ یہ تمہارے جیسے لوگ ہی تو ہیں جو ہم کشمیروں کو پاکستانیوں پر پیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ خدا کی قسم تم نے نہ صرف پاکستان کی لاج رکھ لی بلکہ تم نے تو پاکستان سے ہمارے اندھے پیار کی بھی لاج رکھ لی۔ یہ تم جیسے لوگوں کے باعث ہے کہ اب کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ کشمیر کی آزادی کے سپاہیوں پر کوڑے برسائے گئے لیکن اس وسیع و عریض سرزمین سے ایک آواز بھی ان کی حمایت میں بلند نہ ہوئی۔ ہم تاریخ کے سامنے گواہی دیں گے کہ ایسی آواز ضرور بلند ہوئی، یہ آواز کمزور نہ تھی، بلکہ یہ تو پاکستان کے ضمیر کی آواز تھی۔ ہم آزادیٔ کشمیر کے معتوب سپاہی تمہیں سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔

مارشل لاء کا دور ختم ہو چکا ہے۔ آج کا دور بہت مختلف ہے۔ آج میں ایک کھلی عدالت میں کھڑا ہوں۔ آج میں بھی اپنی بات کہہ سکتا ہوں۔ میں پچھلے تمام سال آج کے دن کا انتظار ہی کرتا رہا ہوں۔ آج میں اپنی بات کہہ کر ہی دم لوں گا۔ مجھے یہ توقع نہیں کہ سال بھر میں ہمارے خلاف جو زہر گھولا گیا ہے وہ صرف ایک بیان سے زائل ہو سکے گا۔ لیکن مجھے پاکستانی عوام پر اعتماد ہے مجھے ان کی انصاف پسندی پر بھروسہ ہے۔ میرا ایمان ہے کہ پاکستانی عوام حق شناس اور حق پرست ہیں سچ بات کی شان نرالی ہوتی ہے۔ بیشک ہزار سال جھوٹ بولا جاتا رہے لیکن جب سچ بات میدان میں آتی ہے تو جھوٹ دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ میرا قرآن کہتا ہے جاء الحق و زھق الباطل .... میں نے اپنے دل میں یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے میں جھوٹ کا گلا دبوچ لوں گا۔ میں اس جھوٹ کو نابید کر دوں گا، فنا کر دوں گا، ہلاک کر دوں گا۔

اے فاضل عدالت! میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یوں تو حکومت نے ہمارے مقدمے کا فیصلہ کرنے کا اختیار آپ کے سپرد کیا ہے۔ لیکن دراصل اس مقدمے کا فیصلہ کہیں اور ہوگا........ یہ مقدمہ افراد کے خلاف قائم نہیں کیا گیا۔ اس مقدمے کا اصل ملزم تو ایک غیر مرئی قوت ہے۔ یعنی مسلح جدوجہد کر کے آزادی حاصل کرنے کا تصور۔ ہم چھ افراد جو ہر روز صبح 9 بجے آپ کے سامنے

کہ میں وہ شخص ہوں جس نے لاہور کے قلعہ کے تمام عذاب سہے لیکن اپنی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک ضائع نہ کیا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ مشرقی پاکستان کا سقوط ایک المیہ ہے یا نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا میں اس المیہ کا مجرم ہوں؟

میں بہ بانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میں المیہ کا مجرم نہیں۔ اگر کسی کو اس المیہ کے مجرم کی تلاش کرنی ہو تو اُسے چاہیے کہ اپنی توجہ پاکستان کے حکمران طبقہ کی جانب مبذول کرے۔ یہ اس طبقہ کی مفاد پرست تنگ دلی اور کوتاہ نظری کے باعث ہے کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا ہے۔ میرے اور ہاشم کے ''گنگا'' کو اغوا کرنے اور اسے جلا دینے کا مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔ دراصل ہم نے تو طیارے کے اغوا کا پروگرام وقوعہ سے تین چار ماہ قبل بنایا تھا۔ یہ تو محض ہماری بے سروسامانی تھی کہ ہم اپنے منصوبہ کو اس سے پہلے پورا نہ کر سکے۔ جس وقت ہم ہائی جیکنگ کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے تعلقات میں اس قدر شدید نوعیت کا بحران پیدا ہوگا۔ بھلا خود پاکستان میں کتنے ایسے لوگ موجود ہوں گے جو کہ قبل از وقت حالات کے رخ کا اندازہ کر سکے ہوں گے؟ میں یہ تجویز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کے رجحانات کو فروغ دینے کے محرکات کیا تھے۔ بہر حال شاہی قلعہ کے تجربات نے کچھ بصیرت بخشی ہے۔ میری اپنی مثال لیجیے میں اپنے وطن کے بعد پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھ پر قلعہ میں درندانہ تشدد ڈھایا گیا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ شائد مشرقی پاکستان کے محب الوطن کارکنوں کی امنگوں کو بھی اس بے حسی سے پامال کیا جاتا رہا ہوگا۔ پاکستانی پولیس نے مجھ سے احمقانہ رویہ برتا ہے۔ بہر حال ذاتی سطح پر میں نے ان کو مجھ پر کیا ہوا ظلم معاف کر دیا ہے لیکن اس کا اندازہ صرف مجھے ہی ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنے دل کو کس طرح سمجھایا ہے کہ مجھ پر کوڑے برسانے والے پاکستانی عوام کے صحیح نمائندے نہیں ہیں۔ مجھے اپنے آپ کو بار بار یاد دلانا پڑا کہ میرا تعلق تو پاکستانی عوام سے ہے اور یہ وہ عوام ہے جس کے خود اپنے چوتڑ اس پولیس کے کوڑوں سے سرخ ہیں۔ ممکن ہے کہ مشرقی پاکستان کے محب الوطنوں سے بے حسی اور ظلم اتنا عرصہ روا رکھا گیا ہو کہ ان کا وطن سے محبت کا جذبہ سرد پڑ گیا ہو۔ انسان آخر انسان ہے۔ ظلم

کسی قانونی موشگافی کی ضرورت نہیں۔ پھر ہمارے وکلاء صفائی موجود ہوں یا نہ ہوں ہم جانتے ہیں کہ ایک حریت پسند ہمارے الزام کے بارے میں کیا رویہ رکھے گا۔ لیکن بالفرض محال اگر ہمارے منصفوں کی ذہنیت ایک حریت پسند شخص کی نہیں تو اس صورت میں ہمیں خوب معلوم ہے کہ ہمارا مقام منصور سے مختلف نہیں ہوگا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن کے لیے اپنے تعصبات کے حق میں تاویلات ڈھونڈ لانا مشکل نہیں ہے۔ ہمیں جاسوس قرار دینے کے لیے بہت سی تاویلات ڈھونڈ لائی جاسکتی ہیں۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں کہ ہم تاویلات کے تانے بانے سے اپنا دامن چھڑا سکیں۔ لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ ہمارے مقدمے کا آخری فیصلہ کشمیری اور پاکستانی عوام کے ہاتھ ہے۔ اگر یہ عدالت بری کردے لیکن ہم اپنے عوام کو اپنی حریت پسندی کا یقین دلانے میں کامیاب نہ ہوسکیں تو درحقیقت اس مقدمے میں ہماری فتح نہیں۔ ہمیں حقیقی شکست ہوگی۔ اس طرح یہ عدالت ہمیں لاکھ جاسوس قرار دے لیکن اگر ہماری قربانی دیگر کشمیریوں کے دل میں آزادی کی شمع روشن کرنے میں کامیاب ہوجائے تو یقیناً اس مقدمہ میں حقیقی فتح ہماری ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ اس مقدمہ کا حتمی فیصلہ تاریخ دیگی۔ انصاف کا ترازو آخری بار تاریخ کے ہاتھ ہوگا۔ اردن کے حریت پسندوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یاسر عرفات اور جارج حبش کے بارے میں شاہ حسین اپنی قائم کی ہوئی عدالتوں سے لاکھ بار اسرائیل کا جاسوس ہونے کی سند حاصل کرے۔ اس بات کا فیصلہ کہ کیا یہ لوگ حریت پسند ہیں یا نہیں بالآخر فلسطینی عوام کے ہاتھ میں ہے۔ آزادی کی راہ میں لڑنے والوں پر آخری حکم عدالتیں نہیں تاریخ لگاتی ہے۔

میرا ذہن بار بار اس عظیم الشان جھوٹ کی جانب کھنچ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ جھوٹ جسے دن رات نشر کرکے پاکستانی عوام کے دلوں میں ہمارے لیے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اس عدالت کی وساطت سے پاکستانی عوام کی خدمت میں عرض کردینا چاہتا ہوں کہ خدا کی قسم یہ بات جھوٹ ہے سو فیصد جھوٹ۔ سفید جھوٹ۔ یہ اس نوعیت کا جھوٹ ہے کہ اس میں سچائی کی ایک رمق بھی موجود نہیں ہے۔ بیشک مشرقی پاکستان کا سقوط ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ خود میں نے جس روز اس المیہ کی خبر سنی میں جیل کی دیواروں سے لگ کر گھنٹوں سسکیاں لے لے کر روتا رہا۔ یہاں یہ یاد رہے

عدالت! آج میں اس نامکمل سی بے زبان ڈائری کو آپ کے سامنے اپنا گواہ بنا کر پیش کروں گا۔ پس آپ سے استدعا ہے کہ اس ڈائری کو میرے بیان کا "Annexture "A سمجھا جائے۔

میری اس ڈائری کی تحریریں میرے جذبات کی عکاس ہیں۔ یہ تحریریں میں نے عوام میں نشر کرنے کے لیے نہیں لکھی تھیں۔ کبھی کبھی جب تند و تیز جذبات ایک جھکڑ بن کر میرے دل میں چلتے تھے میری یہ تحریریں ان تناؤ میں اضافہ کا باعث ہوتی تھیں۔ اپنے سینہ میں چھپے ہوئے ان جذبات کو میں آج آپ کے سامنے ظاہر کرتا ہوں۔ "گنگا" کو آگ لگانے کے بارے میں آپ کے اس ملزم نے اپنی ڈائری میں لکھا "یہ آگ ہمارے دلوں میں ہندوستان ہی نے لگائی ہے اور انشاء اللہ ہم عنقریب ہی تمام ہندکو "گنگا کی طرح جلا کر رکھ دیں گے" مزید غور فرمایئے۔ بھارت کے بارے میں اس شخص کی جس کو یحییٰ خان نے بھارتی ایجنٹ کہا ہے، نیت مندرجہ ذیل تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ اب ہند کے آخری دن آ چکے ہیں اور انشاء اللہ ہم بھارت کا نام و نشان تک بھی دنیا سے مٹا دیں گے" اور یہ تحریر بھی مجھ گنہگار کی ہی ہے "خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اپنے عملِ پیہم سے ہم انشاء اللہ ہندوستان کے ناپاک قدموں کو اپنی پاک سرزمین سے اس طرح کاٹ کر رکھ دیں گے کہ تمام سامراجی طاقتیں عبرت لیں گی" اے فاضل عدالت! یہ ہیں خفیہ خیالات اور احساسات اس شخص کے جس کے بارے میں پچھلے کئی ماہ سے متواتر یہ پروپیگنڈہ ہوتا آ رہا ہے کہ وہ بھارتی جاسوس ہے۔ پولیس نے خود میرے ذہن کو آپ کے سامنے برہنہ کیا ہے۔ اصل برہنگی کس کی ہوئی ہے؟ یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔

مجھے آپ کی عدالت کے بنچوں پر بیٹھے بیٹھے بھی کبھی سرینگر یاد آ جاتا ہے۔ میرا وہ محبوب شہر جس کو آزاد کرانے کے لیے میں نے اس سے دوری بھی برداشت کی تھی۔ ہائی جیکنگ سے پہلے ایک کشمیری شعر خاص طور پر میری زبان پر ہوا کرتا تھا۔

کری کُس کاشریا آزاد پنجرس منزٔ ، نالاں چھُک
ژہ پننے پانہ پنہ نن مشکلن آسان پید اکر

اس کے علاوہ بھی اس ڈائری میں آپ کو کچھ اور اشعار ملیں گے جن سے میرے حالات کی

محبت کی قینچی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں کوڑے سہنے کے بعد بھی اس سرزمین اور اس کے عوام سے پ
کرتا ہوں۔

کشمیر پر بھارتی تسلط نے ہر کشمیری کی زندگی پر اثر ڈالا ہے۔ خود میری زندگی میں
واقعات ایسے آئے ہیں کہ اگر میں چاہوں بھی ان کو بھلا نہیں سکتا۔ بھارت سے نفرت کی د
کو تو میں اپنے سینہ پر ایک مستقل نشان کی صورت سے لگائے رکھتا ہوں۔ یہ اس بھارتی سنگین کا نشا
ہے جو کہ ایک بھارتی فوجی نے موئے مبارک کی تحریک کے دنوں میں میرے سینہ میں مجھے ہلاک
کرنے کے لیے پیوست کی تھی۔ بہر حال جس واقعہ سے میرے دل میں اس سے بھی شدید تر نفر
پیدا ہوئی وہ ایک جسمانی نہیں ذہنی چرکہ تھا۔

میں سری نگر کے میڈیکل کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن وہاں مجھ سے کم نمبروں وا
ایک غیر کشمیری ہندو کو مجھ پر فوقیت دی گئی۔ نا انصافی کے اس دھچکہ نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا
کشمیریوں کی اصل حالت تو یہ بن چکی ہے کہ وہ خود اپنے گھر میں اوپرے ہیں۔ اس واقعہ نے مج
غلامی کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔

میں عادتاً کم گو واقع ہوا ہوں۔ میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار اکثر اپنی ڈائر
کے ورق لکھ کر کر دیا کرتا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اپنی ہر ڈائری کو زیادہ سے زیادہ خ
رکھ سکوں۔ ہائی جیکنگ کے بعد اور پاکستان میں قیام کے شروع کے دنوں ہی سے میں نے ای
ڈائری پھر رکھ لی۔ جب بھی مجھے خلوت میسر ہوتی۔ کبھی رات کو سونے سے پہلے کبھی تہجد کی نماز
بعد۔ تو میں چند فقرے اس ڈائری میں لکھ دیا کرتا تھا۔ جس رات پولیس نے مجھے مری میں ''بھار
جاسوس'' کہہ کر گرفتار کیا تو میرے ساتھ میری ڈائری کو بھی قبضہ میں لے لیا گیا۔ مجھے اس پولیس اف
کو میری ڈائری حاصل کرنے کی بیتابی اچھی طرح یاد ہے۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتا لاؤ بتاؤ کہا
ہے تمہاری ڈائری اور میرے سرہانے سے اس ڈائری کو برآمد کر کے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بیچا
شائد وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس خفیہ ڈائری سے یحییٰ خان کو میرے بھارتی ایجنٹ ہونے کا مکمل ثبوت م
جائے گا۔ اس روز سے لے کر اب تک یہ ڈائری پولیس کے قبضہ میں رہی ہے۔ لیکن اے فاض

مارنے ہی میں خوش ہے تو انہیں صلائے عام ہے کہ ایک بار نہیں ہزار بار پتھر ماریں کہ میں پتھروں میں گڑ جاؤں۔ اگر ان کے پتھروں کو اپنے سینہ پر کھا کر میں نہ مسکرایا تو سمجھنا کہ بے وفائی کی۔ میرے پاس بس اب ایک جسم ہی تو ہے جس پر اب جگہ جگہ ان تپتی ہوئی سلاخوں کے نشان ہیں۔ جن سے پاکستانی پولیس لاہور کے شاہی قلعہ میں مجھ پر داغتی رہی ہے۔ مجھے وہ دن نہیں بھولے گا کہ میں ایک ٹرک میں کھڑا ہو کر لاہور کی سڑکوں پر رواں تھا۔ اور اس شہر کے رہنے والے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر مجھ پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ اے فاضل عدالت! لاہور کے شہریوں سے کہہ دو کہ اگر اشرف تمہارے پھول سہہ سکتا ہے تو وہ تمہارے پتھر بھی سہہ لے گا۔ یہ میری نیت نہ تھی کہ اس عدالت سے میں اپنی ایک ایسی خفیہ حرکت کا ذکر کرتا جو میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی کی۔ میری اس حرکت کا علم میرے اور میرے خدا کے سوا اور کسی کو بھی نہیں۔ استغاثہ کو تو اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ لیکن آج میرے سامنے پھانسی کا وہ پھندا ہے جسے قانون ایک "بھارتی ایجنٹ" کے لیے تیار کرے گا۔ اور جس میں میری گردن جکڑ دی جائے گی۔ پھانسی لگنے سے مجھے عار نہیں۔ میں چاہوں گا کہ جاتے جاتے اپنے سینہ کا یہ راز بھی افشاں کرتا ہی جاؤں۔ میرے لیے یہی بدلہ کافی ہوگا کہ ایک دن مجھے سنگسار کرنے والے خود بھی شرمسار ہوں۔ جنوری کی ایک رات کے اندھیرے میں جب میں نے "گنگا" سے اس پاک سرزمین پر قدم رکھا۔ وہ سرزمین جس کو ہم مقبوضہ کشمیر کے نادان لوگ کعبہ کے ہم پلہ سمجھتے ہیں۔ تو میں وفورِ شوق سے پاگل ہو گیا۔ یہ پاگل پن ہی تو تھا کہ یہاں کی خاک کو میں نے اوندھے لیٹ کر یوں چوما جیسے کہ دنیا کی محبوب ترین چیز ہو۔ مجھے پرواہ نہیں کہ وہ ہونٹ جن سے اس خاک کو چومنے کا گناہ سرزد ہوا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے جائیں، مجھے یہ بھی پرواہ نہیں کہ پھانسی کی وہ چوکھاٹ جو ان ہونٹوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساکت کر دے گی، اس چومی ہوئی خاک پر ایستادہ ہوگی۔ مجھے اگر کسی چیز کی فکر ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ مجھ پر پھول اور پتھر برسانے والے میرے محبوب عوام اس وقت میرے قریب نہ ہوں گے۔ جب بر سرِ دار یہ ہونٹ آخری بار جنبش میں آئیں گے۔ مجھے اگر کسی بات کا افسوس ہوگا تو وہ یہ ہے کہ میری آخری آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے گی۔ میں اس فاضل عدالت کے ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ

ستم ظریفی واضح ہو گی۔

بھارت پہ طوفاں بن کر چھاؤں گا
شہید ہو جاؤں گا میں یا غازی بن کے آؤں گا

اور

دشمن سے جو سازش کرے غدارِ وطن ہے
غدار کو تم صفحۂ ہستی سے مٹا دو

مجھ پر "بھارتی ایجنٹ" ہونے کا الزام نہ صرف ظلم ہے بلکہ ستم ظریفی بھی ہے۔ اے فاضل عدالت! میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس الزام کی تردید پھانسی کے خوف سے نہیں کر رہا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے جان پیاری نہیں ہے۔ میرے لیے موت ذرہ بھر دہشت نہیں رکھتی۔ میں نے جس روز سری نگر اپنے ماں باپ کو آخری بار دیکھا تھا۔ اسی روز موت سے مصافحہ کر لیا تھا۔ میں اس عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں پھانسی کے تختہ کی طرف رواں ہوں گا تو میرے دل میں پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے عوام کے بارے میں بے لوث محبت کے وہی جذبات موجود ہوں گے جو کہ کشمیر میں موجود تھے۔ میں پاکستانیوں کو دنیا کی عظیم ترین قوم سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک تو مکہ و مدینہ کے بعد لاہور اور راولپنڈی کی خاک ہی مقدس ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ مجھے اس عوام سے کچھ گلہ بھی ہے۔ مجھے رنج ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہی لوگ جنہوں نے چند روز پہلے مجھ پر گلاب کی پتیوں کی بارش کی تھی، آمریت کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ کاش مجھ سے نفرت کرنے سے پہلے ان لوگوں نے سوچ لیا ہوتا کہ کہیں یہ نفرت مفاد پرستوں نے جان بوجھ کر تو نہیں پھیلائی۔ بہر حال میرے شکوے اپنی جگہ ہیں لیکن میں اس عدالت کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے وطن اور اس سرزمین سے لازوال محبت ہے۔ مجھے میرے پیدا کرنے والے کی قسم اگر آج بھی پاکستانی عوام اس بات ہی میں خوش ہوں کہ مجھ گنہگار کو سنگسار کر دیا جائے تو اشرف کا جسم و جان ان کے پتھروں کے لیے حاضر ہے۔ اے فاضل عدالت! اپنے اس ملزم کا پیام لاہور کے شہریوں تک پہنچا دو کہ اگر ان کا دل مجھے پتھر

ہم کفر کو مٹائیں تو جاسوس ہیں

ڈاکٹر فاروق حیدر

ہم کفر کو مٹائیں تو جاسوس ہیں
جان پر کھیل جائیں تو جاسوس ہیں

تم پیالے بھرو تو محبِّ وطن
خون ہم جو بہائیں تو جاسوس ہیں

تم گھروں کو بھرو تو محبِّ وطن
ہم گھروں کو لٹائیں تو جاسوس ہیں

تم لہو جو پیو تو محبِّ وطن
ہم جو نعرہ لگائیں تو جاسوس ہیں

تم محبِّ وطن تاشقند میں بنو
ہم جو "گنگا" اڑائیں تو جاسوس ہیں

تم جو عدو سے پٹو تو محبِّ وطن
ہم عدو کو مٹائیں تو جاسوس ہیں

تم جو ناچو برہنہ، تو ناچو کہ ہم
دار پر جھول جائیں تو جاسوس ہیں

جس سپر کو تو ی کے پرے ڈال دو
وہ اگر ہم اٹھائیں تو جاسوس ہیں

جس گہر کو سمندر میں تم پھینک دو
ہم اگر ڈھونڈ لائیں تو جاسوس ہیں

جس اجل سے تم آنکھیں چراتے رہے
اُس سے آنکھیں ملائیں تو جاسوس ہیں

جس کو چھو کے سبھی سرخرو ہو گئے
اس کو ہم جو اٹھائیں تو جاسوس ہیں

تم جو پدما جلاؤ تو بالکل صحیح!
ہم جو "گنگا" جلائیں تو جاسوس ہیں

پھانسی لگنے سے پہلے میری زبان سے یہ دو نعرے جاری ہوں گے۔ ''آزادی کشمیر۔۔زندہ باد'' ''پاکستان ۔۔پائندہ باد'' میں وصیت کرتا ہوں کہ اگر بالفرض محال خدانخواستہ وقت نزع میرے ہونٹوں سے یہ دو نعرے جاری نہ ہو سکے تو پھر میری دانست میں یہ ہونٹ اس قابل نہیں کہ انہیں آزادی کے ایک مجاہد کا دفن نصیب ہو۔اس صورت میں میری آخری خواہش ہوگی کہ جلاد کو حکم ہو کہ وہ کسی تیز دھار خنجر سے ان ہونٹوں کو میرے جسم سے کاٹ کر علیحدہ کر دے تاکہ میرا باقی ماندہ جسم اس آلودگی سے پاک اپنے خالق کی بارگاہ میں پہنچے۔میں وصیت کرتا ہوں کہ میری اس خواہش پر سختی سے عمل کیا جائے۔

مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ پاکستانی عوام کے ذہن میں ہاشم اور میں کشمیری عوام کی مسلح جدوجہد کے عزم کی علامت بن کر ابھرے تھے۔میری روح کو اصل اضطراب یہ ہے کہ ہمارے پھانسی لگ جانے سے کشمیری عوام کے عزم کی یہ ابھرتی ہوئی علامت دھندلا جائے گی۔یہ احساس میرے لیے درجنوں پھانسیوں کی اذیت سے بڑھ کر ہے۔میں تو یہ کہوں گا کہ یہ بذات خود جہنم کا عذاب ہے۔کاش میں اس ابھرتی ہوئی علامت کو دھندلانے سے کسی طور پر بچا سکتا۔میری مجبوریاں سب پر عیاں ہیں، بہرحال میں اس فاضل عدالت سے آخری استدعا یہ کروں گا کہ پھانسی لگنے کے بعد میری قبر پر کسی سخت پتھر سے تراشا ہوا یہ کتبہ نصب کیا جائے

''یہاں اشرف قریشی دفن ہے جو پھانسی کے تختہ پر آخری سانس
آنے تک کہتا رہا کہ وہ کشمیر کی آزادی کا سپاہی ہے''

ہ

محمد اشرف قریشی

موسمِ جبر و اختیار آیا   پھر پیامِ صلیب و دار آیا
کس قدر وضع دار ہے قاتل   شمع لے کر سرِ مزار آیا

(نذیر انجم)

کام کرنے پا آمادگی ظاہر کی۔ پشاور میں مختصر قیام کے بعد ہاشم واپس سری نگر چلا گیا۔ اور وہاں NLF کا قیام عمل میں لایا۔ کچھ عرصہ بعد وہ جنگ بندی لائن عبور کر کے پھر پاکستان آگیا اور خواہش ظاہر کی کہ اسے تحریک آزادی کشمیر کے لیے کوئی اہم مشن سونپا جائے چنانچہ طے پایا کہ بھارت کا کوئی مسافر بردار طیارہ اغواء کیا جائے اور پھر اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے آواز بلند کی جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر فاروق حیدر کے برادر نسبتی جمشید منٹو نے ہاشم کو ہوائی جہاز اغوا کرنے کی تربیت دی۔ تربیت کے بعد ہاشم کو ضروری ساز وسامان دے کر جنگ بندی لائن کے راستے واپس بھیج دیا گیا۔ لیکن سرحد عبور کرتے ہی ہاشم قریشی کو بھارتی سیکورٹی فورس نے گرفتار کرلیا۔

کچھ عرصہ گرفتاری کے بعد رہائی پانے پر ہاشم قریشی نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری شروع کردی۔ چنانچہ اس نے اپنے کزن محمد اشرف قریشی کو اس منصوبے میں شامل کرتے ہوئے 30 جنوری 1971 کو سری نگر سے براستہ جموں دہلی جانے والے ایک فوکر طیارے ”گنگا“ کو اغواء کرلیا اور اسے دہلی کے بجائے لاہور کے ہوائی اڈے پر اتار لیا۔ اس وقت ہاشم کی عمر 16 سال اور چند ماہ تھی۔

گنگا طیارے کے اغواء کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر پوری دنیا میں نمایاں ہوا۔ اور تحریک آزادی کشمیر کی کامیابی کے لیے زبردست ماحول پیدا ہوا۔ محاذ رائے شماری اور NLF کے قائدین کو پاکستانی اور غیر ملکی میڈیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہائی جیکروں کو زبردست عوامی پذیرائی ملی۔ اس صورت حال سے گھبرا کر فوجی آمر یحییٰ خان اور اس کے حواری بوکھلا اٹھے چنانچہ تحریک آزادیء کشمیر کو کچلنے کے لیے محاذ رائے شماری کے قائدین وکارکنان اور ہاشم قریشی و اشرف قریشی کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمات قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

چنانچہ ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کو 14 اپریل 1971 کو تانڈہ ڈیم ریسٹ ہاؤس سے رات بارہ بجے پولیس کی بھاری جمعیت نے چھاپہ مار کر گرفتار کرلیا۔ ہاشم قریشی کو ساڑھے نو برس تک پاکستان کے مختلف عقوبت خانوں میں ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ ہاشم قریشی کو بھارتی طیارہ اغواء کرنے کے جرم میں یحییٰ خان کی خصوصی عدالت نے 19 سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی۔ اس سزا

ہاشم قریشی

محمد ہاشم قریشی یکم اکتوبر 1953ء کو سری نگر کے محلہ نوہٹہ میں محمد خلیل قریشی کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آس پاس ہم وطنوں کو بھارتی جبر و استبداد کے خلاف نبرد آزما دیکھا۔ کرفیو، گولی، لاٹھی اور پتھراؤ کے ماحول میں ہاشم قریشی بھی لرزتی ٹانگوں اور کپکپاتے ہاتھوں سے حصہ لینے لگا۔ جیسے جیسے بھارتی مظالم بڑھتے چلے گئے ہاشم قریشی کا جذبہء بغاوت بھی توانا ہوتا چلا گیا۔ چودہ برس کی عمر میں ہاشم قریشی کو بھارتی افواج پر پتھراؤ کے الزام میں سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جس سے ہاشم زخمی ہو گیا۔ ہاشم کی ٹانگ پر لگنے والا یہ زخم اس کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑ گیا۔ یہ زخم ہاشم قریشی کے لیے بھارت مخالف تحریک کا سنگِ میل ثابت ہوا۔

ہاشم قریشی کے لڑکپن کا زمانہ کشمیر میں سیاسی کشمکش اور افراتفری کا زمانہ تھا، ہاشم قریشی پولیٹیکل کانفرنس کے راہنما غلام محی الدین قرہ کی شخصیت اور جدوجہد سے بہت متاثر ہوا اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ ہاشم قریشی نے لڑکپن کے زمانے میں بھارتی ظلم و ستم کے کئی دردناک واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے جس کے نتیجے میں اس کے دل و دماغ میں بھارت کے خلاف شدید آگ بھڑک اُٹھی اور اس نے یہ عزم کر لیا کہ وہ اپنے وطن جموں کشمیر سے بھارت کا ناجائز قبضہ ختم کر کے دم لے گا۔ اب وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

1969ء میں ہاشم قریشی اپنی بہن کی شادی کے سلسلے میں سری نگر سے پشاور آیا تو یہاں اس کی ملاقات این ایل ایف کے راہنماؤں مقبول بٹ اور امان اللہ خان سے ہوئی۔ چنانچہ ان راہنماؤں کی تحریک پر ہاشم قریشی NLF میں شامل ہو گیا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر واپس جا کر تنظیم کی خاطر

داروں کو نہ دیکھا۔ ان کی بیوی زیب النساء نے نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اپنے خاوند کا ساتھ نبھایا ہے۔ ضعیف العمر باپ سے ہاشم کی ملاقات 30 سال بعد ہوئی۔

ہالینڈ میں قیام کے دوران ہاشم قریشی نے مسلح جدوجہد کا نظریہ ترک کر دیا۔ اور پُر امن جدوجہد کے لیے ایک نئی جماعت قائم کی جس کا نام "جموں کشمیر ڈیموکریٹک لبریشن پارٹی" JKDLP رکھا۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد کو انہوں نے اپنی تصنیف "کشمیر امن کی تلاش" مطبوعہ لاہور 1995 میں تفصیل سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ہاشم قریشی کے وکیل نامور پاکستانی دانشور عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ نے لکھا ہے۔ وہ ہاشم قریشی کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہ پاکستانی نہیں کہ وہ ریاست جموں کشمیر میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھارت کا شہری نہیں سمجھتا کہ وہ ریاست پر بھارتی قبضہ کو غاصبانہ قرار دیتا ہے۔ وہ خود کو جموں کشمیر کا باشندہ سمجھتا ہے۔ ایک ایسا دعویٰ جو نہ پاکستان تسلیم کرتا ہے۔ اور نہ بھارت۔۔۔
>
> ہاشم قریشی اس یرغمالی کیفیت سے خود بھی آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اور پورے جموں کشمیر کے عوام کو بھی آزاد کرانا چاہتا ہے۔"

عین عالم شباب میں عزم و ہمت اور جرأت و استقلال کا متوالہ ہاشم قریشی پاکستان میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے اور مجموعی طور پر 30 سالہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد اب کافی حد تک بدل چکا ہے۔ اب ہاشم قریشی، مسلح جدوجہد، بندوق، اور تشدد کے راستے کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ آزادی کی خاطر پُر امن، جمہوری، عوامی احتجاج اور سول نافرمانی کے راستے پر چلتے ہوئے کشمیر میں تبدیلی لانا چاہتا ہے۔

ہاشم قریشی نے ہالینڈ سے جلاوطنی ختم کرتے ہوئے واپس اپنے وطن لوٹنے پر قوم کے نام جو پیغام جاری کیا تھا وہ اس کی سوچ و فکر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "میں کسی کا بھی دشمن نہیں نہ ہی کسی کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں سوائے

پر انھیں سپیشل کورٹ میں اپیل کا حق نہ دیا گیا۔ احتجاجاً انھوں نے اپیل کا حق مانگا تو ساڑھے چھ سال بعد انھیں یہ حق دیا گیا۔ 1980ء میں سات سال بعد سپریم کورٹ میں عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ نے ہاشم کی اپیل دائر کی تو فل بینچ نے انھیں رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

جیل سے رہائی کے بعد ہاشم نے ایک کشمیری فیملی میں شادی کر لی۔ ان کا بیٹا جنید تم سال کا ہوا تو پاکستانی حکام نے اُسے پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ حکام کا موقف تھا کہ جنید ہندوستانی شہری ہے نہ کہ پاکستانی شہری۔ اس رویّے سے مایوس ہو کر احتجاجاً ہاشم قریشی نے ہالینڈ ہجرت کی اور وہاں کی شہریت حاصل کر لی۔

ہاشم قریشی نے 1980ء میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اور تنظیم کمیٹی کے چیئرمین اور چیف آرگنائزر کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ تنظیم 29 مئی 1977ء کو برطانیہ میں قائم کی گئی تھی۔ جس کے مرکزی صدر عبدالجبار بٹ اور سیکرٹری جنرل امان اللہ خان تھے۔

28 دسمبر 2000ء کو لگ بھگ تیس سالہ جلاوطنی کے بعد ہاشم قریشی نے اپنے وطن عز واپس آنے کا فیصلہ کرتے ہوئے۔ ایمسٹرڈیم ہالینڈ سے ہوائی سفر اختیار کیا۔ ان کے پاس نیپال ویزہ تھا۔ جہاز نئی دہلی ایئرپورٹ پر اترا تو ہاشم قریشی بھی یہاں اتر گئے۔ اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے اپنے آپ کو ہندوستانی حکام کے حوالے کر دیا۔ حکام نے انھیں گرفتار کر کے تہاڑ جیل بھیج دیا۔ ہاشم قریشی کی ہندوستان آمد اور گرفتاری کی خبریں دنیا بھر میں اخبارات کی زینت بنیں۔

چند روزہ عدالتی چارہ جوئی کے بعد 12 جنوری کو ہاشم قریشی کو ایک خصوصی پرواز کے ذریعے سری نگر پہنچا دیا گیا۔ سری نگر ایئرپورٹ پر اترتے ہی ہاشم کو ریاستی پولیس نے گرفتار کر لیا۔ ایک سال تک کشمیر گورنمنٹ نے ہاشم قریشی کو ہری نواس جیل میں گرفتار رکھا۔ ہاشم قریشی نے اپنے مقدمے کی پیروی کی۔ دسمبر 2001ء میں ہاشم کو رہا کر دیا گیا۔

ہاشم قریشی کو کشمیر کی جدوجہدِ آزادی میں بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لگ بھگ 30 برس تک اپنے خاندان اور عزیز و اقارب سے کٹے رہے۔ ان کی والدہ اس وقت انتقال کر گئیں جب وہ پاکستان میں قید تھے۔ انھوں نے ہالینڈ میں جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ بچوں نے اپنے

لوگوں نے تمہارے ساتھ دکھ بانٹے اور نہ ہی پوری ریاست کے لیے آپ کے ساتھ آزادی کی جدوجہد کی البتہ ان میں سے اکثر نے وادی میں موت کا کسی نہ کسی طرح فائدہ ہی اٹھایا، اس لیے اپنے سوچ کو بدلو اور جموں کشمیر کی پوری ریاست کو اور یہاں پر سب بسنے والوں، نسلوں، مذہبوں اور ذاتوں کو جموں کشمیر کا وارث سمجھو اور مانو اور جب تک سبھوں کو ساتھ لے کر نہیں چلو گے کسی بھی قسم کی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو نگے۔آزاد کشمیر (POK) میں خودمختار کشمیر کے خواب دیکھنے والوں کے گوش گزار یہ تلخ حقیقت کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک تم سب قومی آزادی والے متحد ہو کر POK اور گلگت و بلتستان پر قابض قوت کے خلاف جدوجہد نہیں کرو گے، ہندوستان کے خلاف وادی کی جدوجہد کامیاب نہیں ہوگی اور نہ ہی جموں اور ولداخ کے لوگ قومی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو نگے اور موجودہ جدوجہد کا آخری انجام زیادہ بھیانک المیہ کی صورت میں یعنی کشمیر کے مستقبل اور مزید ٹکڑوں پر منتج ہوگا............

میں آخر میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ میں کسی بھی مذہب کے ماننے والوں نے دوسرے مذہب کو ختم نہیں کیا، بے شمار جنگیں مذہب کے نام پر بھی ہوئیں، صرف مذہب کے نام پر اس دنیا میں انسانوں کا بہت خون بہایا گیا مگر کوئی بھی مذہب دنیا سے ختم نہ ہو سکا۔انسان کو اس کی پیدائش پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ہندو، مسلمان، عیسائی یا سکھ اپنے ماں باپ کا مذہب اختیار کر لیتا ہے، اس لیے تمام مذاہبوں کا احترام کرنا چاہیے اور طاقت اور بندوق سے دوسرے مذاہب کے لوگوں پر حاوی ہونے کے بجائے دلائل کے ساتھ مذہبی، کلچرل اور سیاسی و سوشل سوچ کو بدلنے کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ آج کل دنیا میں مسلمان "انتہا

ان کے جو میری قوم کی بربادی کے خواہاں ہیں، جو جموں و کشمیر کو اپنی راحت اور چند روزہ عیش و عشرت کے لیے ٹکڑوں میں بانٹنے پر تلے ہوئے ہیں، جو تاریخ کی منطق کو سمجھنے سے عاری ہیں یا پھر ان کی آنکھوں پر خود غرضی کی چربی چڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب دوٹوک اور واضح مطالبات کی جگہ ''کوئی نہ کوئی حل نکل آئے'' کا راگ آلاپ رہے ہیں، جو اپنی چند روزہ زندگی میں کسی نہ کسی لولے لنگڑے حال کے لیے مرے جا رہے ہیں۔ چاہئے اس کے لیے ہماری قومی اور وطنی وحدت پارہ پارہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ باقی میں ڈیموکریٹ ہوں اور ان تمام آزادیوں کا پاسدار ہوں جو جمہوریت کی روح ہیں۔ میں دباؤ، دھونس اور زور کی بنیاد پر کسی بھی طرح کے سیاسی عقائد مسلط کرنے کے خلاف ہوں، نہ ہی میں اپنے ساتھ سیاسی اختلاف رکھنے والے کسی بھی فرد یا ادارے کو اچھوت سمجھتا ہوں۔ میں ذاتی تعلقات اور سیاسی اختلافات کے فرق کو بخوبی محسوس کرتا ہوں اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے لیے ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھتا ہوں۔

میں بندے پر بندوق کے حقوق کے حوالے سے بہت ہی حساس ہوں اور اس ضمن میں خدا کے غضب سے ڈرتا ہوں۔ میرے نزدیک بھوکوں کو روٹی کھلانا، یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا، بیواؤں اور معذوروں کی دل جوئی کرنا سب سے بڑی عبادت ہے۔

یہی ہے عبادت، یہی اصلِ ایماں!
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

.............وادی کشمیر کے تمام لوگوں سے استدعا کرونگا کہ صرف اپنے آپ کو کشمیری نہ سمجھو، اس سوچ نے وادی کے رہنے والوں کو ان گیارہ سالوں میں اکیلا کر لیا، نہ تو نام نہاد آزاد کشمیر نہ جموں و لداخ اور نہ گلگت بلتستان کے

عدالتی بیان

''گنگا.........''

آمریت اور سامراج!

دونوں لرز اُٹھے۔

30, جنوری 1971 کو میں ''گنگا'' طیارے کی وساطت سے پاکستان پہنچا۔ اپنی دانست میں میں نے تاریکی کو پھاند کر اُجالوں میں قدم رکھا تھا لیکن یہ اُجالے مجھے راس نہ آئے۔ میں آج بھی اس ملک کی اندھیری راہوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ میں نے اپنے وطن پر مسلط تاریکی کے خلاف جنگ کرنے کا عزم کیا تھا لیکن جن امیدوں کا سہارا لے کر میں نے بھارتی سامراج سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی وہی امیدیں میرے مستقبل کا مدفن بن گئیں۔ آخر کیوں؟ میں نے بھارت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ بغاوت کرنا غلاموں کا پیدائشی حق ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ بھارت سے بغاوت کر کے میں نے ہر پاکستانی مرد و عورت کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔ میں نے بھارتی طیارے کے سکھ پائلٹ کو جموں سے وزیر آباد کی طرف رخ موڑنے پر مجبور اس لیے کیا تھا کہ یہ میرا ایمان تھا کہ اِس سمت کشمیر کی آزادی کا سب سے بڑا ہمدرد ملک واقع ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس ملک میں مجھ پر ایک دن بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا جائے گا اور مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا۔ بھارتی طیارہ اغوا کرتے ہوئے اشرف قریشی اور میں خوش تھے کہ ہم کشمیر کی جنگِ آزادی کے لیے شاید بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوں۔ اب میں اس وقت کو بھولنا بھی چاہوں تو نہیں بھول سکتا جب ہم نے ''گنگا'' کی شکل میں ایک بہت بڑی طاغوتی طاقت کا غرور بھسم کر دیا تھا اور اس

پسند" اور "دہشت گرد" کے نام سے بدنام ہو رہے ہیں، کیا اس سے اسلام جیسے پر امن مذہب کی کوئی خدمت ہوتی ہے؟ بلکہ ایسے لوگوں کے اعمال سے دوسرے لوگ اسلام کے مطالعہ سے انکاری ہو جاتے ہیں اور پھر دوسرے مذاہب کا احترام کرنا ہی انسانیت کی معراج ہے اور سنت رسول ﷺ بھی ہیں۔"

(ہاشم قریشی کا قوم کے نام پیغام، صفحہ 4 تا 7)

زخم دیکھیں کہ در و بام کے منظر دیکھیں
شوقِ نظارہ میں آنکھیں بھی لٹا بیٹھے ہیں
ہاتھ امیدوں کا مقتل ہیں اور آنکھیں مدفن
وہ لہو اپنا ہی تھا جس میں نہا بیٹھے ہیں

(جوہر میر)

فوجیوں پر پتھراؤ کیا تھا؟ میں نے اسے جو جواب دیا اُس نے مجسٹریٹ کو پریشان کر دیا، کیونکہ اُسے اِس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میرے بھائیو! میں نے اسے وہی کہا جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ وہ یہ کہ ''پتھر میں نے ہی پھینکے ہیں اور مجھے جب بھی موقع ملا میں اِن ہندو سپاہیوں پر پتھراؤ کرتا رہوں گا۔'' میرا جواب سُن کر بہت ممکن ہے کہ مجھے سخت ترین سزا دی جاتی لیکن سزا دینے والا بھی اتفاق سے مسلمان تھا، اس کے سینے میں بھی ایک کلمہ گو کا دل دھڑکتا تھا، ہوسکتا ہے اس کا ذہن بھی آزادی کے جذبات سے سرشار ہو۔ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کرنے والا ہے وہ کرنا نہیں چاہتا لیکن غلامی اور مجبوری انسان کو بے بس کر دیتی ہے اور خواہش کے خلاف فیصلے بھی کرواتی ہے۔

مجسٹریٹ اپنی کرسی سے اٹھا اور میرے کان پکڑ کر جذبات سے بھرپور آواز میں کہا کہ دیکھو اپنی تعلیم جاری رکھو، اور جب کسی قابل ہو جاؤ گے پھر ملک کی خدمت کرنے کے بڑے مواقع ملیں گے۔ اس نے مجھے صرف دو روپیہ جرمانہ کی سزا دی۔ لیکن بھارتی فوجی کے دیے ہوئے زخم پر میرے بزرگوں کو کافی روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ اس دوران دل کے زخم کے ساتھ ٹانگ کا زخم بھی بہت گہرا ہو گیا جس کا نشان آج بھی بھارتی بربریت کی یاد دلاتا ہے اور یہی یاد مجھے بھارت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔

1967ء میں سری نگر سٹیڈیم کے باہر بھارتی فوجیوں نے کشمیری مسلمانوں پر سٹین گنوں سے حملہ کر دیا' ایک نوجوان شہید ہو گیا جو انجینئرنگ یونیورسٹی میں آخری سال کا طالب علم تھا۔ ماں باپ کا ایک ہی بیٹا، پانچ بہنوں کا ایک ہی بھائی تھا۔ اس کی لاش نے ماحول کو تڑپا کے رکھ دیا........ اور وہ لاش خاموش تھی تو اس کے عزیز و اقارب بھی خاموش ہو گئے۔ کشمیری مسلمان جو وہاں تھے، وہ بھی خاموش ہو گئے۔ مگر اس خاموشی میں بھی ایک احتجاج تھا، ایک سرگوشی........ اور وہ سرگوشی اسلامیانِ کشمیر کے کانوں میں گونجنے لگی۔ بغاوت، بھرپور بغاوت۔ جدوجہد، مسلح جدوجہد۔ پھر ہم نوجوانوں کی سوچ اس نہج پر پہنچ گئی کہ جب تک ہم بھارتیوں کو کشمیر سے نہیں نکالتے ہمارے بزرگوں کے چہروں کی جھرّیاں گہری ہوتی جائیں گی۔ ہماری ماؤں کی آنکھوں میں آنسو پلتے رہیں گے۔ ہماری بہنوں کے دوپٹے سروں سے سرکتے رہیں گے اور ان کے نوجوان بھائی اسی طرح

کی لاش اپنے قدموں تلے روند ڈالی تھی ۔ یہ تھا کشمیر کی نئی نسل کا پیغام ان لوگوں کے نام جو کشمیری عوام کو بزدلی کے طعنہ دینے میں کبھی چوکتے نہیں تھے۔ ''کشمیری قوم بزدل ہے''۔ یہ فقرہ آپ کی طرح ہم نے بھی ہزاروں بار سُنا اور بزدلی کے اس طعنہ نے میرے سینے میں ایسی چنگاریاں بھر دیں کہ میری روح اس الزام کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے بے قرار ہوگئی۔ بزدلی کے اس داغ کو اپنی قوم کی پیشانی سے دھونے کے لیے میں نے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک انقلابی فیصلہ کیا۔ کب اور کس طرح کیا اور اس فیصلہ میں بھارت کے ظلم وستم کا کتنا ہاتھ ہے۔ اس کی چند جھلکیاں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

میرا بچپن:

میری بچپن سے ہی یہ عادت رہی ہے کہ میں درگاہ شریف حضرت بل نماز کے لیے جایا کرتا تھا۔ سات آٹھ سال ادھر کی بات ہے کہ میری آنکھیں اپنی قوم کے جیالوں کو حضرت بل کے مقام پر بھارتی فوجیوں سے نبرد آزما ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ میں اور تو کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن بھارتی فوجیوں پر ان کی گولیوں کے جواب میں پتھر مارنے میں پیش پیش تھا، مگر گولی اور پتھر کا کیا مقابلہ۔ جیسے جیسے گولیاں چلنے میں تیزی آتی گئی۔ اسی رفتار سے میرے سینے میں بھارت کے خلاف بغاوت کے جراثیم بڑھتے گئے اور پھر اچانک بہت سی فوج آگئی۔ میری عمر اس وقت کوئی ایسی زیادہ نہ تھی، لیکن ایک جذبے نے مجھے مجبور کیا کہ میں لوگوں کو گولیوں کی زد سے نکلنے کے لیے کہوں اور لوگ میرے کہنے کے مطابق باغ میں چلے گئے۔ وہاں ساتھ ہی ایک چھوٹی مسجد تھی، ہم سب لوگ مسجد میں داخل ہوئے اور پھر فضا صاف ہوگئی تو ایک ایک کرکے تمام لوگ مسجد سے باہر نکل آئے۔ سب سے آخر میں میں بھی مسجد سے باہر آیا تو ایک گورکھا سپاہی نے مجھے اتنا مارا کہ میں زخمی ہوگیا اور میرے زخموں سے خون بہنے لگا۔ اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ ''یہی ہے''۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا، ویسے بھی میرا دھیان ٹانگ کے زخم کی طرف تھا۔ جہاں سے خون بہہ رہا تھا اور ساتھ ہی مجھے گرفتار کرلیا گیا، دوسرے دن ضمانت پر مجھے رہائی ملی۔

کچھ عرصہ بعد مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے مجھے پوچھا کہ تم نے

آنسو بہانے کے کچھ نہ کر سکا۔ سب کو روتے دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے اور پھر چیخ چیخ کر میں نے آسمان سر پر اٹھالیا اور بس ڈرائیور سے کہا کہ بس چلاؤ اور ان ظالموں کو پکڑو جنہوں نے ہماری ایک بہن کی یہ حالت کر دی ہے ۔مگر ڈرائیور نے ان ظالموں کا پیچھا کرنے سے انکار کر دیا اور کچھ عرصہ بعد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ ڈرائیور نے کیوں میری بات نہیں مانی تھی اس لیے کہ ان ظالموں کے پیچھے بہت بڑی سامراجی طاقت ہے جس کا مقابلہ اس ڈرائیور کے بس میں نہ تھا اور پھر میرے دل میں بھارت کے خلاف نفرت کا لاوہ اُبل پڑا اور دل میں عہد کر لیا کہ میں جب اور جہاں بھی مجھے موقع ملا، بھارتی جن کا اس وقت تک پیچھا کروں گا جب تک اسے نیست و نابود نہ کر دوں اور اس کے ناپاک قدم اپنی پاک زمین سے نکال باہر نہ کر دوں۔

پولیس کا حملہ:

اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وقت نے ساتھ دیا، قدرت نے راہنمائی کی اور ہم اپنے دشمن بھارت کا غرور اٹھا کر اپنے دوستوں کے پاس لے آئے۔ دوستوں میں پہنچ کر ہمیں ایک روحانی مسرت محسوس ہوئی اور ہم نے ان کے سامنے بھارت کے غرور کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے، کسی انعام کی غرض سے نہیں بلکہ اپنی قوم کی پیشانی سے بزدلی کا داغ دھونے کی غرض سے اور اپنے بھائیوں کو آزادی کی منزل دکھانے کی غرض سے ۔ ویسے اس غرور کو لاش میں تبدیل کرنے کے لئے ہماری مدد کس نے کی، یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی۔

ہمارے دوستوں نے ہماری پذیرائی جس ذوق شوق سے کی اس سے ہمارے حوصلے بلند ہوئے۔ ہمارے سری نگر سے آنے کے بعد ہمارے عزیزوں پر بھارت کا قہر کی صورت میں نازل ہونا متوقع تھا۔ ہم اپنی کامیابی کی خوشی میں اس غم کو بھی بھول چکے تھے۔ لیکن دفعتاً ہم پر یحییٰ خان کے ٹولہ نے بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام عائد کر دیا، میں اس حکومت میں اپنی گرفتاری کے دوران آپ بیتی کو قلم بند کر رہا ہوں۔

میری اور اشرف قریشی کی گرفتاری 14 اپریل 1971ء کو عمل میں آئی۔ یہ عجیب منحوس دن تھا۔ سورج نکلتے ہی ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس رات بارہ بجے کے قریب تیس مسلح جوانوں

شہید ہوتے رہیں گے، اس لیے بھارت کے خلاف بغاوت کرنا ہی ہو گی۔

میری پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے وہاں کچھ سیاسی روشنی بھی تھی ، میں نے جن شخصیتوں سے کچھ اثر لیا ان میں پولیٹیکل کانفرنس کے غلام محیّ الدین قرّہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور اس اثر نے خاص طور پر مجھے بچپن سے ہی ملکی سیاست کی پُر پیچ وادیوں میں بھٹکنے کے لیے پھینک دیا اور میں بچپن سے ہی پولیٹیکل کانفرنس کے پوسٹر دیواروں پر چسپاں کیا کرتا تھا۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے ساتھی دوستوں کے ساتھ مل کر 14 اگست کو پٹاخے چلایا کرتا تھا، کیونکہ مجھے بتایا گیا کہ پاکستان ہی اسلام کا رکھوالا ہے۔ میری ماں مجھے پاکستان کے متعلق کچھ کہانیاں سنایا کرتی تھی، جو اس نے جانے کس سے سنی تھیں۔ ایک کہانی اُن میں سے یہ ہے کہ پاکستان کا صدر ایوب خان، انارکلی لاہور میں سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک بے پردہ لڑکی دیکھی اور کار سے اتر کر اس لڑکی کو شیشے کی ایک الماری میں بند کر دیا تاکہ باقی عورتیں عبرت حاصل کریں اور آئندہ کوئی بے پردہ گھر سے باہر آنے کی جرأت نہ کرے۔ میری ماں مجھے یہ بھی بتاتی تھی کہ پاکستان میں جب اذان ہوتی ہے تو وہاں لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر مسجد کی طرف بھاگتے ہیں۔ دکانیں کھلی رہتی ہیں مگر چوری نہیں ہوتی ۔۔۔ مجھے بتاؤ میرے دوستو! کہ جب میری ماں نے یہ سنا ہو گا کہ میرے آزادی پسند بیٹے پر بھارت کے دشمن پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام ہے تو اس کے دل پر کیا بیتی ہو گی اور اُسے اپنے پاکستان کے متعلق اپنے تصور کے شیشے کو چکنا چور ہوتے دیکھ کر کتنا دکھ ہوا ہو گا۔

ایک بار میں چچا کے ہمراہ ٹنگ مرگ سے سرینگر جا رہا تھا۔ جس بس میں ہم سوار تھے اس سے آگے کچھ فاصلے پر ایک فوجی ٹرک تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے فوجی ٹرک سے کوئی چیز پھینکی گئی ڈرائیور نے بس روک لی اور ۔۔۔ ہم سب نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر صرف ایک ہی خیال آتا تھا کہ کاش بس سے بموں کے ٹوکرے مل جائیں اور میں ان تمام فوجی ٹرکوں کو ان بموں سے اڑا دوں میرے پاکستانی بھائیو! ہم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک عورت کی لاش تھی، کسی غریب کی لاش، کسی مسلمان کی لاش، کشمیر کی ایک بیٹی کی لاش اور خدا جانے کتنے گِدھوں نے اس کے گوشت کو نوچا تھا، اور جب اس میں زندگی کے آثار ختم ہو گئے تو اسے پھینک دیا گیا۔ مگر کشمیر کا مجبور مسلمان اس حادثہ پر سوائے

بولنے میں واقعی اوّل نمبر پر ہیں۔انہوں نے ہمارے پاس اپنے کچھ گماشتے بھیجے جنہوں نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم ''المجاہد'' (جس کو لوگ یہاں ''الفراڈ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں) کے کارکن ہونے کا اعلان کر دیں تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کے مجاہد خیالی ہی نہیں بلکہ عملی زندگی میں موجود ہیں اور وہ کشمیر کی آزادی کے لیے بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں انہوں نے ہمیں بڑے ہی سبز باغ دکھائے مگر میں یہ سب کچھ کیسے کر سکتا تھا کیوں کہ یہ جھوٹ تھا کہ ہم ''المجاہد'' کے کارکن ہیں اور ''سردار جی'' نے پہلے ہی دن سے ہماری اس گستاخی کی سزا دینے کی ٹھان لی، مگر اب میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم نے ''المجاہد'' یا ''الفراڈ'' کا ممبر ہونے کا اعلان کر دیا ہوتا تو کیا پھر یہ دن دیکھنے پڑتے؟ غالباً نہیں۔

پھر ''سردار جی'' کے ساتھ ایک ایسی ٹیم اکٹھی ہوگئی جس کے ذمہ یہ فریضہ تھا کہ وہ کشمیری اور پاکستانی عوام کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کریں، کیونکہ اسی طرح کشمیر کا مسئلہ آسانی سے بھارت کی خواہش کے مطابق حل ہو سکتا ہے۔ذرا سمجھیں میرے دوستو، جب آپ لوگ یہ سوچیں گے کہ کشمیری بھارت کے ایجنٹ ہیں تو وہ یقیناً کشمیریوں سے نفرت کریں گے اور جب کشمیریوں کو یہ بتایا جائے گا کہ آزادی کی تڑپ رکھنے والے کشمیریوں کو پاکستان میں دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، بلکہ ان پر غیر انسانی تشدد کے پچھلے تمام ریکارڈ بھی توڑ دیئے جاتے ہیں تو کیا کشمیری پاکستانیوں سے نفرت نہیں کریں گے؟ یہ ڈرامہ کیسے تیار ہوا؟ اس کی مزید کچھ تھوڑی سی جھلک آپ کو بعد میں دکھاؤں گا پہلے آپ ''نور العارفین شو'' کو دیکھ لیں۔

''آئی واش''

غالباً 27 مارچ 1971ء کی تاریخ تھی، جب کمیشن (ہماری اطلاع کے مطابق جو ''آئی واش'' کے لیے قائم کیا گیا تھا) کے چیئرمین نور العارفین اور انٹیلی جینس کے ارباب مختار نے ہم پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔انہوں نے ہمیں بتایا کہ کچھ بھارتی مجھے اور میرے ساتھی اشرف کو اغوا کرنا یا قتل کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے ہم آپ کی حفاظت کے لیے گارڈ مقرر کر رہے ہیں۔ان کے اس احسان نے ہمیں خرید لیا کہ ہمارے دوستوں کو کتنا خیال ہے ہمارا، ہم نے اظہار تو نہیں کیا لیکن

نے ریسٹ ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ پولیس کے حملہ آور دستے میں ایک ایس ایس پی، ایک ایس پی، ملٹری انٹیلی جنس کا ایک افسر، ایک مجسٹریٹ، ایک سب انسپکٹر اور باقی جوان تھے۔ ریسٹ ہاؤس سے مجھے اور میرے دلیر ساتھی اشرف کو گرفتار کر کے ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ ہتھکڑی کی زنجیر کا دوسرا سرا ہمیں گرفتار کرنے والے کے ہاتھ میں تھا۔ مگر جلد ہی ایس پی کی طرف سے ہتھکڑی پکڑنے والے کو زبردست ڈانٹ پڑی کہ ہتھکڑی اپنی پیٹی (بیلٹ) میں پھنساؤ۔ غالباً ایس پی کو خیال ہوگا کہ ہم پولیس کی اتنی بڑی فوج کی موجودگی کے باوجود اڑ کر کہیں نکل جائیں گے۔ مری میں نور العارفین ''کمیشن شو'' شروع ہونے سے پہلے مارچ میں پاکستان انٹیلی جینس بیورو کے ارباب مختار اور ایک انٹیلی جینس آفیسر ڈی ایچ قریشی ہمیں ٹانڈا ڈیم کوہاٹ لے گئے اور وہاں ریسٹ ہاؤس میں ارباب مختار نے ہمیں کہا کہ گورنمنٹ چاہتی ہے کہ آپ لوگ اب کوئی کاروبار کریں یا کالج میں داخلہ لے لیں، اس لیے کہ اب سب لوگ تمہیں جاننے لگے ہیں۔ تم آزادی کی جنگ کے سپاہی نہیں رہ سکتے۔ خدا جانے ارباب مختار نے یہ لالچ ہمیں کس لیے دیا۔ مگر ارباب صاحب کو میں نے بتایا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے سری نگر سے چلے آنے کے بعد میرے ماں باپ پر بھارت نے کتنے ظلم ڈھائے ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ انہیں روٹی بھی ملتی ہے یا نہیں۔ لیکن میں یہ سب بھول کر جنگ آزادی میں شامل ہوا ہوں۔ ہم یہاں کاروبار کرنے نہیں آئے، اگر یہی خواہش ہوتی تو سری نگر کوئی بُری جگہ نہیں۔ وہیں اپنے ماں باپ کے پاس سب کچھ کر سکتے تھے مگر ہم اپنے وطن کی آزادی کے لیے نکلے ہیں۔ ہمیں کاروبار نہیں، بندوق چاہیے، تعلیم نہیں، گرنیڈ اور سٹین گنیں چاہیں، شادی کے لیے لڑکی نہیں گولی چاہیے، کیونکہ ہم یقین کر چکے ہیں کہ ہمیں آزادی دی نہیں جائے گی بلکہ لینا پڑے گی، ہمارے قدم جس راہ پر اٹھ چکے ہیں اب واپس نہیں ہوں گے۔ ہم اپنے علاقہ کو آزاد کرائیں گے یا لڑتے لڑتے زندہ جاوید ہو جائیں گے۔

مگر نوکر شاہی کی نظر میں شاید ہماری پہلی غلطی تھی جو ہم نے ان کی بات نہیں مانی۔ دوسری بات....... وہ آپ لوگ ''سردار جی'' کو تو جانتے ہی ہیں نا، جنہیں ''اوّل'' بننے کا شوق ہے، پتہ نہیں وہ کس کس امتحان میں اوّل آئے ہیں لیکن اتنا تو مجھے بھی پتہ چل چکا ہے کہ ''سردار جی'' جھوٹ

شاہی قلعے میں:

28 اپریل 1971ء کو مجھے رات دو بجے رسوائے زمانہ شاہی قلعہ لاہور (جو بقول ایک دوست کے بھارتی ایجنٹ ڈھالنے اور غدار بنانے کا کارخانہ ہے) میں پہنچا دیا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں ایک معمولی کارکن سے اچانک بڑا آدمی بن گیا ہوں، کیونکہ میں نے سنا تھا کہ ہر آزادی پسند بڑا لیڈر شاہی قلعہ میں حکومت کا مہمان رہ چکا ہے۔

اس مقتل کے متعلق کیا عرض کروں کہ وہاں کیا تھا، یوں لگتا ہے جیسے میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ مجھے ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ دو دن تو وہاں سکوت مرگ طاری رہا۔ ایک لانگری صبح و شام دال روٹی نام کی کوئی شے دے جاتا تھا، روٹی کیا تھی، میں یہ بتا کر اپنے میزبانوں کی توہین کرنا نہیں چاہتا......... دو دن اس کوٹھڑی میں بند رکھنے کے بعد مجھے ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں چار حاکم کرسیوں پر براجمان تھے۔ ان کے نام مجھے بعد میں معلوم ہوئے کہ وہ ڈی آئی جی اطہر، ایس پی قمر عالم، کرنل بٹ اور قلعہ کا جلادِ اعظم دُرانی تھے۔ ڈی آئی جی نے چند سوال کئے۔ میں ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ کیونکہ ان کی زبان کچھ ایسی تھی جیسے ابھی ابھی خداوندِ تعالیٰ نے انہیں قیدیوں پر جمعدار بنا کر بھیجا ہو، یا پانی پت کے میدان سے گھوڑوں کا کوئی سائیس جنگ سے ڈر کر بھاگتے ہوئے اپنے دشمن کو جو تلوار لیے اس کے سر پر پہنچ گیا ہو گالیاں بک رہا ہو، مگر میں نے ان کی ہر تلخ نوائی برداشت کی، قیدی جو تھا اور قیدی بھی ایسا جسے ایجنٹ، غدار اور جانے کیا کچھ بنانے کے لیے ڈرامہ سٹیج کرنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں اس کے سوالات کا جواب کیا دیتا، الٹا ایک سوال ان سے کر بیٹھا کہ اتنا تو بتا دیں کہ مجھے کس خوشی میں یہاں لائے ہیں، کیا غلطی ہو گئی ہے مجھ سے۔ مگر میری کسی بات کا جواب نہ دیا گیا اور مجھے واپس بھیج کر کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا جہاں سیمنٹ کا پلیٹ فارم اور بدبودار کمبل میرا منتظر تھا۔

دوسرے دن مجھے پھر کوٹھڑی (سیل) سے نکالا گیا اور ایک اور کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں کچھ لوگ پہلے سے موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک نے دوسرے سے کہا کہ چپ ہو جاؤ، کشمیر آزاد کرانے والے حریت پسند تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی اس طنز نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ

ہمارے دل احسان مندی کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے اور اس کے بعد ہمارے سروں پر کچھ تھانیدار قسم کے لوگ مسلط کر دیئے گئے۔ مگر جب ہمیں باقاعدہ گرفتار کیا گیا تو ہماری حفاظت کے بہانے ہم پر مسلط پولیس کا عقدہ کھلا اور جب ہمیں احسان مندی والی باتیں یاد آئیں تو ہم خود اپنے ہی مفہوم کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ گئے اور اس وقت احساس ہوا کہ نور العارفین ''شو'' تو واقعی ایک ڈرامہ تھا تاکہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کے جذبات کو سرد کیا جا سکے۔ اصل میں بھارتی ایجنٹ اور پاکستان کے غدار تو ہمیں انکوائری سے پہلے ہی گرفتار کر چکے تھے۔ شاید کوئی دردِ دل رکھنے والا انسان مجھے اس بات کا جواب دے کہ میری انکوائری سے پہلے ہی بہانے سے ہمارے سروں پر پولیس کیوں بٹھا دی گئی تھی۔ اصل میں ڈرامے کی کہانی لکھنے والے بھول گئے کہ ان کی پیش بندی ان کا راز اگل دے گی۔ یہاں اس بات کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ ارباب مختار کی انکوائری جو ٹائنڈہ ڈیم کی تفریح کے بہانے ہو رہی تھی، کی رپورٹ تیار ہونے سے دو دن پہلے نور العارفین کمیشن بٹھانے میں کیا مصلحت تھی۔ ارباب صاحب کی رپورٹ کا کیوں نہ انتظار کیا گیا۔ یہ تو آپ مانیں گے کہ جھوٹی کہانی کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ تیار کی جائے، قدرت کا دستِ غیب اس میں کچھ غلطیاں کر دیتا ہے اور وہی ہاتھ ظلم کے وقت مظلوموں کا سہارا بنتا ہے۔

گرفتاری کے بعد ہم بے یار و مددگار ساتھیوں کو کیمبل پور پہنچا کر ایک دوسرے سے الگ کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ قید تنہائی میں مجھ پر جیسے سوچوں کے دروازے کھل گئے اور سب کچھ مجھ پر عیاں ہو گیا۔ ماضی کا ایک ایک سین میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگا۔ مجھے اپنے ماں باپ، عزیز و اقارب، یار دوست اور اپنے وطن کی گل پوش وادیاں نظر آنے لگیں۔ کبھی میں زعفران کے کھیت دیکھتا اور اپنے بچپن کو یاد کرتا، پھر جیل کی کوٹھڑی پر میری نظر جاتی تو مجھے یقین نہ آتا کہ میں جنگ آزادی کا سپاہی ہوں، اس لیے کہ آزادی کے سپاہیوں کو دوست تو پابند سلاسل نہیں کرتے ا... میں نے تو نئے دوستوں کے لیے اپنے عزیزوں سے جدائی کا دکھ برداشت کیا تھا، مگر میری سوچ مجھے مطمئن نہ کر سکی۔

معمولی سے بات نظر آتی ہے، لیکن یقین کریں کہ انسان چند منٹ بھی اس حالت میں نہیں گزار سکتا۔ بازوؤں میں خون کی گردش رُک جاتی ہے، دم گھٹنے لگتا ہے، بے اختیار چیخیں نکلتی ہیں۔ ظالم منہ میں رومال ٹھونس دیتے ہیں اور وہاں یہ بات یاد آتی ہے کہ ظالم مارتا بھی ہے اور رونے بھی نہیں دیتا اور پھر یہ ابھی اس انجام کا آغاز تھا جو یہ ظالم میرے اور میری قوم کے بہادر جیالوں کے ساتھ شروع کر رہے تھے مگر کیوں............ یہ سمجھنے کے لیے علم نجوم جاننے کی ضرورت نہیں۔ بات سیدھی سی ہے کہ بھارت کی گیم یہاں کچھ لوگ کھیل رہے تھے کہ کشمیریوں پر اتنا ظلم کرو کہ وہ پاکستان سے نفرت کرنے لگیں۔ ان کو ایجنٹ بنا کر اتنی تشہیر کرو کہ پاکستان کے لوگ کشمیریوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں تاکہ جب کشمیر بھارت کو تحفتہً دیا جائے تو مخالفت میں کسی طرف سے آواز نہ اٹھے۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ ڈنڈا کسنے کے بعد مجھے نئے نئے ٹارچر سے روشناس کرایا گیا جو میں نے کبھی کاہے کو سنے یا دیکھے تھے۔ مجھے چارپائی پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا کر کے باندھا گیا جس سے ٹانگیں شل ہو جاتی ہیں۔ پھر مجھے الٹا لٹکایا گیا، ننگے جسم پر چھتر سے میری پٹائی کی گئی۔ بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ جسم کے نازک حصوں پر موم کے گرم گرم قطرے ٹپکائے گئے اور جب میں نے پوچھا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے تو مجھے کہا گیا کہ تم سچ بتاؤ کہ تمہیں بھارت نے بھیجا ہے؟ میں تشدد کے بعد نڈھال ہو چکا تھا مگر میں نے یہی جواب دیا کہ ظالمو! تحریکِ آزادی کو ختم کرنے کا جو طریقہ تم نے اختیار کیا ہے تمہیں ایک دن اس کا جواب دینا پڑے گا۔ مجھے بھارت نے نہیں آزادی کی لگن نے بھیجا ہے۔ مجھے میرے وطن کی غلام روحوں نے بھیجا ہے۔ مجھے اُس ظلم نے بھیجا ہے جو بھارت میرے ہم وطنوں پر کر رہا ہے مگر میرے اس جواب کے بعد میری ''حفاظت'' میں اور سختی کر دی گئی۔ متواتر پندرہ......... جی ہاں پندرہ دن میں اس سارے کورس سے گزرتا رہا۔ ان دنوں مجھے سونے بھی نہ دیا گیا۔ جب میں نے اس بربریت کے بعد بھی حقیقت اور سچائی کا دامن نہ چھوڑ کر جھوٹ کو اپنانے سے گریز کیا تو مجھے دو دن کے لیے کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا، جہاں میں تقریباً بے ہوش ہی پڑا رہا۔

دو دن کے بعد پھر مجھے ٹارچر روم میں لایا گیا اور بڑے ہی پیارے لہجے میں یہ کہا گیا کہ

دیا، مگر میں خاموشی کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ حکم ہوا کہ اپنا بیان لکھواؤ۔ عرض کیا کہ وہ میں مری میں نورالعارفین کے سامنے دے چکا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں اللہ کو پہچاننے والوں کا نور نہیں، یہاں تمہیں قلعہ پہچاننے والے کا نور دکھایا جائے گا، اور تھوڑی ہی دیر بعد مجھے ایسے لگا جیسے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا رہا ہو، مگر نہیں یہ پگھلا ہوا سیسہ نہیں تھا، بلکہ وہ تو انسانی چیخوں کی آوازیں تھیں جیسے کوئی کند چھری سے بکرے ذبح کر رہا ہو۔ بہر حال مجھے بیان دینے کے لیے کہا گیا جو میں ان جلادوں کے سامنے دیتا رہا اور پھر مجھے دس بجے رات واپس ''سیل میں بھیج کر بند کر دیا گیا۔

تیسرے دن چار بجے پھر میری طلبی ہوئی اور میں اس کمرے میں زنجیروں میں جکڑا ہوا پہنچا دیا گیا۔ جہاں کبھی بادشاہ ہاتھیوں کو زنجیروں سے بندھوا کر رکھوایا کرتے ہوں گے۔ ہاتھیوں کو بند کرنے کے لیے بادشاہوں نے جو دیواریں بنوائی تھیں آپ ان کی مضبوطی اور موٹائی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دیواروں کی وجہ سے ہاتھیوں کی چنگھاڑیں بھی باہر نہیں آتی ہوں گی۔ بھلا انسان کی آواز کیسے باہر نکل سکتی ہے اور اس کمرے میں کچھ عجیب و غریب قسم کا سامان بھی پڑا تھا۔ جیسے کسی کباڑی کی دکان ہو، ایک طرف چار پائیاں، رسے ، چھتر، ڈنڈے اور لاٹھیاں جن پر چمڑا چڑھا ہوا تھا۔ لکڑی کا ایک بکس جس میں سے کچھ تار نکلے ہوئے تھے۔ میں نے سمجھا کہ یہ کسی چوری سے برآمد کیا ہوا سامان ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ سب چیزیں تو غدار بنانے کے کام آتی ہیں جو اسی مقصد کے لیے خریدی گئی تھیں۔ اس رات مجھے صرف کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا۔ آدھی رات گزر گئی تو میں نے یہ پوچھنے کی جرأت کی کہ مجھے سونے کیوں نہیں دیتے؟ جواب ملا کہ قمر عالم کا حکم ہے، اسی طرح ساری رات بیت گئی میں تھکاوٹ سے نڈھال ہو گیا تھا۔ مگر مجھے جلدی احساس ہو گیا کہ ابھی تو آغازِ سفر ہے

ع ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

اور پھر مجھے سیل میں بھیج دیا گیا۔

اگلی رات پھر اسی بھیانک کمرے میں لے جایا گیا اور اب کھڑا کرنے کے ساتھ میرے بازوؤں (جو ہتھکڑی سے جکڑے ہوئے تھے) اور گردن کے درمیان ایک ڈنڈا کس دیا گیا۔ ظاہر ہے یہ

نہ ڈھائے گئے مجھ پر اور یہ عمل 2 جون 1971 تک دہرایا جاتا رہا، لیکن میں پھر بھی پولیس اور نوکر شاہی کی بنائی ہوئی جھوٹی کہانی اپنانے پر تیار نہ ہوا اور جب وہ تشدد کا ہر حربہ استعمال کر کے تھک گئے، تب انہوں نے اپنے ترکش سے ایک بڑا ہی زہریلا تیر نکالا۔ اس تیر نے میرے سینے کو چھلنی کر دیا۔ اور اس کے سامنے پہلا سارا تشدد ہیچ نظر آنے لگا........ اور پھر میں نے ہتھیار ڈال دیئے جانتے ہیں کیا کہا تھا انہوں نے؟

بے غیرتی کی انتہا:

یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور میں سوچ کے اندھیرے کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتا ہوں اور اپنے رب کو پکار کر پوچھتا ہوں کہ اے میرے خدا، مجھے بتا کہ یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے یا میرا امتحان؟ کیونکہ ایسے روح فرسا مناظر اور میرے دوست ملک میں؟ انسان کا انسان پر ظلم مگر کس جرم کی پاداش میں؟ صرف اس لیے کہ میں اپنے وطن کی آزادی کا نام لیتا ہوں اور میرے دوست پاکستان کے رہنے والے بھی تو وہی کچھ کہتے ہیں جو میں کہتا ہوں مگر مجھ پر یہ ظلم وستم آخر کیوں؟

آپ کو بے چینی محسوس ہو رہی ہوگی کہ میں وہ تیر دکھاتا کیوں نہیں جو سب سے آخر میں میرے سینے سے پار کیا گیا۔ کیسے کہوں اور اس پیاری بہن کا نام کس طرح اپنی زبان پر لاؤں؟ جس نے اپنے ماں باپ کی سرزمین چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس پاک سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا، جس کی مٹی کو میں نے سرمے کی طرح استعمال کیا تھا، جب میں پہلے پہل یہاں آیا تھا، ہاں تو آپ سننا چاہتے ہیں کہ مجھے کیا کہا گیا۔ مجھے کہا گیا کہ:

"اگر تم نے ہماری مرضی کا بیان نہ دیا تو ہم پشاور سے تمہاری بہن کو یہاں لائیں گے جو پہلے ہی سی آئی اے پشاور میں نظر بند ہے اور اسے تمہارے سامنے اسی قلعہ میں بے عزت کریں گے۔"

آپ ہی بتائیں میرے بھائیو! کہ اس ایک ذلیل فقرے سے کیا حال ہوا ہوگا میرا۔ ان ظالموں کی یہ بات سن کر میرا رؤاں رؤاں کانپ اٹھا۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ میں اس وقت پاکستان میں نہیں ہو سکتا کیونکہ اس خطے کو تو میں

ہمیں معلوم ہے کہ تم بے گناہ ہو اور تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن چونکہ ہماری حکومت نے نور العارفین رپورٹ کے ذریعے یہ اعلان کرایا ہے کہ جہاز کا اغوا بھارتی سازش تھی، اس لیے ہم مجبور ہیں اور تمہیں سمجھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی برباد نہ کرو اور پولیس کا تیار کیا ہوا بیان دے دو تا کہ تمہاری خلاصی ہو اور پھر مجھے ایک تیار شدہ بیان سنایا گیا۔ میں پولیس نوکر شاہی، بھارتی ایجنٹ اور سردار جی کا بنایا ہوا بیان سن رہا تھا۔ اور میرے خون کی گردش بند ہو رہی تھی، اور جب وہ بیان ختم ہوا تو آزادی کے اس دیوانے نے وہ بیہودہ کہانی دوہرانے سے انکار کر دیا۔ ان کے سمجھانے کا میرے پاس صرف ایک جواب تھا۔

مجھے سمجھانے والے کاش پہلے خود سمجھ جائیں
بڑی دیوانگی ہے ایک دیوانے کو سمجھانا

میرے انکار کی دیر تھی کہ ظلم کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ چار پائی پر کھڑا کر کے باندھنے سے میری ٹانگیں بیکار کر دی گئیں۔ پھر اس وقت تک باندھے رکھتے کہ میں بیہوش ہو جاتا۔ میرے سر کے بال اس طرح کھینچتے کہ وہ جڑ سے اُکھڑ جاتے۔ ہوش میں آنے کے بعد پھر بازوؤں اور ڈنڈے کا کھیل شروع ہو جاتا۔ جب میں ہوش و خرد سے بے گانہ ہونے لگتا تو ان یزیدوں سے پانی مانگتا وہ مجھے پانی دکھاتے، پھر بھرا ہوا گلاس میرے منہ پر دے مارتے۔ میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ پسینہ سے شرابور ہو جاتا، حلق خشک ہو جاتا۔ پانی کے قطرے یا آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو جو رخساروں پر پھیل جاتے۔ میں انہیں اپنی خشک زبان کو تر کرنے کے لیے چاٹنے کی کوشش کرتا۔ پھر مجھے فرش پر دھوپ میں لٹایا جاتا اور کئی کئی آدمی بیک وقت میرے جسم کو روندنا شروع کر دیتے۔ دھوپ میں ننگا کھڑا کرنے سے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ چار پائی کے دردناک عذاب سے میری ٹانگیں بے حس ہو گئی تھیں اور پھر میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ جسم کے نازک حصوں سے بال اکھاڑنے کا مقابلہ شروع ہوا کہ کون کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بال جمع کرتا ہے۔ میرے سر میں کبھی گرم پانی ڈالتے اور کبھی انتہائی ٹھنڈا۔ کبھی بالکل اندھیرے میں رکھتے اور کبھی ایک ایک ہزار کے بلب جلا کر ان کو دیکھنے پر مجبور کر دیتے۔ کیا کیا لکھوں میرے بھائیو! کہ کیا کیا

والا بیان دے دے گا اور مجھے بھی یقین ہو گیا کہ یہ میرا بیان لیے بغیر نہیں ٹلیں گے اور نہ میری بہن کی عزت محفوظ رہے گی۔ تب 6 جون 1971ء کو مجسٹریٹ نے قلعہ میں پولیس کا بنایا ہوا بیان اپنے سامنے رکھ لیا اور اس کی نقل کرنی شروع کر دی۔ مجسٹریٹ بیان لکھتا رہا اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے مگر مجسٹریٹ نے یہ پوچھنے کی تکلیف بھی نہ کی کہ یہ تمہارا بیان ہے اور نہ میرے رونے کی وجہ پوچھی اور بیان مکمل ہو گیا۔

7 جون 1971ء کو مجھے ملتان جیل بھیج کر ایک سیل میں بند کر دیا گیا۔ نہانا کپڑے دھونا، کھانا پینا، سونا سب کچھ اسی ''سیل'' میں ہوتا تھا۔ یہاں میں 3 دسمبر 1971 تک رہا۔۔۔۔تو میرے دوستو یہ سلوک کیا میرے ساتھ یہاں کی نوکر شاہی نے۔ پھر میں نے ایک افواہ اور بھی سنی کہ کسی اخبار میں ایک کہانی چھپی ہے کہ میں نے دورانِ ملتان کسی ڈاکٹر سے ساز باز کر کے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ میرے بھائیو! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے تو بھاگنے کی اس دن بھی کوشش نہیں کی تھی جب مجھے دورانِ جنگ اپنے ساتھی کے ساتھ میانوالی لے جایا رہا تھا۔ راستے میں سرگودھا پر حملہ کا سائرن ہوا تو ہمیں لے جانے والی گارد کے تمام لوگ، افسر اور جوان گاڑی کی چابی تک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہم قریباً بیس منٹ تک بغیر گارد کے گاڑی میں بیٹھے رہے۔ اور پولیس والے بمباری سے بچنے کے لیے ہم سے دور آڑ لیے چھپے ہوئے تھے۔ مجھ پر الزام لگانے والے یہ نہیں سوچتے کہ میں بھاگ کر جاؤں گا بھی کہاں، اب میرے لیے جگہ بھی کونسی رہ گئی ہے جہاں میں جا سکتا ہوں؟

ڈرامہ کس نے بنایا:

آپ جانتے ہیں کہ میرا قصور کیا ہے، یہی کہ میں آزادی کشمیر کا سپاہی ہوں۔ میں کشمیر کی آزادی کے لیے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے اور کشمیری قوم پر لگایا ہوا بزدلی کا الزام دھونے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ماں باپ بہن بھائیوں اور رشتہ داروں کو بھارتی درندوں کے رحم کرم پر ہونے کے باوجود چانٹا مارا ہے اس کے منہ پر۔ اس کے اٹوٹ انگ کے نعرے کی دھجیاں اڑائی ہیں میں نے، اپنے ماں باپ کے ارمانوں کا خون کیا ہے۔ اپنی قوم کی آزادی کے لیے اپنی جوانی کو وطن پر قربان کرنے کا عہد کیا ہے میں نے۔ بس یہی قصور ہے نا میرا، اور صرف اتنے

ارمانوں کی جنت سمجھ کر آیا تھا اور ہم کشمیری لوگ کشمیر کو نہیں بلکہ پاکستان کو جنت سمجھتے ہیں۔مگر اس جنت میں کیا ہو رہا ہے۔میرے پاکستانی بھائیو! ہاشم غدار نہیں وہ کسی ملک کا ایجنٹ نہیں ہے لیکن حکومت کے یک طرفہ بیانات نے جو مجھے بھارتی ایجنٹ بنانے کی کوشش کی ہے وہ صرف اس لیے کہ میں اپنی بہن کی عزت لٹتی ہوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔اور کوئی بھی بھائی ایسے حالات برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے ان ظالموں سے کہا کہ میری بہن صرف میری بہن ہی نہیں بلکہ اپنے خاوند کے سوا سب کی بہن ہے یہاں تک کہ تمہاری بھی۔اور تم اپنی بہن کو رسوا کرنے پر تلے بیٹھے ہو۔میرے اس فقرے نے ان فرعونوں کو اور سنگدل بنا دیا۔پھر میں تھا وہ کافر اور سنگدل تھے اور گوشہ تنہائی میں جگر آزما رہا تھا اور وہ۔۔۔۔

پھر میرے سامنے ایس پی قمر عالم نے پشاور فون کیا اور فون پر اس نے کہا کہ مجھے ایس پی پشاور سے بات کرنی ہے اور قمر عالم کو بتایا گیا کہ اس کا مخاطب ایس پی پشاور ہی ہے، تب قمر عالم نے پوچھا کہ ہاشم کی بہن کہاں ہے جواب ملا ''سی آئی اے کے آفس میں''

قمر عالم نے کہا کہ اس کا خیال رکھنا، دوبارہ فون کر کے اس کے متعلق کچھ ہدایت دوں گا۔فون بند کر کے قمر عالم نے کہا کہ اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟ ہماری مرضی کا بیان دو گے یا۔۔۔اس سے آگے سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔اس لیے میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔میرے بھائیو! اور میں بھارتی ایجنٹ بن گیا اس لیے کہ میں اپنے خون کو گندا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور میں نے قمر عالم کو کہہ دیا کہ بتاؤ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو، میں تیار ہوں۔میرے اس فقرے سے قمر عالم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، مگر کاش وہ ظالم میرے روتے ہوئے دل کو دیکھ لیتا۔

4، جون 1971ء کو جب کہ میرا ذہن بالکل ماؤف تھا تو قمر عالم مجھے ایک مجسٹریٹ کے سامنے لے گیا اور میں نے قلعہ میں بنائے پولیس کے بیان کو پڑھنا شروع کر دیا۔مجسٹریٹ نے کہا کہ آج مجھے فرصت نہیں، کل آئیں پھر 6، جون 1971ء بروز اتوار مجھے ایک اور مجسٹریٹ کے سامنے لے گئے۔تب مجھے پتہ چلا کہ 4، جون 1971ء کو مجھے جو بیان دلانے لائے تھے وہ صرف میری آزمائش تھی کہ میں پولیس کا دیا ہوا بیان پڑھتا ہوں یا نہیں، اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ پولیس

ان تین الزاموں میں کتنا تضاد ہے؟ جواب میں پاکستانی اور کشمیری عوام پر چھوڑتا ہوں۔ ان تین الزاموں کو گہری نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس کے بعد ہی ان تین الزاموں کا جواب میرے محسنوں کو ملے گا۔ عدالت کیا فیصلہ دیتی ہے۔ اس کا مجھے کوئی غم نہیں، لیکن میں عوام سے پوچھتا ہوں کہ اگر گورنمنٹ نے سپیشل کورٹ کو فیصلہ دینے کا اختیار دیا ہے تو پھر سپیشل کورٹ کے فیصلے سے پہلے پاکستان کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار نے 21 جون 1972ء کو انٹرنیشنل کورٹ میں یہ بیان کیوں دیا کہ ''جہاز کا اغوا بھارتی سازش تھی'' جبکہ اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ آیا ''جہاز کا اغوا سازش تھی یا حریت پسندوں کا اقدام''۔ فیصلہ سے پہلے اٹارنی جنرل کا بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ گورنمنٹ ہمارے متعلق پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہے۔ سپیشل کورٹ کے فیصلہ کے بعد پاکستانی عوام کے سامنے اور بھی کئی ''رازوں'' سے پردہ اٹھ جائے گا۔ اور دنیا کے انصاف پسند عوام کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ساتھ انصاف کے نام پر ایک ناٹک کھیلا گیا۔ اگر اپنی اور قومی پریس کی مجبوریاں میرے ساتھ نہ ہوتیں تو میں ان ''رازوں'' سے ابھی پردہ اٹھا دیتا لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ قومی پریس مجبور ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں ان ''رازوں'' کو کاغذ پر لکھ کر قومی پریس کو بھیج دوں تو قومی پریس نہیں چھاپے گا۔ اس لیے میں مجبور ہوں مگر مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اگر میں نہ رہا تو کوئی مردِ مجاہد ان رازوں کا پردہ چاک کرے گا جس کے تحت ہمارے ساتھ انصاف کے نام پر نور العارفین جیسا ڈرامہ کھیلا گیا۔

اندھیروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے والو!
اجالوں کا پسِ منظر بڑا تاریک ہوتا ہے

جنگِ آزادئ کشمیر کا ایک سپاہی

ہاشم قریشی

سے قصور پر ظلم وستم کا سزاوار سمجھا گیا ہوں۔

مگر میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میرے ساتھ یہ برتاؤ ایک اسلامی مملکت میں کیا جائے گا۔ اس مملکت میں جسے ہر کشمیری پہلی بار یہاں قدم رکھنے کے بعد اس کی خاک کو چومنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اس ملک کے لیے میرے باپ نے 1931ء سے قربانی دی اور پولٹیکل کانفرنس کے وقت میرا باپ اس کا ایک بازو چنا گیا۔ اس کے بعد ان پر کیا بیتی، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ بخشی غلام محمد نے جن آدمیوں کو گولی مارنے کا حکم دیا تھا، ان میں میرا باپ بھی شامل تھا۔ پھر وہ گرفتار بھی ہوئے ان میں سے ایک اب بھی پنڈی میں ہے، دو آدمی اور میرے باپ کو خدا نے کس طرح بچایا یہ کہانی بھی بعد کے کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ ڈرامہ کس نے اور کیوں بنایا؟ لیکن ایک تو مقدمہ عدالت میں ہے دوسرا کچھ تاریخ کے لیے بھی رہنے دینا چاہتا ہوں اور اگر تاریخ نے کبھی ان تاریکیوں سے نقاب الٹا جو روشنی نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتیں تو دنیا دنگ رہ جائے گی۔ مجھے اجازت دو کہ میں ایک بہادر قوم سے کچھ تھوڑا سا گلہ بھی کرلوں کہ خدارا! کسی کو صرف اس لیے غدار نہ کہیے کہ ملکی اخبارات نے غدار کہا ہے۔ یہاں اگر میں نے کوئی سستی چیز دیکھی ہے تو وہ غدار اور ایجنٹی کا سرٹیفکیٹ ہے۔ آج یہاں کتنے محب الوطن ہیں جو کل یہاں غدار تھے اور غدار بنانے والوں سے اگر پوچھا جائے کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ فلاں فلاں غدار ہے تو جواب ملتا ہے کہ اخبار میں لکھا ہے۔ یہ جواب دینے والے صرف جاہل لوگ ہی نہیں ہوتے بلکہ دانشور لوگ بھی ہوتے ہیں۔

تین الزام:

اس وقت میرے اور میرے ساتھی کے خلاف سپیشل کورٹ میں کیس چل رہا ہے اور ہمارے اوپر تین الزام ہیں۔

ا۔ تم لوگ بھارتی ایجنٹ ہو اور ہندوستان کے کہنے پر جہاز اغوا کیا اور جلایا۔

۲۔ تم اور تمہارے ساتھی نے ہندوستانی سواریوں کو حبسِ بے جا میں رکھا۔

۳۔ تم اور تمہارے ساتھی نے ہندوستان کی Property چُرائی۔

جی ایم لون

غلام محمد لون المعروف جی، ایم لون 1926 کو سری نگر کے ایک تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان سری نگر سے ہی پاس کیا اور 1942 میں سولہ برس کی عمر میں کاروبار کے سلسلے میں کراچی آ گئے۔ انہوں نے قالین بافی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ 1947ء میں جن دنوں تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا وہ اپنے عزیز و اقارب سے ملنے سری نگر گئے ہوئے تھے۔ حالات ناساز گار ہونے سبب وہ کئی ماہ تک سری نگر میں رکے رہے۔ بعد ازاں اپریل، مئی 1948 میں وہ ایک مہاجر قافلے کے ہمراہ سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان میں داخل ہوئے۔ وہاں سے فوراً کراچی آ گئے اور اپنے کاروبار کو دوبارہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد انہیں صرف دو بار ہی بھارتی مقبوضہ کشمیر جانے کی اجازت ملی۔ 1950ء اور 1956ء میں۔ بعد ازاں تادمِ زیست وہ اپنی جنم بھومی دیکھنے کے لئے ترستے رہے۔

کراچی میں کاروبار کے ساتھ ساتھ جی ایم لون نے اُردو کالج میں داخلہ لے لیا۔ اور بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ 1958 میں جب بھارتی حکومت نے شیخ محمد عبداللہ کو دوبارہ وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے پسِ دیوارِ زنداں دھکیل دیا تو یہ واقعہ جی ایم لون کی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ انہوں نے سیاساتِ کشمیر میں عملی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے مسٹر کے ایچ خورشید اور دیگر کشمیریوں کے ساتھ مل کر احتجاجی جلسے جلوس اور ہڑتالیں منعقد کیں۔ کے ایچ خورشید ان دنوں کراچی میں وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ انہوں نے کراچی میں بکھرے ہوئے کشمیریوں کو متحد کرنے کی مہم شروع کی تو متحرک کارکن سامنے آئے جن میں میر عبدالقیوم، جی ایم لون بھی شامل

گامزن جانبِ مقتل .... نیاز حیدر

آج پھر جامِ شہادت کی طلب ہے مجھ کو لذت ولطفِ جراحت کی طلب ہے مجھ کو
سرفروشانہ جسارت کی طلب ہے مجھ کو زورِ قاتل سے بغاوت کی طلب ہے مجھ کو
گامزن جانبِ مقتل ہے کوئی آج کے دن

حق پرستی پہ اجل آج نچھاور ہو گی زندگی پیکرِ موجود سے برتر ہو گی
عاشقی خون کے دریا کی شناور ہو گی اب یہ تفسیر نہ مجھ سے سرِ منبر ہو گی
گامزن جانبِ مقتل ہے کوئی آج کے دن

تا کہ باقی نہ رہے ظلم وستم دنیا میں تا کہ انسان پہ رہے فضل وکرم دنیا میں
سرنگوں ہو نہ صداقت کا علم دنیا میں جبر کے آگے نہ ہو سر کوئی خم دنیا میں
گامزن جانبِ مقتل ہے کوئی آج کے دن

نفرت وکذب وریا، فتنہ گری جرم ودغا جہل، کوتاہ نظر، تنگ دلی جور و جفا
پھر نفاق و حسد، حرص و ہوس ہیں برپا تا کہ اب کوئی نہ ہو دشمنِ تسلیم و رضا
گامزن جانبِ مقتل ہے کوئی آج کے دن

لمحے سنسان ہیں، ساکت ہیں، لہو میں تر ہیں وقت صحرا بہ کنار آگ سے بحر و بر ہیں
آتش افروز، نظر سوز یہ سب منظر ہے آج ویران ہیں دل، ارض وسما بے گھر ہے
گامزن جانبِ مقتل ہے کوئی آج کے دن

بالی کانوں سے، کبھی سر سے رِدا چھنتی ہے تہہ خنجر نظر آتی یہ قضا کیسی ہے
جلتے خیموں کی جلا زخموں کو چمکاتی ہے شاید اب تک وہ یزیدی کی ہوس باقی ہے
جلوہ گر خون کی مشعل ہے کوئی آج کے دن
گامزن جانبِ مقتل ہے کوئی آج کے دن

خودمختار ریاست تسلیم کیا جائے۔ 12 مئی 1963 کو ڈان ہوٹل راولپنڈی میں کشمیر کے سیاسی راہنماؤں ، دانشوروں، وکلاء اور اہل قلم کا ایک نمائندہ اجلاس ہوا جس میں ریاست جموں کشمیر کی مکمل خودمختاری کا مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ متفقہ طور پر ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا نام کشمیر انڈی پینڈنٹس کمیٹی رکھا گیا۔

آزاد کشمیر اور پاکستان میں آباد کشمیریوں کی ایک نمائندہ کمیٹی تھی جس میں تمام علاقوں کی نمائندگی تھی ۔ جی ایم لون کو اس کمیٹی کا کنوینئر مقرر کیا گیا۔ کمیٹی کے ممبران حسب ذیل ہیں ۔ میر عبدالقیوم ، عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ ، قاضی خورشید عالم ، عبدالمجید ملک ، امان اللہ خان، میر عبدالعزیز ، میر عبدالرشید، مجید امجد بٹ ، غلام نبی گلکار، شیخ محمد سلیم ، ایم اے فاروق ایڈووکیٹ ، سیّد سعید شاہ نازکی ، ڈاکٹر غلام احمد جراح اور علی محمد ملک وغیرہ ۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کی قائم کردہ محاذ رائے شماری کے دیکھا دیکھی کراچی ، سیالکوٹ اور پشاور میں بھی اس کی شاخیں قائم کی گئیں ، لیکن ان کا دائرہ کار چند افراد پر ہی مشتمل تھا۔ 1964ء میں جب شیخ عبداللہ نے پاکستان کا دورہ کیا تو یہاں کے کشمیریوں میں اُن کے لئے محبت اور احترام کے جذبات اُمڈ آئے ۔انہیں تو پنڈت نہرو کی اچانک وفات کے سبب دورہ ادھورا چھوڑ کر جانا پڑا لیکن ان کے فرزند ڈاکٹر فاروق عبداللہ کچھ عرصہ کیلئے یہاں رک گئے اور اُنہوں نے آزاد کشمیر اور پاکستان کا تفصیلی دورہ کیا۔ اس دورہ کے دوران انہوں نے عندیہ ظاہر کیا کہ یہاں آزاد کشمیر اور پاکستان میں بھی محاذ رائے شماری کو منظم انداز سے قائم کیا جائے۔ چنانچہ کراچی کے دورے کے دوران میر عبدالقیوم ، جی ایم لون ، میر عبدالمنان اور امان اللہ خان وغیرہ نے انہیں یقین دلایا کہ وہ محاذ رائے شماری کا قیام عمل میں لائیں گے اور بھارتی مقبوضہ کشمیر میں قائم محاذ کے ساتھ مل کر کشمیری قوم کے حق خودارادیت کے لئے جدوجہد کریں گے ۔ چنانچہ میر عبدالقیوم کی سربراہی میں ایک کنوینگ کمیٹی بنائی گئی جی ایم لون بھی اس کمیٹی میں شامل تھے۔

چنانچہ طے شدہ پروگرام کے تحت جب 4,3 اپریل 1965 کو سیالکوٹ کے مقام پر ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا جس میں محاذ رائے شماری کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جی ایم لون اس اجلاس میں شریک نہ تھے ۔ کیونکہ وہ کاروبار کے سلسلہ میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے ۔ اِن کی غیر موجودگی

تھے۔ اِن کشمیریوں نے ایک تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ تنظیم کا نام کشمیر لبریشن موومنٹ رکھا گیا۔ ایم لون کو اُس کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اس عرصے میں مسلم کانفرنس کے راہنما چوہدری غلا عباس کراچی آئے تو انہیں علم ہوا کہ یہاں کے کشمیریوں نے KLM کے نام سے ایک تنظیم قائم کر ر ہے۔ چوہدری غلام عباس بھی مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کوئی تحریک شروع کرنا چاہتے تھے چنانچہ اُنہوں نے بھی اس نام کو پسند کیا اور اپنی تحریک کیلئے یہی نام اختیار کر لیا۔ اس عرصے میں ملک غلام محمد کی حکومت کا تختہ الٹ کر جب ایوب خان نے مارشل نافذ کیا تو پاکستان میں سیاسی جماعتو اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی، اس لئے جی ایم لون بھی غیر فعال ہو گئے وہ کسی سیا جماعت میں شامل نہ ہوئے۔

1961 میں آزاد کشمیر میں مسٹر کے ایچ خورشید کے دورِ حکومت میں سٹیٹ کونسل کے انتخابات ہوئے تو کراچی سے جی ایم لون نے نمایاں کامیابی حاصل کی انہوں نے اپنے انتخابی منش میں اس امر کی وضاحت کی کہ وہ کشمیریوں کے لئے مکمل حقِ خود ارادیت کے حامی ہیں اور مسئلہ کشمی محض بھارت اور پاکستان کے مابین سرحدی تنازعہ نہیں سمجھتے بلکہ یہ قوم کے مستقبل کا سوال ہے اُنہوں نے سٹیٹ کونسلر کی حیثیت سے ملنے والے اعزازیہ کی رقم بھی تحریک آزادی کشمیر کیلئے وقف کرنے کا اعلان کیا۔

حکومت آزاد کشمیر میں سٹیٹ کونسلر کی حیثیت سے جی ایم لون نے نہایت متحرک جاندا اور جرأت مندانہ قردار ادا کیا۔ اُنہوں نے وزارتِ امورِ کشمیر کا عمل دخل ختم کرنے اور آزاد کشمیر ایک مکمل جمہوری، بااختیار حکومت بنانے نیز گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر حکومت کے دائرہ کار میں لانے اور وہاں کے عوام کو جمہوری اور آئینی حقوق دینے کیلئے بھرپور آواز اُٹھائی۔ اُنہوں نے سٹیٹ کونسل میں آزاد کشمیر کو بااختیار حکومت بنانے کی تاریخی قرارداد پیش کی۔ سٹیٹ کونسل کی حیثیت سے وہ صدرِ آزاد کشمیر کے ایچ خورشید کے ہمراہ فیلڈ مارشل ایوب خان سے بھی ملے۔ 1962ء میں پاک بھارت مذاکرات کا دور شروع ہوا تو تقسیمِ کشمیر کی بازگشت سنائی دی۔ چنانچہ جی ایم لون اور ان کے کچھ دیگر ساتھیوں نے کراچی سے ایک تحریک شروع کی جس کا مطالبہ تھا کہ ریاست جموں کشمیر کو مکمل

پر بھی لٹک جاؤں گا۔ تاکہ دُنیا دیکھ سکے کہ کشمیری اتنے بزدل نہیں ہیں کہ وہ اپنی جانیں بچانیں کے لئے اپنے عقائد و نظریات کو چھپاتے پھریں۔ اگر اپنی مادرِ وطن سے محبت کی سزا موت ہو سکتی ہے تو میں ایسی موت کو مسکراتے ہوئے گلے لگاؤں گا۔"

(آتش چنار، صفحہ 21-22)

30, جنوری 1971 کو بروز ہفتہ جی ایم لون اپنے دفتر میں مصروف تھے جب میر عبدالمنان نے انہیں ٹیلی فون پر یہ خبر سنائی کہ دو کشمیری نوجوانوں نے بھارت کا ایک طیارہ اغوا کر کے لاہور کے ہوائی اڈے پر اتار دیا ہے۔ یہ خبر سن کر جی ایم لون کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دفتری مصروفیت سے فارغ ہو کر جی ایم لون شام کو میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان سے ملے اور تمام تفصیلات معلوم کیں۔ 31 جنوری بروز اتوار کو جی ایم لون، میر عبدالقیوم وغیرہ کراچی سے بذریعہ جہاز لاہور پہنچے اور تمام حالات کو بچشمِ خود ملاحظہ کیا۔ بد بخت اور بد ذات یحییٰ خان نے اور اس کے حکمران ٹولے نے جب بھارت کو خوش کرنے کے لئے دونوں ہائی جیکرز اور محاذ رائے شماری کے راہنماؤں کو گرفتار کیا تو جی ایم لون کو بھی کراچی سے 28, اپریل 1971ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے انہیں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا اور اپنی مرضی کا بیان حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جی ایم لون کے عزم و ہمت کو وہ سرنگوں نہ کر سکے۔ بظاہر آسودہ حال اور مال و دولت کی فراوانی رکھنے والا آزادی کشمیر کا یہ متوالہ شاہی قلعہ کے جلادوں کے سامنے ایک ناقابل تسخیر چٹان بن گیا۔ جسے وہ وحشیانہ جبر و تشدد کے لاکھ حربوں کے باوجود توڑ نہ سکے۔ بین الاقوامی سطح پر پھیلے ہوئے کاروبار کا یہ عظیم تاجر اپنے وطن کی عزت اور آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کر بیٹھا۔ اس فرزند کشمیر کا یہ جذبہ ایثار و قربانی کشمیر کی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہے۔

جی ایم لون نے شاہی قلعہ لاہور میں اذیتیں جھیلنے کے بعد عدالت العالیہ کے کٹہرے میں جو بیان دیا تھا۔ وہ "آتش چنار" کے عنوان سے 74 صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت کتابچے کی شکل میں شائع ہوا جس کا پیش لفظ محاذ رائے شماری کے راہنما میر ہدایت اللہ نے لکھا تھا۔ اس کتابچے کے صفحہ 32-33 پر جی ایم لون نے اپنے سیاسی نظریے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

میں انہیں محاذ کا سینئر نائب صدر منتخب کیا گیا۔ اس سفر کے دوران انہوں نے فریضہ حج ادا کیا اور ان کی ملاقات شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ سے ہوئی۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ان دونوں راہنماؤں نے آزاد کشمیر و پاکستان میں محاذ رائے شماری کے قیام پر مسرت کا اظہار کیا اور جی ایم لون کو ضروری ہدایات دیں۔ جب محاذ رائے شماری کا عسکری ونگ نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF) قائم کیا گیا تو اس تنظیم کے محرکین کے ساتھ طویل گفت وشنید کے بعد جی ایم لون بھی اس میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے NLF کے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ابتدائی آپریشن کیلئے 12 ہزار روپے چندہ دیا۔ این ایل ایف کی مالی معاونت کے علاوہ جی ایم لون زیادہ فعال کردار ادا نہ کر سکے۔ گنگا ہائی جیکنگ کیس کے دوران خصوصی عدالت کو بیان دیتے ہوئے جی ایم لون نے NLF کے بارے ان جذبات کا اظہار کیا تھا:

"میں ایک غلط فہمی دُور کرنے کے لئے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ 1967ء کے بعد میرا قومی محاذِ آزادی کی طرف کیا رویہ رہا۔ میں نے کبھی قومی محاذِ آزادی کی مخالفت نہیں کی اور نہ کبھی ایسا کروں گا۔ میں اس تنظیم کو محبِ وطن افراد کی ایک تنظیم سمجھتا ہوں اور اس تنظیم کے جن ارکان کے ساتھ مجھے ملنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ وہ منفرد خوبیوں کے حامل اور اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ ان میں سے ہر شخص ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے جن پر کشمیری قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قومی محاذِ آزادی کی کامیابیوں یا ناکامیوں سے قطع نظر اس تنظیم نے تاریخ میں کشمیر کے وقار کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ میں اپنے اس نظریئے پر قائم ہوں کہ مسلح جدوجہد ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے کشمیری قوم اپنے لئے حق خودارادیت حاصل کر سکتی ہے۔ اس طرح سے میں مادرِ وطن کی آزادی کے لئے قومی محاذِ آزادی کے مسلح جنگ کے مؤقف کی پوری پوری حمایت کرتا ہوں۔ چاہے مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے اس نظریئے میں فرق نہیں آئے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں اس مقصد کے حصول کے لئے تختہ دار

احترام اور ہمدردی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی وطن کے لئے اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرتے ہوئے خود کفیل جدوجہد ممکن ہے۔ میں انہیں سلام کرتا ہوں اور ہمیشہ ان کی مدد کو کمربستہ رہوں گا۔ حقِ خودارادیت کے اصول کے ساتھ میری وابستگی کسی اور شخص کی اس اصول کے ساتھ وابستگی کے مرہونِ منّت نہیں ہے۔ اگر میں اس اصول کے لئے یکہ وتنہا بھی رہ جاؤں، تب بھی میرے مؤقف میں تبدیلی نہ آئے گی۔" (آتشِ چنار، صفحہ 32، 33)

میر ہدایت اللہ آتش چنار کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے انہی محبانِ وطن راہنماؤں میں جناب غلام محمد لون بھی شامل ہیں جو اپنی خداداد قابلیت، ہنرمندی اور محنت کی بدولت ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔ لون صاحب اور اُن کے بزرگ تحریکِ حریّتِ کشمیر کے لئے قابلِ قدر خدمات انجام دینے کے لئے مقبوضہ کشمیر میں مشہور ہیں اور شیرِ کشمیر کے مقربین میں شامل ہیں۔ لون صاحب تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے ساتھ تقریباً بیس سال سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین کے منتخب نمائندہ کی حیثیت سے آزاد کشمیر کی سٹیٹ کونسل 64-1962 کے دوران اپنی سیاسی بصیرت، حقیقت پسندی، جذبۂ حریّت اور عوام دوستی کا ثبوت دے کر عوام کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ انہوں نے پاکستان کو سیٹو وسینٹو اور دیگر فوجی معاہدات سے علیحدہ ہو جانے اور عوامی جمہوریہ چین سے گہرا رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور آزاد کشمیر کو ایک آزاد خودمختار ریاست تسلیم کر کے اسے چین سمیت دیگر دوست ممالک سے تسلیم کرا [illegible] دراس طرح حکومت آزاد کشمیر کو حریّت پسند افریقی وایشیائی [illegible] کی اعانت وامداد سے آزادیٔ کشمیر کی جنگ کرنے کے قابل بنانے کی

''میں کشمیری عوام کے حق خودارادیت میں یقین رکھتا ہوں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ ہم کشمیریوں کو اپنی مادرِ وطن کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل اور ناقابلِ تنسیخ حق حاصل ہے۔ دوسرے الفاظ میں میں سمجھتا ہوں کہ کشمیریوں کے سامنے اپنی ریاست کے سیاسی مستقبل کے لئے تمام راستے کھلے ہیں، چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اپنے اس مؤقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ ریاست جموں کشمیر ایک ناقابلِ تقسیم علاقائی وحدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں حدِ متارکہ جنگ کے تقدس کو ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ اسی بنا پر میں گلگت بلتستان کو ریاست جموں کشمیر کا یک حصہ سمجھتا ہوں۔ میں اپنی مادرِ وطن کی تقسیم کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔ میں اپنی مادرِ وطن کی بتدریج قطع و برید کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ دُنیا کی کوئی طاقت مجھے کسی بہانے سے بھی اس بات پر آمادہ نہیں کرسکتی کہ مجھے اپنے وطن کے کسی حصے سے محروم کر دیا جائے۔ میں ہمیشہ مسئلہ کشمیر کو ریاست جموں کشمیر کے ساٹھ لاکھ انسانوں کے حقِ خودارادیت کے مسئلے کی بجائے علاقائی تنازعہ قرار دینے والوں کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ میں اپنے آخری سانس تک ''کشمیر کشمیریوں کا ہے'' کا نعرہ بلند کرتا رہوں گا۔

میں کشمیریوں کے اس پیدائشی حق پر یقین رکھتا ہوں کہ انہیں اپنے وطن کو بھارتی تسلط سے آزاد کرانے کے لئے مسلح جدوجہد کا حق حاصل ہے۔ میں اقوامِ متحدہ کی کسی ایسی قرارداد کو تسلیم نہیں کرتا جو اس حق کی نفی کرتی ہو۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ کشمیریوں کو اپنی تحریکِ مزاحمت کو کامیاب بنانے کے لئے پاکستانی عوام اور دُنیا کے دیگر آزادی پسند عوام کی حمایت کی ضرورت ہے۔ ان جیالے کشمیریوں کے لئے میرے دِل میں عزت و

عدالتی بیان

(آتشِ چنار)

جنابِ والا!

میرا عدالت کے کٹہرے میں آج کھڑا ہونا بے سبب نہیں ہے۔ میرا اصل جُرم یہ ہے کہ میں اپنے وطن کشمیر سے محبت کرتا ہوں۔ اس مُلک میں کچھ مفاد پرست عناصر ایسے بھی ہیں جو آزادیٔ کشمیر کے سخت مخالف ہیں۔ یہ بات اِن عناصر کے مفاد میں ہے کہ کشمیر ہمیشہ کے لئے بھارتی تسلّط میں رہے۔ حدِ متارکہ جنگ کے اس طرف اسلام آباد کی وزارتِ اُمورِ کشمیر کو (جو کہ پاکستان کی بیوروکریسی کی نمائندہ مظہر ہے) میں کشمیریوں کی آزادی کی دشمن نمبر ایک سمجھتا ہوں۔ اس وزارت نے ماضی میں اب تک جو کردار ادا کیا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس نے قدم قدم پر تحریک آزادیٔ کشمیر کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور اس تحریک کو ختم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اپنی سیاسی زندگی کے دوران بالعموم اور آزاد کشمیر کی سٹیٹ کونسل کے رُکن کی حیثیت سے بالخصوص میں نے افسر شاہی کے اس ادارے کے منفی کردار کو طشت از بام کرنے اور تحریک حریّت کو مزید کوئی زک پہنچانے سے باز رکھنے کے لئے حتی المقدور کوشش کی ہے۔ یہ انہی کوششوں کا ثمر ہے کہ آج میں انتہائی گھناؤنے الزامات میں اس عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوں۔ میں اس معزز عدالت کے سامنے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میں پاکستان کا دشمن نہیں۔ جیسا کہ استغاثہ نے ال لگایا ہے۔ پاکستان کے عوام کے لئے میرے دِل میں محبت اور احترام کے سوا کچھ

تجویزیں پُر زور دلائل کے ساتھ پیش کی تھیں۔

لون صاحب کا شمار جموں کشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر پاکستان) کے بانی اراکین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی کاروباری مصروفیات کے باوجود اس تنظیم کی کوششوں میں ہمیشہ بھرپور حصّہ لیا ہے۔ ریاست جمّوں کشمیر کی وحدت وسالمیت اس کی آزادی اور اس کے عوم کی خوشحالی کے لئے جدوجہد کرنا ان کا جزِو ایمان رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے شاہی قلعہ لاہور میں شدید اذیتیں جھیلنے کے بعد بھی عدالت عالیہ کو جو تحریری بیان پیش کیا ہے۔ اُس کے آخری الفاظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ”اگر ریاست کی وحدت وسالمیت کو بحال کرنے اور اُس کو آزاد کرانے کی جدوجہد ایک سنگین جُرم ہے تو میں قرار واقعی مُجرم ہوں اور اگر اس جرم کی سزا تختہ دار ہے تو میں خوشی سے دار پر چڑھنے کے لئے تیار ہوں“۔

بُجھنے کی دِل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

”لون صاحب کی یہ ثابت قدمی حریّت پسند کشمیریوں کے لئے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشن مشعل کا کام دے سکتی ہے اور کڑی سے کڑی آزمائشوں کے طوفانوں میں بھی ان کے صبرواستقلال کی مثال اُنہیں سہارا دے سکتی ہے۔“ (آتشِ چنار، صفحہ 7)

جی ایم لون کے عدالتی بیان کا حصہ اوّل اُن کے حالات زندگی پر مشتمل تھا جس کا خلاصہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اِس بیان کا حصہ دوم من وعن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔۔۔۔

گیر خانہ تلاشیوں کے نتیجے میں بھی پولیس کو کوئی ایسا مواد نہ ملا جس سے ہمارے خلاف الزامات کو تقویت ملتی۔ چنانچہ الزامات کو ''ثابت'' کرنے کا واحد ذریعہ پولیس کے پاس تشدد ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس ذریعہ کو پولیس نے کمال چابکدستی اور مہارت سے استعمال کیا۔ ہم لوگ سخت جان تھے کہ اس صبر آزما اور جان لیوا امتحان میں سے زندہ وسلامت نکل آئے لیکن اس انسانیت سوز تعذیب و تشدد اور بلیک میلنگ کے اثرات ہمارے جسموں اور دل و دماغ پر تادیر قائم رہیں گے۔

میں اس موقعہ پر فاضل عدالت کے نوٹس میں وہ واقعات تفصیلاً لانا چاہتا ہوں جو 28 اپریل 1971ء کے بعد میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ پیش آئے جن کے نتیجے میں پولیس میرے چند قابلِ قدر ساتھیوں سے جھوٹے ''اقبالی بیانات'' حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اگرچہ ان اقبالی بیانات کی قلعی اس عدالت میں اچھی طرح کھل چکی ہے اور پولیس نے ہمارے ایک عزیز ساتھی کو سلطانی گواہ بنانے کے لئے جو مذموم ہتھکنڈے استعمال کئے تھے۔ ان سے بھی کسی حد تک پردہ اُٹھ چکا ہے۔

میری گرفتاری 28 اپریل 1971ء کو علی الصبح عمل میں آئی۔ صبح کے پانچ بجے ڈی۔ ایس۔ پی ظہور خاں معہ دیگر بارہ افسران کے میرے سونے کے کمرے میں گھس آیا۔ میری بیوی کو جلدی میں اپنی بچی کے پلنگ کی چادر سے سر ڈھانپنا پڑا۔ مجھے بستر سے اُٹھتے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے بغیر کوئی وارنٹ دکھائے حراست میں لے لیا۔ کسی لیڈی کانسٹیبل کی غیر موجودگی میں گھر کی خواتین سے تلاشی لی گئی۔ میری بہن اور اُسکی جواں سال بیٹی کو بھی جو گھر میں موجود تھیں، بے پردہ کر کے تلاشی لی گئی۔ میری بہن کے دیور اور بیٹے کو بھی جو مقبوضہ کشمیر سے پاسپورٹ پر آئے ہوئے تھے، حراست میں لے لیا گیا تھا۔ یہ وہ افراد تھے جنہوں نے کشمیر میں پولیٹیکل کانفرنس کی زیرِ قیادت پاکستان کے لئے جیلیں کاٹی تھیں اور جنہوں نے حسینی والا باڈر سے پاکستانی علاقے میں داخل ہوتے وقت اس ارضِ پاک کی مٹی کو اپنے ہاتھ میں لے کر چوما تھا۔ گرفتاری کے بعد میری ان عزیزوں سے بھی

بھی نہیں ہے۔ بہرحال بیوروکریسی اوران مفاد پرست عناصر کو جنہوں نے اِس مُلک کے عوام کا خون چُوسا ہے، پاکستان کا نام نہیں دے سکتا۔ میرے لئے پاکستان کا تصور بہت مقدس ہے اوران عناصر کو پاکستان کا نام دے کر میں اس تصور کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔

میں یحییٰ خانی ٹولے کے دورِ آمریت کی کوتاہ نگاہی کا شکار ہوا ہوں۔ یحییٰ خاں نے جموں کشمیر کی آزادی کی مسلح جدوجہد کی تحریک کو اس لئے کُچل دینا چاہا کہ اُسے اس تحریک میں اپنی آمریت کی تباہی کا عنوان نظر آیا۔ محض یہی وجہ تھی کہ اس نے کشمیریوں کی مسلح جنگِ آزادی کو ختم کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ صرف تاریخ ہی بتا سکے گی کہ یحییٰ خاں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا.................

جناب والا!

اس معزز عدالت کے سامنے مجھے اور میرے محبِ وطن ساتھیوں کے خلاف جو جھوٹا مقدمہ زیرِ سماعت ہے اور جو بے بنیاد اور گھناؤنے الزامات ہم لوگوں پر لگائے گئے ہیں، اُن کا پسِ منظر پولیس کی حراست میں دورانِ تفتیش اور بعد میں آنے والے حالات نے مجھ پر منکشف کیا ہے۔ ہر گزرنے والا دن یحییٰ خاں اور اُن کی فوجی جنتا کی غداریوں، سیاہ کاریوں اور ہوسِ اقتدار کو تسکین دینے کے لئے ان کی گوناگوں سازشوں کا پردہ چاک کرتا جا رہا ہے۔ وہ دن جلد آنے والا ہے جب سارے رازہائے دورونِ پردہ عوام کے سامنے آجائیں گے اور پھر دُنیا دیکھ لے گی کہ ایک آمرِ مطلق نے محض اپنی حکمرانی کو دوام بخشنے کے لئے کن کن ذلیل ہتھکنڈوں سے کام لیا۔

جناب والا!

قومی محاذِ آزادی اور محاذ رائے شماری کے کارکنوں کے خلاف ملک گیر پیمانے پر گرفتاریوں، خانہ تلاشیوں اور اس کے انسانیت سوز تشدّد کا کوئی جواز نہ تھا۔ اس سارے کیس کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی گئی ہے۔ حکومت کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ تھا۔ 28 اپریل 1971ء کی ملک

کشمیر کے موقف کو اور کشمیر میں پاکستان کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنی اور اپنی جماعت کی طرف سے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ لیکن بجائے اس کے کہ یہ کوتاہ اندیش دبے ضمیر پولیس افسران میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے اطہر ڈی۔ آئی۔ جی چند رکیک گالیاں بک کر وہاں سے چلا گیا۔ اور یہاں سے مجھ پر ظلم و ستم کی ابتداء ہو گئی۔ مجھے مستقلاً ایک سب انسپکٹر یا اسسٹنٹ سب انسپکٹر، ایک حوالدار، ایک سپاہی، ایک مسلح گارڈ کی حراست میں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ ہر چار گھنٹہ کے بعد عملہ بدل دیا جاتا۔ ہر نیا عملہ آ کر مجھ سے بیان لکھواتا اور اس طرح مجھے جگائے رکھا جاتا۔

میری گرفتاری کے دوسرے دن مجھے کمرہ استقبالیہ سے ایک دوسرے کمرے میں جو کہ ایک زمانہ میں صدر تھانہ کا حوالات ہوتا تھا، منتقل کیا گیا۔ شام کو مجھے ایس۔ پی آغا سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے مجھے مارشل لاء ریگولیشن 78 کے تحت نظر بندی کا حکم دکھایا۔ پہلے دس بارہ روز گھر سے کھانا اور تھوڑا بہت بستر منگوانے کی اجازت دی گئی تھی۔ لیکن بعد میں یہ رعایت ختم کر دی گئی۔ حتیٰ کہ میں نے جو قالین کی جائے نماز گھر سے منگائی تھی، وہ بھی پولیس افسران کے حکم پر واپس بھیجنی پڑی۔ آٹھ روز مسلسل جگائے رکھنے کے بعد جب مجھے پہلی بار تھوڑی دیر سونے کی اجازت ملی تو لکڑی کا بنچ یا سیمنٹ کا فرش میرا بچھونا تھا۔

ایک دفعہ ایس۔ پی آغا سلطان، ڈی۔ ایس۔ پی وحید کے ساتھ میرے کمرے میں آیا اور پوچھ گچھ کرتا رہا۔ جب میں نے اس کو بتایا کہ میں نے چیف سیکرٹری پنجاب افضل آغا سے کہا تھا کہ اگر آپ جہاز واپس بھیجنا چاہتے ہیں تو مقبول احمد بٹ سے کہہ دیں وہ اخباری بیان جاری کریں گے۔ آغا سلطان نے یہ بات سُنی تو بولے کے وحید صاحب کو جو بیان تم نے دیا ہے اس میں یہ بات کیوں نہ لکھی۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی وحید سے اس واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ بڑے افسر کا نام بیچ میں گھسیٹنے کی ضرورت نہیں ہے اور ویسے بھی یہ غیر متعلقہ بات

ملاقات تک نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ وہ واپس چلے گئے۔

میرے گھر اور دکان کی تلاشی کے بعد مجھے کراچی سی۔ آئی۔ اے کے دفتر پہنچایا گیا، جہاں مجھے اسپیشل پولیس کے سپرنٹنڈنٹ آغا سلطان کی تحویل میں دیا گیا۔ سی۔ آئی۔ اے دفتر پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ ہماری جماعت کے کچھ ارکان کو مجھ سے پہلے ہی گرفتار کر کے لایا گیا تھا اور کچھ لائے جا رہے تھے۔ گرفتار شدگان میں میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، میر ہدایت اللہ، خواجہ محمد صدیق بابا، خواجہ غلام محی الدین بانکا، محمد مقبول نائیک، خواجہ محمد یوسف قریشی اور کئی دیگر ارکان شامل تھے، جن میں سے پندرہ، سولہ سال کے دو تین بچے بھی تھے۔ سی۔ آئی۔ اے دفتر میں مجھے ایس۔ پی آغا سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجھے خیال نہ رہا اور میں پہلے سے سلگایا ہوا سگریٹ پیتا رہا۔ میری یہ جسارت آغا سلطان کی افسرانہ شان کے خلاف تھی۔ چنانچہ دفتر میں داخل ہوتے ہی میری ''تواضع'' شروع ہو گئی اور میرے پاس جتنے بھی سگریٹ تھے، ضبط کر لئے گئے۔

ایس۔ پی آغا سلطان کے حکم پر کمرہ استقبالیہ میں مجھے ایک 9،10 انچ چوڑے لکڑی کے بنچ پر بٹھایا گیا۔ رات کے کوئی 10،11 بجے مسٹر اطہر ڈی۔ آئی۔ جی اور ایس۔ پی آغا سلطان ماتحت عملے کے کئی افراد کے ہمراہ میرے پاس آئے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد میں نے ان سے کہا کہ اگر حکومت حقائق کی تلاش میں تھی تو پھر نورالعارفین کمیشن کی رپورٹ میں اخذ کیے گئے نتائج غلط اور بے بنیاد تھے۔ صرف شیخ صاحب کے خط کو ان کے مخصوص حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے رپورٹ کی بنیاد بنانا اور تحقیقات کے وقت ماسوائے چند افراد کے باقی تمام افراد کو نظر انداز کرنا سراسر ناانصافی تھی جیسا کہ اس وقت عام طور پر تاثر تھا کہ نورالعارفین کمیشن رپورٹ مشرقی پاکستان میں مخصوص حالات کے زیرِ اثر یحییٰ حکومت کے کہنے پر تیار کی گئی تھی۔ میں نے مسٹر اطہر ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا کہ اگر بین الاقوامی تقاضوں کے تحت پاکستان کے مفاد کی خاطر بھارت کو بدنام کرنا اور شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری کے لئے جواز پیدا کرنا ہی مقصود تھا تو اس معاملہ کو اس طرح حل کیا جانا چاہیے تھا کہ

کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس پر اُس نے میرے مرشد کے نام گالیاں دیں۔ کیونکہ اس کی نظر میں میرا مرشد کشمیری ہونے کی بناء پر غدار اور فاسق تھا۔ مسٹر اطہر نے مجھے بتایا کہ میرے خواجہ غلام نبی گلگار کے ساتھ تعلقات کے بنا پر وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ میں قادیانی تھا۔ اس کا جواب میں نے دیا کہ خواجہ غلام نبی گلکار تو آزادیٔ کشمیر کی تحریک کے ان اوّلین بانیوں میں سے ہیں جنہوں نے شیرِ کشمیر اور چوہدری غلام عباس کے ساتھ مل کر تحریک آزادی شروع کی تھی۔ اس شخص کی دیانت اور حب الوطنی کا اعتراف اس کے سیاسی مخالفین کو بھی ہے۔ ان کو کشمیر کی سیاسی تحریک کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وہ آزاد کشمیر کے پہلے صدر تھے جنہوں نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف بغاوت کر کے ایک متوازی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اور صدر انور کے نام سے مشہور تھے۔ میں نے مسٹر اطہر سے مزید کہا کہ ہمارے سیاسی تعلقات کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمارے دینی عقائد پر اثر انداز ہوں بلکہ سیاسی طور پر وہ خودمختار کشمیر کے علمبردار تھے۔ لیکن محاذ میں شامل ہو کر ہم نے ان پر خودمختار کشمیر کے لئے تبلیغ کرنے پر پابندی لگا دی تھی جو انہوں نے قبول کر لی تھی۔ اس پر مسٹر اطہر نے بتایا کہ ''اُس کو گرفتار کر کے تشدّد کر کے ہلاک کر دیا گیا ہے تا کہ خودمختار کشمیر کے جراثیم ہی پاکستان سے ختم کیے جائیں''۔ مسٹر اطہر نے کہا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ مارشل لاء لگا ہوا ہے اور جو بھی حکومت چاہے کر سکتی ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جناب گلکار سے متعلق اطہر کی کہانی جھوٹی تھی وہ اب بھی خدا کے فضل و کرم سے راولپنڈی میں اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہیں☆۔ میں نے مسٹر اطہر کو یہ بھی کہا کہ اگر محاذ رائے شماری میں گلکار صاحب کی شمولیت کے معنی محاذ کا قادیانی جماعت بننے کے مترادف ہے تو پھر اس وقت پاکستان پر حکومت بھی تو قادیانی کی ہے کیونکہ ایم۔ ایم۔ احمد، جنرل یحیٰی خاں کی حکومت کے ایک اہم ستون تھے۔ ان الفاظ سے اطہر آگ بگولا ہو گئے اور مجھ پر لاتوں، مکّوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

جب مجھے اذان ہونے پر اُوپر اُٹھنے کی اجازت مل گئی تو میں نے دیکھا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

☆غلام نبی گلکار 1973ء کو فوت ہوئے

ہے۔ آغا سلطان نے یہ کہہ کر ''یہ واقعہ بالکل متعلقہ ہے'' مجھے حکم دیا کہ میں خود اپنے ہاتھ سے مکمل بیان لکھوں۔ ان ایام میں مجھے پھر مسلسل جگایا جارہا تھا۔ میں نے آغا سلطان سے کہا کہ تھوڑی بہت نیند کئے بغیر میرے لئے بیان لکھنا ممکن نہ ہوگا۔ اس لئے تھوڑا بہت آرام کرنے کی اجازت دے دی جائے لیکن اس نے انکار کیا اور حکم دیا کہ بیان مکمل ہونے تک مجھے بالکل نہ سونے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے اس حالت میں تقریباً 90 صفحوں کا ایک بیان تین دن میں لکھ دیا۔ اس بیان میں کیا ترتیب ہے مجھے اب یاد نہیں۔

ایک روز مجھے سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں بلایا گیا جہاں مسٹر اطہر ڈی۔ آئی۔ جی موجود تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اطہر نے گالیاں دینا شروع کیں اور کہنے لگا کہ مقبول بٹ اور ڈاکٹر فاروق نے اعتراف گناہ کرلیا ہے اور تم کو بھی پھنسایا ہے۔ اب ہمیں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ میں نے کہا اگر انہوں نے مجھ پر کوئی الزام لگایا ہے تو ان کو میرے سامنے لایا جائے۔ اس پر مسٹر اطہر آگ بگولا ہوگیا اور گالیوں کی بوچھاڑ میں کہا ''ان کو یہاں کیوں لائیں گے تم کو ہی وہاں لے جائیں گے''۔ اس کے بعد اسی نے کھڑکیاں اور دروازے بند کروائے اور مجھے ایس۔ پی آغا سلطان اور ڈی۔ ایس۔ پی وحید، شوکت، عبدالخالق اور وصی کے سامنے مرغا بنوایا اور سپاہی کو مجھے مارنے کا حکم دیا۔ میری کمر پر ایک بہت بڑا سیمنٹ کا بلاک رکھا گیا اور پھر چھتر نامی ایک چمڑے کی چیز سے مارا گیا۔ اطہر نے بذاتِ خود مجھے لاتیں ماریں اور گھونسے مارے جس دوران مجھے مارا جارہا تھا میں ''یارسول اللہ انظر حالنا یا حبیب اللہ اسمع قالنا '' پکارتا جارہا تھا۔ غالباً میرے خدا نے میری فریاد سُن لی کہ نزدیک کی مسجد سے جمعہ کی اذان ہوگئی اور مجھے اس عذاب سے نجات مل گئی۔

متذکرہ تشدّد کے دوران مسٹر اطہر نے مجھ سے پوچھا کہ میں کب سے قادیانی ہوگیا تھا۔ جس کا جواب میں نے دیا کہ میں قادیانی مذہب سے کیسے تعلق رکھ سکتا ہوں جب کہ میں نے اہلِ صفا

اس کو کہا کہ اس مسئلہ پر میں نے آج تک سوچا ہی نہیں البتہ میں نے مولانا حسرت موہانی کو ہمیشہ بہت پسند کیا، لاشعوری طور پر وہی آئیڈیل ہے۔ اس پر وحید صاحب کا ردِعمل عجیب تھا۔ فرمانے لگے کہ اب میں سمجھ گیا کہ تم اشتراکی بھی ہو اور تخریب پسند بھی، ساتھ میں چند غلیظ گالیاں بھی عنایت فرمائیں۔ مسٹر وحید جب مجھے آغا سلطان کی غیر موجودگی میں بلاتا تھا تو متعلقہ تفتیش کے علاوہ وہ سیاست پر بات چیت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے اس کی غیر منطقی اور مہمل بحث سے تنگ آ کر اس کو ایک دفعہ کہہ دیا کہ بہتر ہے کہ ہم سیاست پر بات نہ کریں، پھر کیا تھا وحید صاحب نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور مجھے گالیاں دینے لگے اور مجھ پر متعین سب انسپکٹر کو یہ حکم دیا کہ میری "خبر لی جائے" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ ایک چیز جو میرے لئے زیادہ مصیبت بنی ہوئی تھی وہ میری فارغ البالی تھی۔ اس کا ذکر ڈی۔ ایس۔ پی وحید، ایس۔ پی قمر عالم اور مسٹر اطہر نے بھی تشدد کرتے وقت بار بار کیا۔ میں نے مسٹر اطہر کو ایک دفعہ تنگ آ کر یہ بھی کہا تھا کہ اگر حکومت کو میری خوشحالی پسند نہیں ہے تو میں آج سارا اثاثہ حکومت کے نام لکھنے کو تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں پھر اپنے دست و بازو سے دولت پیدا کر سکتا ہوں، کیونکہ میں محنت و مشقت کرنا اور حلال کی دولت پیدا کرنا جانتا ہوں۔ قلعہ میں اسیری کے دوران مجھے کئی بار یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی گئی کہ حکومت میری اور میر قیوم کی جائیداد اور کاروبار کو ضبط کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ لیکن ان کوڑ مغزوں کو علم نہ تھا کہ اگر میں نے دولت کی اپنی منزل سمجھا ہوتا تو دوسرے سرمایہ داروں کی طرح قوم کی آزادی کے لئے جدوجہد کے پُرخار دشت میں کبھی قدم نہ رکھتا اور موجودہ دولت سے چار چھ گنا زیادہ سرمایہ کا مالک ہوتا۔

کراچی سی۔ آئی۔ اے میں جو برتاؤ اور تشدد میرے ساتھ کیا گیا اس وقت مجھے وہ بہت زیادہ اور غیر انسانی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن قلعہ میں آ کر میں نے محسوس کیا کہ وہاں تفتیش کنندگان قلعہ کے بے رحم، سنگدل اور خون کے پیاسے بھیڑیوں کے مقابلہ میں فرشتہ خصلت لوگ ہیں۔

کراچی میں سی۔ آئی۔ اے پولیس دفتر میں گرفتاری کے دوران ہمیں 15-20 دن کے

وصی مجھ سے زیادہ پسینہ میں شرابور تھا۔ ایسے جیسے کہ وہ کپڑوں سمیت پانی میں غوطہ لگا کر آ گیا تھا۔ میرا بیان قلمبند کرنے کے بعد مسٹر وصی سے اسلام تصوّف اور حجِ بیت اللہ پر کچھ گفتگو بھی ہوئی تھی۔ اس کو میں نے اسلام سے محبت رکھنے والا مسلمان اور عاشقِ رسولؐ پایا۔ وہ میرے ساتھ باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے مجھے سورۃ یوسف کی آیت کریمہ "واللہ المستعان علی ما تصفون" کا ورد کرنے کو کہا۔ تشدّد کے بعد مسٹر اطہر نے میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگانے کا حکم دیا۔ جب مجھے اپنے کمرہ میں لے گئے۔ تشدّد کی اذیت کی وجہ سے میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میں مشکل سے قدم اٹھا سکتا تھا۔

اس کے بعد میں کئی دن تک اچھی طرح سے نماز ادا نہ کر سکا۔ چھتروں کی مار کی وجہ سے میرے اعصاب متاثر ہو گئے تھے۔ میں رکوع میں جا ہی نہیں سکتا تھا اور سجدے کے لئے آہستہ اُترنے کی بجائے مجھے جسم کو گرانا پڑتا تھا۔ میں فرشِ پر درد کی وجہ سے اچھی طرح بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر چند منٹوں کے بعد پہلو بدلنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی باندھ کر رکھی گئی تھی۔ صِرف وضو اور نماز کے لئے ایک ہاتھ کی ہتھکڑی کھول دی جاتی اور ہتھکڑی میرے ایک ہاتھ سے نماز کے دوران لٹکتی رہتی۔

مجھے کئی بار ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی نے دفتر میں تفتیش کے لئے بلایا۔ مجھے تفتیش کے موقعوں پر یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ اس بدقسمت ملک کے سیاہ وسفید کے مالک یہ افسران ملک کی سیاست سے عموماً اور پاکستان کے کشمیر سے متعلق موءقف سے بالخصوص نابلد تھے۔ ان کو اقوامِ متحدہ کے سامنے کشمیر سے متعلق پاکستان کے موءقف کا بھی بالکل علم نہیں تھا۔ وہ مجھ سے آزاد کشمیر کے متعلق اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے آزاد کشمیر پاکستان کا کوئی مفتوحہ علاقہ ہو۔

مسٹر وحید ڈی۔ ایس۔ پی نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا کہ سیاست میں میرا آئیڈیل کون ہے۔ وہ غالباً سمجھتا تھا کہ میں قائدِ اعظمؒ یا شیخ محمد عبداللہ کا نام لوں گا۔ لیکن وہ چونک گیا جب میں نے

ہے۔ اُس نے ایک پن اِس پن کش سے نکال کر ہاتھ میں رکھ لی اور مجھے تھوڑی دیر کے بعد چبھوتا رہا۔ میرے بیان کے دوران جب میں اپنے والد کے انتقال کے واقعہ پر پہنچا تو قمر عالم نے ''خس کم جہاں پاک'' کا فقرہ چست کیا۔ دو گھنٹے کے سوال و جواب کے بعد قمر عالم نے مجھے حکم دیا کہ میں سیل میں واپس جا کر بیان تحریر کردوں اور چھ بجے تک مکمل کرلوں۔ ساتھ ہی اس قلعہ کے عملے کو حکم دیا کہ چھ بجے مجھ پر اوپریشن نمبر 3 کا عمل کیا جائے۔

سیل میں بند ہونے کے تھوڑی دیر بعد مجھے کاغذ قلم دیا گیا چونکہ آتے وقت مجھ سے میرا چشمہ چھین لیا گیا تھا۔ اس لئے میں جلد ہی بیان لکھنا شروع نہ کرسکا۔ میں نے چشمہ مانگا جو کہ میرے کپڑوں کے ساتھ کہیں بند رکھا گیا تھا۔ تین بجے سے لے کر 6 بجے تک میں بیان لکھتا رہا۔ لیکن کمزوری، نقاہت اور گرمی کی وجہ سے بیان مکمل نہ کرسکا۔ پورے چھ بجے لائن آفیسر تاج دو تین اور سپاہیوں کے ساتھ آیا اور مجھ سے بیان مانگا۔ میں نے کہا کہ ایک تو آپ نے مجھے چشمہ تین بجے دیا تھا اس لئے مجھے ایک گھنٹہ کی مہلت ملنی چاہیے۔ دوم میرا بیان اتنا لمبا ہے کہ میں اس کو اتنی جلدی ختم نہیں کرسکتا۔ اس نے کہا ہم کو جتنے وقت کی اجازت ہے۔ اتنے وقت سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے۔ چنانچہ مجھ سے نامکمل بیان لیا گیا اور مجھے سیل کے دروازے کے پاس بلایا گیا۔ مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنی پیٹھ باہر کی طرف اور مُنہ اندر کی طرف کرلوں۔ اس کے بعد مجھ سے بازو اوپر کرا کر مجھے ہتھکڑی اور اس کی زنجیر سے دروازہ کے ساتھ اس طرح جکڑ دیا گیا کہ میرے پاؤں کے پنجے زمین پر ٹکتے تھے اور ایڑیاں اوپر رہتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈھائی تین فٹ بانس کا ڈنڈا (جس پر سائیکل کا ٹیوب چڑھایا گیا تھا) میری گردن کے پیچھے دیا گیا اور مجھے ایک دو تین چار کی گنتی کا حکم دیا گیا۔ مسلح سپاہی جو گارڈ پر وہاں کھڑا تھا۔ اس کو حکم دیا گیا کہ مجھ سے گنتی کرائے اور مجھے سونے نہ دے۔ میں نے گنتی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بدلے نامِ الٰہی اور نامِ رسول ﷺ لیتا رہا۔ گرمی سے میں پسینہ سے شرابور تھا۔ ہر دو تین منٹ کے بعد مجھے پیاس لگتی تھی اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں پانی

بعد نہانے کی اجازت دی جاتی۔ دو دو ہفتے داڑھی بڑھ جاتی۔ صرف نہاتے وقت کپڑے بدلنے کی اجازت دی جاتی جس سے ہمارے بدن اور کپڑوں میں بوجہ گرمی اور پسینہ بدبو پیدا ہو گئی تھی۔

16 یا 17 جون کی صبح کو ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور تین مسلح سپاہیوں کی معیت میں مجھے پاکستان ایکسپریس کے تیسرے درجے کے ذریعہ لاہور لایا گیا۔ مجھے ریلوے اسٹاف کے ڈبے میں بٹھا دیا گیا اور میری ہتھکڑی جو میرے دونوں ہاتھوں میں پہنائی ہوئی تھی، کو[…] کے ساتھ باندھا گیا۔ کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے گئے۔ جس وقت مجھے کراچی سے نکالا گیا میری تلاشی لی گئی۔ میری جیب میں ایک روپیہ پڑا ہوا تھا وہ بھی مجھ سے چھین لیا گیا۔ کراچی سے لاہور تک مجھے بغیر آب و دانہ کے بھوکا پیاسا لایا گیا۔ میں نے ٹرین میں بیت الخلاء میں وضو کرنے کے دوران پانی پی پی کر پیاس بجھائی۔

کراچی سے چلنے کی دوسری صبح مجھے لاہور کے شاہی قلعہ میں پہنچایا گیا۔ قلعہ میں آتے وقت میرے ساتھ آئے ہوئے اے۔ ایس۔ آئی کے ہاتھ میں میں نے ایک بند لفافہ دیکھا تھا۔ [جو] ایس۔ پی قمر عالم کے نام تھا۔ اس طرح سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے قمر عالم کی سپردگی میں دیا گیا ہے۔ قلعہ میں پہنچتے ہی میرے ساتھ تضحیک آمیز سلوک کیا گیا۔ میرے سر سے ٹوپی اتار کر نیچے پھینک دی گئی اور مجھے کھڑا رکھا گیا۔ میری تلاشی لے کر مجھ سے میرا مختصر سامان لے لیا گیا۔ صرف مجھے ایک تولیہ اور پلاسٹک کا ایک لوٹا ساتھ رکھنے کی اجازت دی گئی اور مجھے نمبر 5 سیل میں بند کر دیا گیا۔

تقریباً 12 بجے مجھے سیل سے نکال کر سپرنٹنڈنٹ پولیس قمر عالم کے سامنے پیش کیا گیا۔ [قمر] عالم نے مجھے کھڑا رکھ کر سوالات شروع کئے۔ میرے بیان کے دوران بیچ بیچ میں قمر عالم گندی گالیاں دیتا رہا اور تضحیک آمیز فقرے کہتا رہا اور بیچ بیچ میں مجھ پر تھوکتا رہا۔ اس دوران ایک دفعہ محمد خان نا[می] سپاہی دفتر میں آیا تو قمر عالم نے اسے کہا کیسے آئے ہو۔ اس نے پیپر پنوں کی ضرورت کا اظہار کیا۔ قمر عالم نے اس کی طرف پن کشن بڑھاتے ہوئے کہا کہ لے جاؤ۔ مجھے صرف ایک پن کی ضرور[ت]

اور میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے حکم دیا گیا میں ایک گھنٹہ ستالوں کیونکہ مجھے 8 بجے ایس۔ پی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ ایک ٹین کے میلے گلاس میں جس میں ایک طرف سوراخ تھا۔ مجھے ایک پیالی چائے کے نام سے مشروب اور ایک رس دیا گیا۔ کراچی سے چلنے کے بعد مجھے یہ پہلی دفعہ کھانے کو مل رہا تھا۔

8 بجے صبح مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ جو تشدد کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے۔ یہاں پر ایس۔ پی قمر عالم موجود تھا۔ اس نے قلعہ کے ظالم انچارج درانی کو حکم دیا کہ "میرے گوریلوں کو بلاؤ"۔ چنانچہ دس بارہ آدمی لائے گئے۔ جنہوں نے آتے ساتھ ہی میرے کپڑے زبردستی اتارے اور مجھے مادرزاد ننگا کر دیا۔ اس زبردستی کپڑے اتارنے کے عمل میں میرا کرتہ بھی پھٹ گیا۔ قمر عالم نے مجھے اپنے سامنے ننگا رہنے کا حکم دیا اور خود میرا رات کا لکھا ہوا بیان پڑھنے لگا۔ ایک آدھ سطر پڑھنے کے بعد ڈی۔ ایس۔ پی مختار کو دیا اور اس کو پڑھنے کے لئے کہا۔ وہ پڑھتا جاتا تھا اور قمر عالم موٹی موٹی گالیوں سے بھرپور ساتھ ساتھ رننگ کمینٹری کرتا جاتا تھا۔ اور میرے بدن پر تھوکتا بھی جاتا تھا۔ بیان سننے کے بعد قمر عالم نے کہا کہ یہ داستان ہم پہلے بھی سُن چکے ہیں ہمیں کوئی نئی بات سُننی ہے۔ اس لئے یہ بیان اس کے مُنہ میں ٹھونس دو۔ چنانچہ اس نے وہ بیان ڈی۔ ایس۔ پی مختار سے چھین کر میری طرف پھینک دیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس بیان کو کھا جاؤں۔ جب میں نے کچھ ہچکچاہٹ سے کام لیا تو سپاہیوں نے میرا منہ کھول دیا اور کاغذ میرے منہ میں ٹھونسنے لگے جو مجھے چبانے پڑے۔ اس کے بعد وہاں موجود سپاہیوں کو (جن کو قمر عالم گوریلا کے نام سے پکارتا تھا) حکم دیا کہ مجھ پر آپریشن کیا جائے۔ چنانچہ دس بارہ سپاہی بیک وقت مجھ پر پل پڑے۔ کسی کے ہاتھ میں ٹیبل ٹینس کھیلنے والی ریکٹ کی شکل میں چمڑے کی بنی ہوئی چیز تھی۔ جس کو وہ چھتر کہتے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ٹائر کا ایک لمبا ٹکڑا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں سائیکل ٹیوب کا ربڑ چڑھا ہوا ڈنڈا تھا۔ جس کے ہاتھ خالی تھے وہ میرے سر کے بال نوچتے یا سینے کے بال توڑنے میں لذّت محسوس کر رہا تھا۔ اس تشدّد

پانی پلاتا۔ جو سپاہی ڈیوٹی پر تھا وہ آ کر ایک گندے ٹین کے گلاس میں پانی لا کر میرے منہ کے ساتھ لگاتا جو کچھ تو میں پیتا تھا اور زیادہ حصہ میرے کپڑوں پر گرتا تھا۔ میری گردن میں گسے ہوئے ڈنڈے کا عذاب اتنا شدید تھا کہ نامِ خدا لینے کے ساتھ میں کراہ بھی رہا تھا۔ اپنی گردن کو کچھ آرام دینے کے لئے جب گردن ہلاتا تو وہ ڈنڈا کبھی کبھی باہر نکل کر نیچے گر پڑتا۔ ڈیوٹی پر متعین سپاہی آ کر ڈنڈا اٹھا کر میری گردن میں گستا اور کہتا کہ کیوں میری شامت لاتے ہو۔ اگر اب ڈنڈا گراؤ گے تو میں افسروں کو بلاؤں گا پھر تمہاری خیر نہیں۔ بہر حال مجھے احساس ہوا کہ اس سپاہی کے سینے میں دل ہے۔ اس لئے اس نے کسی افسر سے شکایت نہ کی اور مجھے پانی پلاتا رہا۔ تین گھنٹے اس طرح ڈنڈا میری گردن اور کھڑے بازوؤں کے درمیان رکھنے کے بعد 9 بجے ڈی۔ ایس۔ پی مختار اور درندہ صفت لائن افسر تاج آیا۔ اس وقت میں پورے ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ لیکن یہ ورد کر رہا تھا "یا رسول اللہ انظر حالنا یا حبیب اللہ اسمع قالنا"۔ آتے ہی لائن افسر نے ڈیوٹی پر متعین پولیس والے کو ڈانٹا اور مجھے گالیاں دیں کہ میں گنتی کیوں نہیں کر رہا۔ ڈی۔ ایس۔ پی مختار نے مجھ سے پوچھا یہ کیا کشمیری میں گا رہے ہو یا ہم کو گالیاں دے رہے ہو۔ میں نے نحیف آواز میں جواب دیا کہ یہ ورد خواجہ معین الدین چشتی "داتا دربار کے قیام کے دوران کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد ڈی۔ ایس۔ پی مختار نے میری گردن میں اٹکایا ہوا ڈنڈا نکال دیا اور میری گردن ایک طرف لٹک گئی۔ اس پر اس نے وزنی گالی دیتے ہوئے کہا کہ "اداکاری کرتے ہو" اس طرح تین گھنٹے کی اس اذیت سے مجھے تھوڑا سا آرام ملا لیکن مجھے ہتھکڑی سے دروازے کے ساتھ جکڑ کر رات بھر لٹکائے رکھا۔ جب 9 بجے میری گردن سے ڈنڈا نکالنے کے لئے ڈی۔ ایس۔ پی مختار آیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کم از کم مجھے نماز کے لئے کھول دیا جائے۔ جس پر اس نے کہا اسلام میں بحالت مجبوری اشاروں سے بھی نماز ہو سکتی ہے بلکہ ساتھ ہی کہا کہ اگر پیشاب آئے تو اسی طرح لٹکتی حالت میں کپڑوں میں ہی کرنا۔ دوسرے دن صبح سات بجے مجھے جب کھولا گیا تو میں نیچے گر پڑا۔ میرے بازو شل ہو چکے تھے

دوسری طرف ہٹتا تو دوسرا سپاہی اس طرف سے مجھے مارتا۔ فٹ بال کی طرح مجھے ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف باری باری مارتے ہوئے دھکیل دیا جاتا اور زدوکوب کیا جاتا۔ میں مادرزاد برہنگی کے عالم میں خدا کے حضور التجا کرتا۔ رب انی مغلوب فانتصر۔ میری التجا پر قمر عالم نے مجھ سے پوچھا یہ کشمیری میں کیا گا رہے ہو۔ میری زبان سے جب "یارسول اللہ" کی آواز نکلتی تو مجھے یہ مسلمان نمایزیدی پولیس والے کہتے کہ میں ننگی حالت میں رسول اللہؐ کا نام لے کر توہین کر رہا ہوں اور مجھے اور بھی زور زور سے مارنے لگتے۔ ایک موقعہ پر قمر عالم جو اس وقت قمیض شلوار میں ملبوس تھا، انسپکٹر درانی کو یہ حکم کر گیا کہ میں عشاء کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ "میں نماز پڑھتے ہوئے اس کی چیخیں سننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ جب تک قمر عالم واپس نہیں آیا مجھ پر تشدد کیا جاتا رہا اور وہ میری چیخوں سے اپنی نماز (اگر اس کو نماز کہیں تو) کو بہلاتا رہا۔ یہی موقع تھا کہ مجھے یقین آیا کہ کربلا میں آلِ محمدؐ کو پیاس سے نڈھال کر کے شہید کرنے والے بھی مسلمان ناموں سے موسوم تھے۔ ایک موقعہ پر بجلی بند ہوگئی تو مجھے قمر عالم نے کہا "بھاگ جاؤ بھاگ جاؤ اور سپاہی کو کہا کہ اس کو پیچھے سے گولی مار دو۔" میں برہنہ تھا، میں کیسے بھاگ سکتا تھا۔ اگر برہنہ نہ بھی ہوتا تو قلعہ کی بلند دیواروں اور خونخوار محافظوں کو چھوڑ کر میں اپنے اوپر درجن بھر تشدد کرنے والے درندوں سے کیسے بچ کر نکل سکتا تھا اور مجھے یہ بھی اگر یقین ہوتا کہ یہ مجھے گولی مار دیں گے تو اُس وقت میں موت کو ترجیح دیتا۔ لیکن مجھے قمر عالم کی عیاری اور مکاری سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا مقصد مجھے گولی مار کر ہلاک کرنا نہیں بلکہ اپنا کوئی مذموم مقصد پورا کرنا ہے۔ پھر بھی میں نے کہہ دیا کہ مجھے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ گولی چلا دیں، آپ بعد میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد بجلی آ گئی تو سپاہی کو کہنے لگا "بیوقوف اگر تم نے اس بندوق سے گولی چلائی ہوتی تو ہم سب مارے جاتے۔ یہ تو 12 بور کی رائفل ہے۔ اس کو 3/3 سے گولی مارنی تھی"۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ یہ سب ڈرامہ تھا یا حقیقت کیونکہ میں نے رائفل والے کو نہیں دیکھا۔ وہ

کے بعد مجھے چارپائی کے ساتھ اس طرح باندھا گیا کہ میری ٹانگیں کھول کر چارپائی کی پٹیوں سے نیچے لٹکائیں اور نیچے سے میرے پیروں کو میرے کرتے سے باندھا گیا۔ چارپائی پر مجھے ڈنڈے کے سہارے بٹھایا گیا اور مجھے پیچھے لیٹنے کو کہا گیا۔ میرے نیچے سے ڈنڈا نکالا گیا اور چارپائی کی رسیوں کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کیا گیا اور میرے بازوؤں کو پیچھے لے جا کر میرے ہاتھوں کو باندھا گیا۔ یہ اذیت ناک عمل تھا کہ میں چیخ اٹھا۔ ساتھ ہی ساتھ موم بتی سلگائی گی اور اس کو جلا کر موم بتی کے پگھلے قطرے میرے جسم کے نازک حصوں پر ٹپکائے گئے۔ اس کے ساتھ ہی بجلی کا ایک آلا لایا گیا جس پر ایک ہینڈل لگا تھا۔ یہ ہینڈل گھمانے سے بجلی پیدا ہوتی تھی اور اس کے تار کو میرے عضوِ تناسل میرے منہ، میری چھاتی اور میرے کانوں میں جوڑ کر جھٹکے دیئے گئے۔ اس طرح کا تشدد برابر بارہ بجے تک جاری رہا۔ بارہ بجے مجھے نیم مردہ حالت میں دو آدمیوں نے سہارا دے کر سیل میں لے جا کر پھینک دیا۔

رات کو آٹھ بجے مجھے پھر تشدد کرنے والے کمرے میں لے گئے اور پھر قمر عالم کے گوریلوں کو بلایا گیا۔ اور مجھ پر دوبارہ وہی صبح والا تشدد دہرایا گیا۔ اس وقت صرف یہ فرق کیا گیا کہ وہی محمد خان نامی شخص پہلے قمر عالم سے میری ظاہراً سفارش کرتا رہا کہ جناب ابھی بتائے گا۔ اس کو تھوڑی سی مہلت دیجئے۔ اس کے بعد مجھ سے کہتا رہا بتاؤ جو کچھ "صاحب" معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے حقیقت کا اظہار کیا ہے تو پھر مجھے دوبارہ چارپائی پر باندھا گیا اور اس دفعہ محمد خان میرے سینے پر چڑھ کر اپنا عضوِ تناسل میرے منہ کے پاس لے آیا اور کہنے لگا کہ میں منہ میں پیشاب کر دوں گا۔ مجھے چارپائی پر باندھے ہوئے بھی مارا جاتا تھا۔ جب میں بے ہوش ہو جاتا تو مجھے کھول دیا جاتا۔ ہوش آنے پر پھر باندھ دیا جاتا۔ گرمی اور تشدد کے مارے مجھے زبردست پیاس لگتی۔ پانی پینے کے لئے التجا کرتا تو پانی کا گلاس سامنے طاقچے پر رکھا جاتا اور مجھے کہا جاتا کہ اس کو اُٹھا کر پیو۔ جب میں گلاس کی طرف بڑھتا تو سامنے سے ایک سپاہی آ کر مجھے چھتر سے مارتا۔ میں

ٹانگیں چھل گئیں اور دوبارہ شام کو اس طرح کے تشدد سے ٹانگوں میں زخم ہو گیا۔ دوسرے دن جب لائن آفیسر تاج نامی اے۔ ایس۔ آئی نے میری ٹانگوں پر زخم دیکھے تو کہنے لگا کہ "میں کسی کام سے گیا ہوا تھا ورنہ میں کبھی تمہاری ٹانگوں پر زخم ہونے نہ دیتا"۔ یہی وجہ ہے کہ راولپنڈی میں سماعت کے پہلے ہی دن میں نے جناب والا کو اپنے زخموں کے نشانات دکھائے تھے جو اب تک صرف نشانات کی صورت میں موجود ہیں بلکہ اس میں پسینہ آنے کی صورت میں خارش بھی ہوتی ہے اور درد بھی ہوتا ہے۔

جناب والا! عموماً گواہوں سے تشدد کے بارے میں وکیل استغاثہ نے سوال کئے کہ آیا ان کے بدن پر کوئی زخم کا نشان ہے۔ میری ٹانگوں پر جو نشانات ہیں وہ صرف ذرا سی غفلت اور سہو کی وجہ سے لگ گئے ورنہ پولیس کا عملہ اس معاملہ میں کافی ماہر ہوتا ہے کہ تشدد بھی کرتے ہیں اور نشان بھی نہیں چھوڑتے۔ میرا بدن چھتروں، ٹائر کے ٹکڑوں اور سائیکل کی ٹیوب چڑھائے ہوئے ڈنڈوں سے داغدار ہو گیا تھا۔ دوسرے دن قلعہ پولیس ڈسپنسری میں متعین ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ جس نے میرے بدن پر سپرٹ لگا کر بیرونی نشانات کو تو مٹا دیا۔ لیکن اس تشدد سے میرے اعصاب پر کیا اثر ہوا وہ اثر کتنے مہینوں تک رہا اس کی گواہی سکھر ڈسٹرکٹ جیل اور سکھر سنٹرل جیل کے ڈاکٹر صاحبان دیں گے جو میرا علاج کرتے رہے اور اب وہ صحیح طور پر ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔

مجھ پر تین روز تک روزانہ صبح شام یہ تشدد جاری رہا اور جب میری ٹانگ کا زخم زیادہ خراب ہو گیا تو ایک دو روز مجھے جسمانی تشدد تو نہیں کیا گیا البتہ ہتھکڑی باندھ کر رات کو لٹکانے کا عمل جاری رہا۔ لٹکانے اور ٹانگ میں زخم ہونے کی وجہ سے میری ایک ٹانگ سُوجھ گئی اور میں شلوار اوپر نہ چڑھا سکا۔ چنانچہ میں نے ڈیوٹی پر متعین سپاہی سے بندوق کی سنگین سے شلوار کا پائنچہ کٹوا کر کھلا کرایا تا کہ میں شلوار اوپر چڑھا سکوں اور زخم کو رگڑ سے بچا سکوں۔

زخموں کی وجہ سے مجھے دو روز تک جو جسمانی تشدد سے نجات ملی تو قمر عالم کو چین نہ آیا۔ چنانچہ مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا اور پہلے چھتروں اور ڈنڈوں سے تشدد کیا گیا۔ بجلی کے

باہر دروازے کے پاس اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس شام تشدّد کے دوران ایک نوجوان کو جو کہ کرتہ شلوار میں ملبوس تھا۔ انسپکٹر درانی نے لاکر کرسی پر بٹھایا اور میری حالت زار دِکھا کر اسے حامد کے نام سے پکار کر حقیقت ظاہر کرنے کے لئے کہا گیا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے کہا ''میرے پاس خط و کتابت موجود ہے وہ آپ دیکھ لیں''۔

اس شخص کے سامنے برہنہ حالت میں تشدّد کرتے ہوئے درانی نے مجھ سے میرا نام، پتہ کاروباری حالات، مغربی ممالک کے سفر، انکم ٹیکس وغیرہ کے متعلق سوالات کئے جس سے وہ متذکرہ حامد صاحب کو دکھانا چاہتے تھے کہ قلعہ میں STATUS کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ کوئی صاحب وائرلیس رکھنے کے کسی کیس میں مہ اپنی بیوی کے پکڑے گئے تھے اور قلعہ میں محبوس تھے۔ کیمپ جیل پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ حامد صاحب دراصل حامد محمود صاحب ہی تھے جن کا احمدی فرقہ کے سربراہ سے نزدیک کا رشتہ تھا۔ اس شام بھی آٹھ بجے سے لے کر رات بارہ بجے تک مجھ پر مختلف طریقہ سے تشدّد ہوتا رہا۔ 12 بجے رات کو مجھے لے جا کر اس سیل کے دروازے کے ساتھ پہلے کی طرح باندھ کر لٹکایا گیا اور گنتی کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس رات فرق صرف اتنا تھا کہ میری گردن اور بازوؤں کے درمیان ڈنڈا نہیں لگایا گیا۔ ویسے دن میں دو دفعہ یہ ڈنڈے کا عمل بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کیا گیا تھا۔ اس رات بھی میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پانی مانگتا رہا اور سپاہی گالیوں کے ساتھ میرے منہ سے ٹین کا گلاس لگا کر مجھے پانی پلاتا رہا جس میں سے ایک دو گھونٹ میرے منہ میں چلے جاتے اور باقی کپڑوں پر گر جاتا تھا۔

قلعہ میں پہنچنے کے تیسرے دن صبح پھر مجھے ایک گھنٹہ کھول کر رکھنے اور چائے پلانے کے بعد کمرہ تشدّد میں لے جایا گیا اور حسبِ معمول مختلف طریقوں سے تشدّد کیا گیا۔ جب میری ٹانگوں کو کھول کر اوپر سے لٹکایا جاتا اور نیچے دونوں پیروں کو باندھ کر کس دیا جاتا تو چارپائی پر کمبل بچھا دیا جاتا۔ اُس روز کمبل صحیح طریقے سے نہیں بچھی تھی جس کے نتیجے میں چارپائی کی رسیوں سے میری

چنانچہ تھپڑوں اور لاتوں سے میری مرمت کی گئی۔ ایک روز تشدد کے دوران مجھے قمر عالم ایس۔ پی نے پوچھا آیا میں SADIST کے معنی سے واقف ہوں۔ میں نے ہاں کی۔ پوچھا کیا ہوتا ہے میں نے جواب دیا ''موذی'' جو کسی کو تکلیف پہنچاتے ہوئے تسکین حاصل کرتا ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ''میں SADIST ہوں۔ جب تک میں دن میں ایک دو دفعہ یہ تماشا نہ دیکھوں میرا کھانا ہضم نہیں ہوتا''۔ سبحان اللہ۔ پانچ وقت کا نمازی اور با پیر ہونے کا دعویٰ کرنے والے شخص کا یہ کردار۔ اسلام کے نمونے اگر یہی ہیں تو بعید نہیں کو لوگ ایسے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔ ایسے لوگ اسلام اور طریقت کے لئے ناسور ہیں۔ میں طریقت کا متوالا ہوں صرف اس لئے کہ طریقت میں مخلوقِ خدا سے پیار، محبت اور رحم سکھلایا گیا ہے۔ اگر طریقت قمر عالم کی پیری مریدی ہے اور اس طرح کا ظلم و ستم تو پھر میں لامذہب کہلانا پسند کروں گا۔ ایسے مذہب کو میرا دور سے سلام۔

قمر عالم جب تک ہماری تفتیش کا انچارج رہا۔ اس وقت تک جسمانی اذیت کسی نہ کسی طریقہ سے جاری رہی۔ اس دوران ایک دفعہ جب مجھے اطہر کے سامنے پیش کیا گیا اور وہاں پر ملٹری کا ایک کرنل بھی موجود تھا تو انہوں نے مجھ سے بہت نرم لہجے میں باتیں کیں۔ گندھارا آرٹ کے نمونے جمع کرنا میری HOBBY ہے، اس پر بھی گفتگو ہوئی۔ میں نے گفتگو کے اختتام پر ڈرتے ڈرتے ان کو اپنی ٹانگیں دکھائیں۔ لیکن انہوں نے ایسے دیکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس وقت تک میرے کپڑے بہت میلے ہو چکے تھے۔ مجھے شلوار کے بدلے تہبند دی گئی تھی۔ کیونکہ میری دونوں ٹانگیں سوجھ گئی تھیں اور زخم زیادہ ہرے ہو گئے تھے۔ میں نے دونوں افسروں کا رویہ جب نرم دیکھا تو جرأت کر کے ان کو کہہ دیا کہ خدا کے لئے آپ جو سلوک ہم سے چاہیں کریں۔ لیکن ایسا کوئی قدم نہ اٹھائیں جس سے پاکستان کے مؤقف اور کشمیر کی جنگِ آزادی کو کوئی نقصان ہو۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میرے اس خیال کی پاداش میں مجھ پر اور ستم ڈھائے جائیں گے۔ چنانچہ واپس جا کر مجھ پر وقفوں کے بعد تشدد کیا جانے لگا۔ مجھے چھتروں سے مارا جانے لگا۔ بجلی کے جھٹکے دیئے جانے لگے اور گھنٹوں

جھٹکے لگائے گئے اور موم بتی کے قطرے جائے ستر پر ڈالے گئے اس سے بھی جب پولیس کا جی نہ بھرا
قمر عالم نے ملک شفیع ڈی۔ ایس۔ پی کو بلایا اور اس کو کہا گیا کہ وہ اپنے نمبر 7 آپریشن کا عمل مجھ
کرے۔ چنانچہ مجھے اوندھے منہ لٹکایا گیا اور میرے پیروں کو چارپائی کے پیروں کی طرف کی پٹی
باندھا گیا اور پھر اُوپر اُٹھا کر جسم کو چارپائی پر لٹایا گیا۔ میرے دونوں بازوؤں کو کھینچ کر باند
گیا۔ میرے بازو کو اتنے زور سے کھینچا گیا کہ میری زبان سے چیخ نکلی کہ ہائے میرا بازو ٹوٹ گیا۔ ق
عالم نے سپاہی سے کہا کہ بازو توڑنا نہیں ہے صرف تکلیف پہنچانا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر
بائیں بازو میں اب تک شدت کا درد رہتا ہے۔ چنانچہ اس عدالت سے درخواست پر یہ بازو میں
اسپیشلسٹ کو بھی دکھایا لیکن آج تک کوئی افاقہ نہ ہوا۔ کیمپ جیل کے ڈاکٹر نے جب سب علاج کر
اس نے تنگ آکر کہا کہ اس کا اب ایک ہی علاج ہے کہ اس کا پلاسٹر کیا جائے اور اس کو دو تین ہفت
آرام ملے۔ لیکن ہر روز عدالت میں حاضری کی وجہ سے میں پلاسٹر کرانے سے معذور تھا۔ چنانچہ اس
ڈاکٹر نے میرے اپنے خرچہ سے (INFRARED LAMP) منگوا کر مجھے اُن سرخ شعاعوں کی
سینک پہنچانے کو کہا جو عمل روزانہ جاری ہے۔ میں معزز وکیل استغاثہ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا
ان کو کبھی احساس ہوا کہ میرا یہ بازو اُن کی پولیس کے تشدد سے تقریباً بے کار ہو چکا ہے اور میں نے
درد کے مارے سردیوں میں کئی کئی راتیں جاگتے میں گذاری ہیں بلکہ کئی دفعہ عدالت میں بھی درد کے
شدید دورے پڑے۔ آپ نے غالباً دیکھا ہوگا کی سردیوں کے زمانے میں عدالت میں ہر وقت بازو
پکڑے بیٹھا کرتا تھا۔

جناب والا! تشدد کے دوران ایک دفعہ تنگ آکر میں نے چارپائی سے اپنا سر ٹکراتے
ہوئے رسول اللہ ﷺ کے دربار میں درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ جو حقیقت تھی اُس کا اظہار کر چکا
ہوں اور اب آپ ہی میری راہنمائی فرمائیں کہ یہ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں۔ یہ سر ٹکرانا ایک
معمولی ردِ عمل تھا۔ لیکن پولیس والے غالباً اس سے یہ سمجھے کہ میں اپنے آپ کو زخمی کرنا چاہتا ہوں۔

چونکہ تمہارے لئے میرے پاس کئی سفارشیں آئی ہیں۔ اس لئے میں تم پر یہ احسان کروں گا کہ تم کو وعدہ معاف بناؤں۔ تم جس مسجد میں کہو قسم اٹھاؤں گا۔ صرف تمہیں جاسوس ہونے کا اقرار کرنا ہو گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں جب جاسوس ہی نہیں تو اقرار کیسے کروں۔

جون کے آخری ایام میں مجھے جس کمرے میں رکھا گیا وہاں مجھے مستقل جگایا جا رہا تھا۔ ایک دن قمر عالم نے مجھے کہا کہ آج ڈی۔ آئی۔ جی آنے والا ہے اور وہ تمہیں اپنے سامنے بلائے گا۔ اگر ڈی۔ آئی۔ جی کو محسوس ہوا کہ تم پر اطمینان بخش تشدد نہیں ہوا ہے تو یاد رکھنا پھر اب موت ہی تمہارا علاج ہے۔ اس پر اس نے میرے چہرے پر چھتر مار مار کر داغدار بنا دیا۔ پھر درانی سے معلوم کیا میں کیسا لگتا ہوں۔ درانی نے جواب دیا کہ اب یہ اصلی کشمیری سیب لگتا ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر میں مجھے اطہر کے پاس لے جایا گیا اور اس نے مجھ سے کچھ پوچھ گچھ کی اور واپس بھیج دیا۔

جون کے آخر یا جولائی کے اوائل میں میں نے پولیس افسران کو کانا پھوسی کرتے دیکھا۔ ان میں سے ایک افسر نے جو مجھ پر تعینات تھا کہہ دیا کہ قمر عالم کو تبدیل کیا گیا ہے اور چوہدری بدر الدین ڈی۔ ایس۔ پی کو دوسرے ایس۔ پی کے آنے تک انچارج بنا دیا گیا ہے۔ اس دوران مجھے اطہر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے مجھے کہا کہ میں نے ساری ٹیم کو بدل دیا ہے اب میں دیکھتا ہوں کہ تم اب کیسے ہماری مرضی کے مطابق نہیں چلو گے۔ ایک دو روز کے بعد اطہر کرنل معین بٹ کے ہمراہ تشدد کے کمرے میں آیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے جگاتے ہوئے آٹھ روز ہو گئے ہیں اور مجھ کو لگاتار بجلی کے جھٹکے لگائے جا رہے ہیں۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ میں آج رات کو دو بجے سویا ہوں اور میرا سر چکرا رہا ہے۔ تم آٹھ دن کیسے جاگ سکتے ہو۔ اس پر اطہر نے حکم دیا کہ دیکھیں کہ یہ آٹھ دن کیسے جاگ سکتا ہے۔ اس لئے آج سے آٹھ دن اس کو جگائے رکھا جائے ساتھ ہی ملک فیض سب انسپکٹر کو حکم دیا کہ مجھے بجلی کے جھٹکے لگائے جائیں تا کہ وہ بھی نظارہ کر سکے۔ اس کمرے میں ایک میز پڑی تھی جس پر میرے جاگنے کے دوران مجھ پر متعین پولیس عملہ باری باری سویا کرتا تھا جس سے وہ

مستقل ایک ہی جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا۔

ایک دن مجھے سیل سے نکال کر اوپر لایا گیا اور انسپکٹر درانی کے کمرے کے باہر کھڑا کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد قمر عالم ٹہلتے ٹہلتے میرے پاس آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے جا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کو کہا۔ میں نے جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو میر عبدالمنان کو الف ننگا، گردن میں ڈنڈا، ہاتھ اوپر کو باندھے ہوئے، گلے میں پشاوری چپلوں کا ہار پہنے تپتی دھوپ میں ننگا دوڑاتے دیکھا۔ میر صاحب کے اردگرد کوئی پچاس آدمیوں کا گھیرا تھا جو تالیاں بجا رہے تھے۔ میر صاحب زور زور سے چیخ بھی رہے تھے۔ میرے منہ سے چیخ نکلی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ قمر عالم نے زوردار قہقہہ لگایا۔ میں نے قمر عالم کو کہا کہ میر منان جیسا علامہ اقبال کا پرستار، جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم کے فلسفہ کا حامی اگر جاسوس ہے تو دنیا میں محبِ وطن کون ہے۔ اسی پر اس نے مجھے ایک تھپڑ رسید کیا اور کمرہ تشدد میں ملک فیض نامی سب انسپکٹر کے ساتھ یہ کہہ کر بھیج دیا کہ لے جاؤ اسے اور علامہ اقبال یاد کراؤ۔ اس کے بعد ملک فیض نے میرے ساتھ کس طرح ذہنی اور جسمانی تشدد کیا یاد کر کے میرے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تشدد اور تفتیش کے ''ملے جلے'' پروگرام کے دوران میں نے محاذ کے دیئے ہوئے چندہ اور اپنی حیثیت کے متعلق قمر عالم کو بتلایا کہ وہ کراچی میں میرے انکم ٹیکس وکیل جان عالم سے معلومات حاصل کریں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جان عالم قمر عالم کا بھائی ہے۔ چنانچہ پہلے ایک دن مجھ پر تشدد ہوا اور دوسرے دن قمر عالم نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس نے کہا تھا کہ جان عالم اس کا رشتہ دار ہے۔ میں نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس پر مجھے کہنے لگا کہ وہ میرے ماموں کا لڑکا ہے لیکن میرا دشمن ہے کیونکہ اُس نے میری جائیداد پر قبضہ کیا ہے۔

پھر مجھے ایک روز کہا کہ مجھے دو وعدہ معاف گواہوں کی ضرورت ہے۔ ایک راولپنڈی سے اور ایک کراچی سے، پنڈی سے مجھے ڈاکٹر فاروق مل گیا ہے۔ اب مجھے کراچی سے ایک چاہئے

زندگی چاہتے ہو تو پاکستان جا کر ہمارا کام کرو۔ وہاں پر لون، منان، قیوم اور امان ہمارے آدمی ہیں۔" یہ جملہ اس نے اس میّنہ بیان سے پڑھایا یا خود زبانی پڑھا، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ البتہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ جو پولیس ہم کو الگ الگ ساتھیوں کے متعلق بھارتی جاسوس ہونے کا یقین دلا رہی تھی یہ سب لغو اور جھوٹ ہے کیونکہ اگر مقبول بٹ نے اس قسم کی گفتگو سری نگر جیل میں کسی سے کی ہوتی تو لازماً وہ جس وقت پاکستان پہنچ گیا تھا تو وہ ہم سے اِس کا ذکر کرتا چونکہ نہ میں بھارتی جاسوس تھا اور نہ ہی مقبول بٹ نے مجھ سے اس قسم کے کسی واقعہ کا واپسی پر کوئی ذکر کیا تھا۔ اس لئے میں پولیس کے جھوٹا مقدمہ بنانے کے مقصد کو بھانپ گیا۔

ماتحت پولیس عملہ بھی اپنے بالا افسران سے تنگ تھا اور مجھ پر زور دے رہا تھا کہ میں افسران کی خواہش پوری کروں۔ مجھ سے منوانے کے لئے تشدّد، دھونس ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی نرمی کا لہجہ بھی اختیار کیا گیا۔ بدرالدین ڈی۔ایس۔پی نے مجھے کہا کہ میں کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ میں افسران کی مرضی کے مطابق بیان دے دوں تاکہ ان کی اور میری جان چھوٹ جائے۔ جب میں ماتحت افسران سے پوچھتا تھا کہ آپ لوگوں کو کیا ہم گناہ گار نظر آتے ہیں تو وہ جواب دیتے کہ آپ کی بے گناہی پر یقین ہو گیا ہے لیکن کیا کریں ہمیں نوکری کرنا ہے۔ یہ نوکری کرنے والی بات میں نے صرف قلعہ میں ہی نہیں سنی بلکہ کراچی میں بھی بار بار یہ بات مجھ سے کہی گئی تھی۔ یہ بات سُن کر میں اپنی تکلیفیں اور مصیبتیں بھول جاتا اور مجھے ان بے ضمیر پولیس والوں پر رحم آتا جو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے حق وانصاف کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ظالم افسران کی خوشنودی کے لئے مجھ سے جھوٹا بیان دلوا کر بے گناہ محبِ وطن لوگوں کو پھنسانا چاہتے تھے۔

میں جب مزید جسمانی اور ذہنی اذیت کا متحمل نہ ہو سکا تو چوہدری بدرالدین سے ایک دن میں نے کہہ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں مجھے بتائیں میں لکھ دوں گا۔ اس پر اُن لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور بدرالدین مجھ سے کہنے لگا کہ وہ ڈی۔ایس۔پی ملک شفیع اور انسپکٹر احمد خاں سے کہہ دیں

ٹوٹ گئی تھی۔ اطہر کی نظر اس میز پر پڑی اور شک گزرا کہ مجھے اس پر سلایا جا رہا ہے اور اس نے اس کا اظہار وہاں پر کھلم کھلا کیا اور اس روز سے ملٹری کے دو افراد (جن کا تعلق مجھے بعد میں معلوم ہوا کرنل معین بٹ کے محکمہ سے تھا اور جو تین روز پہلے ہی سے وہاں دن کو آنے شروع ہو گئے تھے) کو یہ فرض سپرد کیا گیا کہ وہ باری باری رات کو وہیں رہ کر میرے جگانے پر نظر رکھیں۔ چنانچہ اس روز کے بعد یہ دونوں افراد باری باری راتوں کو وہاں سونے کو آتے اور دن میں بھی ڈیوٹی دیتے۔

اگرچہ ملٹری کے متذکرہ دو افراد نے بھی مجھ پر تشدد کیا لیکن میں زندگی بھر ان کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے مجھے زیرِ دفعہ 164 جھوٹا ''اقبالی بیان'' دینے سے بچایا۔ یہ اس طرح ہوا کہ ان کی مستقل ڈیوٹی لگنے سے پہلے مجھ پر پولیس زور دے رہی تھی کہ میں ان کی مرضی کا بیان لکھ کر دے دوں۔ چنانچہ بدرالدین نے مجھے جب پہلے زور دیا تو میں نے روتے ہوئے اس کو کہا کہ میں بے گناہ ساتھیوں کے خلاف کس طرح غلط بیان دے دوں۔ میں نے بدرالدین کو کہا میر قیوم کے گھر میں بالغ بچیاں ہیں اگر میں ان کے خلاف بیان دے دوں تو میں ان بچیوں کی زندگی برباد کر دوں گا بہتر ہے کہ آپ مطلوبہ بیان اُن سے (میر قیوم) دلوا دیں اور ان کو وعدہ معاف گواہ بنا لیں تا کہ وہ بچ کر اپنی بچیوں کی شادی کے لئے آزاد ہو جائیں۔ میری بچیاں تو بہت چھوٹی ہیں اس لئے اگر حکومت مجھے 14 سال بھی جیل میں رکھنا چاہے گی پھر بھی رہا ہو کر میں اپنی بچیوں کی شادی بعد میں کر سکتا ہوں۔ اس کے نتیجہ میں میرے اوپر مزید تشدد کیا گیا۔ چنانچہ میں نے تنگ آ کر غلط بیان دینے کی حامی بھر لی۔ اس سے پہلے قمر عالم نے ایک روز مقبول احمد بٹ کو میرے کمرہ تشدد میں بلایا اور ایک کاغذوں کا بنڈل (جو اس کے سامنے تھا) کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ بیان اس کا لکھا ہوا تھا کہ نہیں۔ مقبول احمد بٹ نے اقرار کیا۔ اس کے بعد مقبول احمد بٹ کو واپس بھیج دیا اور اس مبینہ بیان میں سے ایک جملہ پڑھا جو کچھ اس طرح کا تھا، ''مجھے ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرے میں بلایا گیا جہاں افراد (چند پولیس اور جیل کے افسروں کے نام) موجود تھے اور مجھ سے کہا گیا کہ اگر تم

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مجھ پر اس قدر تشدد ہو چکا تھا کہ میں اب اس کا عادی ہو گیا تھا۔ میرے جسم کا انگ انگ گویا تکلیف اور درد کا احساس کھو چکا تھا۔ قلعے والوں کے تشدد کے مختلف طریقوں میں سے ایک حربہ مسلسل جگائے رکھنے کا ہے جس کا میں اُوپر ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن شاید اس فاضل عدالت کو اندازہ نہ ہو سکے کہ مسلسل جگائے رکھنا اور سونے نہ دینا کس قدر شدید اور کربناک عذاب ہوتا ہے۔ اس لئے میں ذرا تفصیل سے اس عمل کی جزئیات بیان کرتا ہوں۔

جگائے رکھنے کے لئے ملزم کو مستقل کھڑا رہنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اِدھر اُدھر گھمایا پھرایا جاتا ہے۔ تھوڑی ہلکی ورزش کرائی جاتی ہے تاکہ تھکن کی وجہ سے نیند کا غلبہ ہو۔ نماز میں زیادہ وقت گذارنے نہیں دیا جاتا۔ بیت الخلاء میں ہر آدھ منٹ کے بعد آواز دی جاتی ہے۔ کہیں اونگھ آجائے تو سلگتے ہوئے سگریٹ سے جسم داغا جاتا ہے یا بجلی کا تار انگلی یا دونوں کانوں میں جوڑ کر جھٹکے دیئے جاتے ہیں جس سے دماغ میں سے بجلی گزر جاتی ہے۔ پچنگ مشین سے نہ صرف کانوں کو کھینچا جاتا ہے بلکہ انگلیوں کو دبایا جاتا ہے (اس عمل کے نتیجے میں میرے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی دو مہینے پہلے تک بے حس تھی) انگلیوں کے جوڑوں پر بھی اس سے ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ جگانے کے دوران ''ملزم'' سے کہا جاتا ہے کہ باتیں کرتے رہو اور اگر زندگی میں کوئی عشق کیا ہے یا بدکرداری کی ہے تو وہ قصے سناؤ۔ مجھ سے پولیس افسران یورپ میں کی ہوئی مبینہ عیاشیوں کی تفصیلات سُننے کے متمنی تھے۔ میں نے کچھ کیا ہوتا تو انہیں سناتا۔ لیکن اُن کے خیال میں ایسا کوئی متموّل شخص ہو ہی نہیں سکتا جو عیاشیاں نہ کرتا ہو اور خاص طور پر یورپ جا کر۔ چنانچہ وہ میرے بیان کو جھوٹ سمجھ کر ایذا پہنچاتے تھے۔ ایک کوشش یہ بھی کی جاتی ہے کہ ملزم کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے تاکہ نیند کا غلبہ شدید ہو۔ جب جگانے کا عمل مجھ پر شروع کیا گیا تو میں نے برائے نام کھانا کھایا البتہ چائے اس لئے زیادہ پی کہ اس سے نیند کے روکنے میں مدد ملتی تھی۔ ذہنی اذیت پہنچانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ تشدد والے کمرے میں

گئے کہ وہ میرے لئے ایک بیان تیار کریں (کیونکہ وہی جھوٹے بیانات تیار کرنے کے ماہر تھے) یہ کام انہیں سپرد کر دیا گیا۔ ایک رات چوہدری احمد خاں میرے پاس ایک بیان لے کر آیا اور کہا کہ یہ اس نے میر عبدالقیوم کے لئے تیار کیا ہے اسے ہی بنیاد بنا کر اپنا بیان تحریر کرو۔ جب میں نے پوچھا کہ اس میں بھارتی افسران کے نام، مبینہ وصول شدہ رقوم اور تاریخوں کی جگہیں خالی ہیں تو اس نے جواب دیا کہ وہ معلومات حاصل کر کے بعد میں بھر دی جائیں گی۔ میں وہ بیان پڑھتا رہا، لیکن میرا قلم لکھنے کے لئے اُٹھ نہ سکا۔ دو ایک دن میں نے اِدھر اُدھر لکھنے کی کوشش کی۔ مجھ پر زور ڈالا جا رہا تھا کہ میں جلد از جلد بیان لکھ دوں۔ لیکن ایک طرف جھوٹا بیان لکھنے کو دل نہ مانتا اور دوسری طرف مسلسل جگانے سے بھی میں بیان میں وہ رنگ آمیزی نہ کر سکا جو پولیس والے چاہتے تھے۔ اس دوران میں نے ملٹری والوں کو اعتماد میں لے کر کہہ دیا کہ پولیس والے مجھ سے جھوٹا بیان دلوانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ بھی مجھے جسمانی اذیت پہنچا رہے تھے، لیکن اُن میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ میں سچ پر قائم رہوں۔ دوسرے کو مجھ پر کچھ یقین نہیں آ رہا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میر قیوم کا بیان دیکھا تھا اور اس میں بھارت سے ڈھائی ملین روپے آنے کا ذکر تھا۔ (لاکھ کا ترجمہ یہ شخص ملین کرتا تھا) پولیس والے رات کو میر قیوم صاحب کے لئے تیار کردہ بیان میرے پاس چھوڑ جاتے اور صبح ملٹری والوں کے آنے سے پہلے ہی واپس لے جاتے تھے۔

جب اطہر نے کرنل معین بٹ سے مل کر مجھ پر متذکرہ بالا دو فوجیوں کو متعین کرایا تو پھر مجھے وہ بیان نہیں دیا گیا البتہ جب وہ فوجی اِدھر اُدھر ہو جاتے تو مجھ سے کہا جاتا کہ میں بیان مکمل کروں اور میں میر قیوم صاحب کے لئے تیار کیا ہوا بیان مانگتا، لیکن ان فوجیوں کے ڈر سے نہیں دیا جاتا تھا۔

اس دوران قمر عالم ایس۔ پی کی جگہ ملک صدیق تبدیل ہو کر آ چکا تھا اور اس نے پوچھ گچھ اور تشدد کے فرائض سنبھال لئے تھے۔ نئے ایس۔ پی نے بہتر کارکردگی دکھانے کی خاطر اپنے پیشرو سے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن:

کرنل کو میری بے ہوشی کے دورانِ ٹیلیفون پر صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا اور میری موت واقعہ ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا تھا اور انہوں نے پولیس افسران کی مخالفت کے باوجود کرنل سے اپنی ذمہ داری پر میرے سونے کی اجازت حاصل کی تھی۔

ایک روز میں نے بدرالدین ڈی۔ ایس۔ پی سے کہا آج کل کے ترقی یافتہ دور میں تفتیش کے جدید نئے مشینی طریقے اور آلات ایجاد ہو چکے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہماری پولیس اب تک انسانیت سوز تشدد کے فرسودہ طریقوں کو اپنائے ہوئے ہے۔ میں نے کہا کہ اگر میری باتوں کا اعتبار نہیں کیا جاتا تو مجھے (LIEDETECTOR یا DRUGTEST) دیا جائے میں تیار ہوں۔ میں نے پیش کش کی کہ کسی بیرونی مُلک سے (LIEDETECTOR) مشین اور اُس کا ماہر منگایا جائے۔ میں سارا خرچہ برداشت کروں گا لیکن میری یہ پیشکش اس وقت مسترد کر دی گئی۔ ایک روز غالباً 8 جولائی مجھے کمرہ تشدد میں لایا گیا۔ اس روز صبح ہی سے مجھے کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ 10/9 بجے کے قریب دو آدمی کمرے میں آئے مجھے بتایا گیا کہ وہ ڈاکٹر ہیں۔ چونکہ میں کمزور ہو گیا ہوں اس لئے میرا طبی معائنہ کرنے آئے ہیں، نبض وغیرہ دیکھنے کے بعد مجھے لیٹنے کے لئے کہا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ کمزوری کی وجہ سے مجھے گلوکوز کا انجکشن دیا جا رہا ہے۔ دراصل یہ گلوکوز نہیں بلکہ بے ہوشی کا ٹیکہ تھا اور ڈاکٹر نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ گویا پولیس کا یہ ڈاکٹر نفسیات بھی اپنے پیشہ وارانہ ضابطہء اخلاق اور انسانیت سے عاری تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے سرہانے ڈی۔ آئی۔ جی اطہر اور ملک صدیق مجھ سے سوالات کر رہے ہیں اور میرے پاؤں کی جانب انسپکٹر احمد خاں کاغذ و قلم لئے سوالات کے جوابات لکھ رہا ہے۔ غنودگی کے عالم کے آخری دو سوالات میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ امان اللہ کا کن کن سفارت خانوں میں آنا جانا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ایک دفعہ وہ افرو ایشین یک جہتی کمپین کے سلسلہ میں کیوبا کے سفارت خانے میں گئے تھے جس کا مجھے علم ہے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ میر منان کو خطوط وغیرہ کون لکھ کر دیتا ہے۔ میں نے

لے جا کر گھٹنوں کھڑا رکھتے اور ساتھ ساتھ ڈیوٹی پر متعین افسر اور عملہ انتہائی فحش اور غلیظ گالیاں میری ماں بہن اور بیٹیوں کے نام، میری قوم کے نام، میری قوم کے راہنماؤں کے نام اور میرے دینی اور مذہبی پیشواؤں کے نام دیتا رہتا تھا اور میں قہر درویش بر جان درویش یہ سب کچھ سننے پر مجبور تھا۔ رات کے ایک دو بجے سے لے کر صبح کے آٹھ بجے تک کا وقت اذیت ناک ہوا کرتا تھا۔ اس دوران ڈیوٹی پر متعین سپاہی مجھے بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی گھمایا کرتے تھے۔

مسلسل بیداری سے آخری دنوں میں میری یہ حالت ہوگئی تھی کہ جب مجھ سے کوئی سوال کیا جاتا تو ایک آدھ جملہ اُردو میں بولنے کے بعد میں عالمِ بےخودی میں کشمیری بولنے لگتا۔ پھر جب مجھے محسوس ہوتا کہ میں کشمیری بول رہا ہوں تو اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرتا۔ کئی دفعہ ملک صدیق کے سامنے بیٹھے میرا سر اس کی میز پر گر گیا اور مجھے سلگتا ہوا سگریٹ لگا کر ہوش میں لایا گیا۔ ان ایام میں میرے ساتھ نماز میں اکثر یوں ہوتا تھا کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں کتنے سجدے کر رہا ہوں، کیا پڑھ رہا ہوں یا کتنی دیر سجدے میں پڑا رہا ہوں۔ سپاہی مجھے آوازیں دے کر اُٹھاتے تھے۔ رات کو کمرے میں چلتے چلتے عالمِ بےخودی میں دیوار سے ٹکرا جاتا۔ میرے دماغ میں عجیب گونج دار آوازیں پیدا ہوتیں۔ میرا سر زخمی ہو جاتا اور پولیس والے زور زور سے قہقہے لگاتے۔ آخری ایام میں مجھے اپنے ہاتھوں اور دیگر اعضاء پر چمکتے ہوئے ذرّوں کی چلتی ہوئی قطاریں دکھائی دیتیں۔ دیواروں پر بھیانک اور وحشت ناک تصویریں نظر آتیں۔

جبری بےخوابی کے دوران ایک روز مجھے گارد کے متذکرہ فوجیوں نے تھوڑی دیر کے لئے ایک بازو والی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی میں بیہوش ہو گیا۔ پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ مجھے دو آدمی کرسی سے اُٹھا کر جگانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں نیم بےہوشی کے عالم میں تھا۔ بعد میں مجھے انہی فوجیوں کی کوشش سے ایک بار سونے کی اجازت مل گئی۔ خدا جانے میں کب تک سویا رہا جب میرے ہوش و حواس بحال ہو گئے تو مجھے اس فوجیوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے

سوالات چوہدری بدرالدین نے پوچھے۔ پہلے دن اٹھارہ سوال کرنے کے بعد بجلی بند ہوگئی اور مشین چلائی نہ جاسکی باقی ماندہ سولہ سوالات اگلے دن 10 جولائی کو پوچھے گئے۔ جو دو فوجی جوان میری تفتیش میں شامل کیے گئے تھے، وہ مشین کے ماہر صوبیدار میجر کے شاگرد تھے اور مشین کی کارکردگی اور طریقے سے واقف تھے۔ دوسرے یا تیسرے روز فوجی جوانوں میں سے ایک نے مجھے آکر پہلی بار ''لون صاحب'' کہہ کر پکارا اور مبارکباد دی کہ مشین کی رپورٹ سے ظاہر ہوگیا ہے کہ میں سچا ہوں۔ اس کے بعد ان فوجیوں کا رویہ میرے ساتھ نہایت ہمدردانہ ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ایک دو بار مجھے اپنے میس MESS سے چاول بھیجے جو ان دنوں میرے لئے نعمت عظمیٰ کا درجہ رکھتے تھے۔ (LIEDETECTOR) مشین کے عمل کے آخری روز یعنی 10 جولائی کو رات کو مجھے بجائے سیل کے اندر بند کرنے کے باہر کے پنجرہ نما حصے میں بند کیا گیا۔ اس جگہ مجھے صحن اور سیڑھی کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ شام کو باہر ایک گاڑی رُکی بہت سے آدمیوں کا شور سنائی دیا تو باہر جھانک کر میں نے امان اللہ صاحب کو ان کی پیٹھ اور قراقلی ٹوپی سے پہچانا۔ انہیں ہتھکڑیوں میں کافی دیر سیڑھیوں کے نیچے کھڑا رکھا گیا۔ اس طرح مجھے ان کو گلگت سے لاہور لانے کا علم ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے امان اللہ صاحب کو ایک بار اور دیکھا جب کہ انہیں میری کوٹھڑی کے نزدیک کسی اور سیل میں لے جایا جا رہا تھا۔

ایک روز میں نے سیل کے قریب سیڑھیوں سے دھماکے کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ اس آواز کے ساتھ ہتھکڑیوں کی جھنکار بھی شامل تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو میر عبدالمنان تھے جن کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور انہیں میرے سیل سے آگے والے سیل میں لے جایا جا رہا تھا۔

ایک واقعہ جس نے مجھے قلعہ میں تشدد برداشت کرنے کی طاقت بخشی اور پولیس کے حسب منشا جھوٹا بیان دینے سے روکا وہ یہ تھا کہ جب مجھے کمرہ تشدد سے واپس سیل میں منتقل کیا گیا تو میں نے دیوار پر بڑے حروف میں پنسل سے نصیر وانی کا نام لکھا ہوا دیکھا اور اس کے نیچے شاعرِ

جواب دیا کہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں انہوں نے علی گڑھ سے ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی کیا ہوا ہے۔انہیں کسی سے لکھوانے کی کیا ضرورت۔جونہی ڈاکٹر کو احساس ہوا کہ میں ہوش میں آرہا ہوں اس نے پولیس افسران کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے جلدی باہر چلے گئے۔اس کے بعد مجھے چارپائی سے اٹھایا گیا تو میں نے محسوس کیا کہ میری ٹانگیں بالکل بے جان ہوگئی ہیں۔چنانچہ دو آدمیوں نے مجھے سہارا دے کر ایک اور کمرے میں پہنچایا۔جہاں افسر لوگ خود تو بھنے ہوئے مرغ کی ضیافت اُڑاتے رہے اور مجھے بجلی کے جھٹکے لگوا کر اپنے لئے تفنن طبع کا سامان کرتے رہے۔بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہی عمل میر عبدالقیوم صاحب کے ساتھ بھی دہرا گیا۔

بے ہوشی کے عمل کے دوسرے دن مجھے سپرنٹنڈنٹ قلعہ کے دفتر میں لے جایا گیا جہاں (LIEDETECTOR) مشین موجود تھی۔یہ مشین E.C.G کی مشین کے مشابہ ہے اور اس کی طرح تاریں ننگے بدن پر لگائی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ دو سپرنگ کی طرح کے تار انگلیوں میں لگائے جاتے ہیں۔یہ مشین فوج کے محکمہ سے منگائی گئی تھی جسے فوج کا ایک صوبیدار میجر لگانے آیا تھا۔مجھے پتہ چلا کہ اس سے پہلے یہ مشین شہناز گل، فیروز عبداللہ اور اس کے مشتبہ ساتھیوں پر استعمال ہو چکی تھی۔LIEDETECTOR لگانے سے پہلے صوبیدار میجر نے مجھ پر واضح کر دیا کہ یہ مشین اس صورت میں مجھ پر استعمال کی جائے گی کہ میری رضامندی حاصل ہو۔میں نے بخوشی اپنی رضامندی دے دی۔

بات معمولی تھی لیکن میرے دل میں اس بات سے فوج کے جوانوں کے لئے بے پناہ عزت اور محبت بڑھ گئی۔کیونکہ دو فوجی جوانوں کی موجودگی کی وجہ سے ہی میں پولیس کا تیار کردہ جھوٹا بیان دفعہ 164 کے تحت قلمبند کرانے سے بچ گیا۔اور (LIEDETECTOR) مشین صوبیدار میجر نے مجھے میری رضامندی سے لگائی۔

مجھ پر (LIEDETECTOR) مشین تو فوجی افسر نے لگائی لیکن پہلے سے تیار کردہ

ملک شفیع نے تحریص وترغیب کے تمام حربے آزمائے اور جب میں جھوٹ بولنے پر تیار نہ ہوا تو خوف وہراس پھیلایا گیا۔ جسم وروح کی کوئی اذیت ایسی نہیں جو مجھے نہ پہنچائی گئی ہو اور ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ میں پولیس کی گھڑی ہوئی کہانی کو بیان کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن میرے زندہ ضمیر نے مجھے ملامت کی اور میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ موت قبول کرلوں گا، لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ قلعہ میں مختلف افسروں کے سامنے میں نے جو بیانات دیئے تھے اس سے اطہر علی اور اس کی ٹیم کو یہ پوری طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے کبھی بھی عدالت میں لے جایا گیا تو عدالت کے سامنے اصل حقائق آجائیں گے۔ سر سے پاؤں تک تشدد کے نشانات بھی میرے لئے نجات کا سبب بنے۔ مجھے اس دور میں کوئی مجسٹریٹ دیکھ لیتا تو وہ یہی سمجھتا کہ میرا نزاعی بیان ہو رہا ہے۔ کیونکہ میں نیم مردہ تھا، یہی وجہ تھی کہ پولیس کے درندہ صفت انسان جب مجھے یہ کہتے تھے:

''تمہارا دُنیا میں کوئی دوست ساتھی یا رشتہ دار نہیں ہے۔ مارشل لاء کے زمانے میں پاکستان کے بڑے بڑے بہادر لیڈروں کی زبانیں بند ہو چکی ہیں۔ پریس کا گلہ بند دبایا جا چکا ہے اور ملک میں ہائی جیکرز اور ان کے گروہ کے خلاف پوری طرح نفرت پھیلائی جا چکی ہے اس لئے کوئی آواز تمہارے حق میں نہیں اُٹھ سکے گی۔ اگر تم اپنے چھوٹی چھوٹی بچیوں کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو تو پولیس کی ان خواہشات کو پورا کرو''

لیکن یہ تمام دھمکیاں مجھے راہِ راست سے نہ ہٹا سکیں۔ میرا تعلق خدا کے ساتھ اور بڑھ گیا اور یہ حقیقت ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے میرا اور کوئی سہارا نہ تھا اور اللہ کی یاد نے میرے ایمان کو اتنا قوی کر دیا تھا کہ میں خود کو حسن ناصر شہید کے قاتلوں کے ہاتھ میں بھی پا کر اپنے مقام سے ایک انچ نیچے نہ سرکا اور میرا دل مجھے بار بار یہی کہتا تھا کہ کیا تم دُنیا میں تنہا نہیں آئے تھے اور کیا تم اس دنیا سے تنہا نہیں جاؤ گے۔ میرے قلبی اطمینان نے مجھے جھوٹ بولنے کی ذلت اور رسوائی سے بچا لیا اور اس دور میں کچھ ایسے موقعے بھی آئے کہ فوجی آمروں نے جنہیں ہم پر پہرہ دینے پر بٹھا رکھا تھا،

انقلاب مجبور کاشمیری کا لکھا ہوا یہ شعر تھا۔

کری کس ء کاشریا آزاد پنجرس منز ژہ نالاں چھوک
ژہ پنے دستہ پنہ نن مشکلن آسان پیدا کر

(وائے کشمیری تو جو اس پنجرے میں گریہ وزاری کر رہا ہے تجھے اس سے کون آزاد کرائے گا، تو خود اپنے ہاتھوں اپنی مشکلات کا حل پیدا کر)

آخری دنوں میں مجھے چوہدری بدرالدین کی تحویل سے نکال کر ڈی۔ ایس۔ پی ملک شفیع کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اس شخص نے افسران بالا کو یقین دلایا تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹا اقبالِ جرم کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے بھی مجھے جسمانی اذیت کے علاوہ ذہنی اذیت بھی پہنچائی۔ اُس نے دورانِ تفتیش ایک بار اس سے کہا کہ میرے متعلق مسٹر کے۔ ایچ خورشید اور سردار قیوم سے معلوم کرے کہ میں نے کس طرح کشمیر کی سیاسی جماعتوں کو کشمیر کی جنگِ آزادی لڑنے کیلئے متحد کرنے کی کوشش کی ہے تو اس نے خورشید صاحب کے نام ایک بڑی وزنی گالی دی اور کہا کہ تم سب کشمیری غدار ہو۔ وقت آنے پر ایک ایک کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا۔ اس طرح جب میں نے لاہور اور کراچی میں مسٹر بھٹو سے ملاقاتوں کا ذکر کیا تو ان کے نام بھی شفیع نے گالیاں دے کر کہا کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں کہ وہی شخص جہاز کو جلانے کا ذمہ دار ہے۔ جب میں نے قائد عوام مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے نام بھی یحیٰی خاں کے سازشی گروہ کے اس کارندے کی زبان سے فحش گالیاں سُنیں تو میں اپنے پر کیے گئے تشدد کو بھی بھول گیا۔ یحیٰی خاں اور اس کا یہ جی حضوری ٹولہ انگریزوں کی معنوی اولاد ہے۔ یہ لوگ آزادی کی قدروں کو نہیں پہچان سکتے اور ان کے لئے عام شہری آزادیاں، عوامی حقوق اور عوامی قیادت سب سے بڑی گالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن سیاسی کارکنوں اور ان کے آباؤ اجداد نے برِ عظیم ہندو پاکستان سے انگریزوں کو نکالا تھا۔ یہ گروہ ابھی تک ان سے اس کا انتقام لیتا چلا آتا ہے۔

نے ہمارا پیچھا اس معزز عدالت میں پیش ہونے کے بعد بھی نہ چھوڑا اور اپنے عملے سمیت ہمیں پریشان کرتا رہا۔ لاہور اور پنڈی میں اس کی ہدایت کے مطابق ہمیں جیل حکام نے تنہائیوں میں رکھا۔ کسی سے ملاقات کی اجازت نہ دی اور لاہور کیمپ جیل میں بیت الخلاء کے بغیر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس رکھا جاتا تھا اور ان سیلوں میں مقید رکھا جاتا رہا جنہیں جیل کی زبان میں ''قصوری'' سیل کہا جاتا ہے۔ ان سیلوں میں سزا یافتہ قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جو جیل کے اندر بھی جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے اس ظلم و تشدد کے خلاف پاکستان کی اس باوقار عدالت کی توجہ بھی دلائی، جس پر معزز عدالت نے غلام حسین بٹ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو بتائے کہ وہ ہم قیدیوں کو قانونی مراعات سے محروم نہ رکھیں لیکن

ع ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

غلام حسین بٹ ایس۔ پی نے جو فاضل عدالت کا حکم لے کر جیل حکام کے پاس پہنچے تھے اپنی طرف سے اس نادر شاہی حکم کا اضافہ کیا کہ ہم قیدیوں کو آپس میں بھی نہ ملنے دیا جائے۔ جیل قواعد کے تحت اس طرح کی ہم پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی تھی اور ہم لوگوں نے جیل حکام کو بتا دیا تھا کہ ہم ان کی متشدد پالیسی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ پاکستان ٹائمز میں جنوبی افریقہ کے ایک قانون کے پروفیسر کا چھپا ہوا آرٹیکل آیا تھا جس میں قید تنہائی کو قانون کی نظر میں (TORTURE) تشدد ظاہر کیا گیا تھا جس پر میں نے یہ مضمون جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو دکھایا تھا اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دے رکھی تھی۔ اس کے باعث سپرنٹنڈنٹ جیل کو جب غلام حسین بٹ نے نادر شاہی حکم سنایا تو وہ سخت برافروختہ ہو گیا تھا۔ ہم نے جو ظلم و ستم سہے ہیں اس کا بیان کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ جسم کے ایک ایک جوڑ میں آج بھی درد محسوس ہو رہا ہے حالانکہ جسمانی تشدد ختم ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ جوڑوں کا درد ہمارا قبر تک پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ہم جسمانی طور پر بیکار ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قابلِ احترام ساتھی ڈاکٹر فاروق حیدر

ان کے دل بھی ہماری بے گناہی کی وجہ سے مائل بہ کرم ہو گئے تھے۔

تشدد کا یہ دور اتنا طویل ہے کہ شاہی قلعہ لاہور چھوڑنے کے بعد بھی ہمیں اس سے چھٹکارا نہ مل سکا۔ اطہر علی نے ہمارا جیل میں بھی پیچھا کیا اور اس نے جیل خانہ جات کے سپرنٹنڈنٹوں کو ہمیں قید تنہائی میں رکھنے کے لئے خطوط لکھے۔ ہماری ملاقاتوں پر پابندی بدستور رکھی گئی۔ جیل خانہ جات کی فائلیں اس الزام کی تائید کرتی ہیں۔ میری بڑی بچی کی عمر چھ برس ہے اس نے مجھے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھے۔ لیکن میری بچی کا خط مجھے ڈیڑھ مہینہ گزرنے کے بعد ملا اور کتنے ہی خطوط ایسے ہیں جو مجھے آج تک نہیں دیئے گئے۔ مجھ پر بھی خط و کتابت کی پابندیاں تھیں۔ اطہر علی کو جیل حکام پر بھی اعتبار نہیں تھا اس لئے میری ملاقات کرانے کے اختیارات اس نے مارشل لاء حکام سے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور ہمارے ملاقاتیوں کو اس نے نہ صرف تنگ کیا بلکہ ہمارے خلاف ہمارے سسرال کو بھڑکاتا رہا۔

اطہر علی کے انتقام کی آگ پھر بھی ٹھنڈی نہ ہوئی اور اسے جب پتا چلا کہ میرے کاروبار کی دیکھ بھال میرا چھوٹا بھائی کر رہا ہے تو اس نے میرے بھائی کو اس حالت میں گرفتار کیا کہ وہ بیمار پڑے تھے۔ اطہر علی ان کی گرفتاری کے بعد بہت خوش ہوا تھا کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں معاشی طور پر بھی بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ اطہر علی نے میرے بھائی کی گرفتاری 13 اگست کو عمل میں لائی اور میرے بھائی کو یرغمال رکھ کر مجھ سے جھوٹا اقبالِ جرم کرانے کا ایک اور حربہ آزمایا۔ دوسری طرف میرے بھائی کو یہ کہا جاتا رہا کہ وہ مجھے پولیس کی خواہش کے مطابق بیان دینے پر رضامند کرے۔ میرے بھائی کو جن واقعات کی بناء پر گرفتار کیا گیا تھا اس کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور ویسے بھی وہ مقدمات مارشل لاء نے واپس لے لئے ہیں۔ میرے بھائی کی گرفتاری سے محض پولیس کو بلیک میلنگ مطلوب تھی، لیکن اطہر علی کو یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوگا اور وہ اس دُکھ کو اپنے ساتھ قبر میں لے کر جائے گا کہ وہ مجھ جیسے غریب الدیار سیاسی کارکن سے اپنے مطلب کا جھوٹا بیان نہ لے سکا۔ اطہر

تھی۔ قلعہ کے زمانے میں جو "اہلِ حرم" کے ہاتھوں ہم پر گزری ہے اس کی تفصیل جب کبھی فرصت کے لمحات ملے اور صحت نے اجازت دی تو میں قلمبند کر کے پاکستان کی عظیم قوم کو بتاؤں گا کہ ان کے وطن میں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ جسمانی اور ذہنی تشدد کے ساتھ ساتھ سیلوں کے حالات، نظر بندوں کی خوراک، بیماری کی حالت میں انسانوں کا تمسخر، بھنگی اور سقہ کے حالات بھی ضبط تحریر میں لاؤں گا۔ لیکن اس مرحلے پر اسلامی مملکت کی اسلامی عدالت کے سامنے محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم پر جو قیامت ڈھائی گئی ہے، اس کی طرف صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جہاں مجھ سے سب کچھ چھین لیا گیا وہاں مجھ سے قرآن پاک کا نسخہ بھی چھین لیا گیا تھا۔ وظائف اور درود و سلام کے نسخے بھی لے لئے گئے تھے اور جب میں نے اس پر احتجاج کیا تو مجھے اسلامی مملکت کے پاسبانوں نے یہ جواب دیا کہ قرآن پاک بھی READING MATERIAL کی تعریف میں آتا ہے اور اس قلعہ میں اس کے لے جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ممکن ہے ان کا جواب درست بھی ہو کیونکہ یہ قلعہ ایک ذبح خانہ ہے جہاں جانور نہیں انسان ذبح ہوتے ہیں۔ یہ قلعہ ایک جہنم کدہ ہے جہاں انسانوں کو جلایا جاتا ہے۔ اس قلعے میں نجاست کے ڈھیر ہیں اور ان ڈھیروں کی اطہر علی اور اس کی ٹیم حفاظت کرتی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ برعظیم ہندو پاکستان کے وہ عظیم مسلمان حکمران اپنے قلعوں کو اس لئے بناتے تھے کہ انہیں جہنم کدہ بنا دیا جائے۔ کیا اس شاہی قلعہ کے ساتھ شاہی مسجد کے مینار جھک کر سوال نہیں کر رہے ہیں کہ اس قلعہ کے اندر قرآن پاک کی صدائیں گونجا کرتی تھیں اور خدا کے رسولؐ پر درود بھیجا جایا کرتا تھا۔ یہاں میزانِ عدل رکھی گئی تھی اور ظلم و ستم کے ستائے ہوئے انسان یہاں فریادی بن کر آیا کرتے تھے اور اپنی حاجت براری کے بعد واپس جایا کرتے تھے۔ لیکن اس قلعہ میں اب انسانوں کی بجائے انسان خور درندے رہتے ہیں جن کے دل میں خُدا کا خوف نہیں ہے۔ اس اسلامی مملکت میں اس سے بڑھ کر مذہب کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ انگریزی سامراجی کے زمانے میں بھی کسی نظر بند مسلمان کو قرآن پاک کے مطالعہ سے روکا

صاحب نے ہمارے خلاف وعدہ معاف گواہ بن کر جو جھوٹی شہادت دی ہے اس کے لئے ہمارے دل میں کسی طرح کی کدورت پیدا نہیں ہوئی۔ ہمارا یہ ساتھی مجسّم شرافت اور نیک سرشت انسان ہے اس کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا گیا ہے وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وہ کوٹ لکھپت جیل میں قیدی تھا تو اسے وہاں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر رہا۔ جیل کے قیدی اور ملازم اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ جیل خانے میں جب تک رہا اس کا ذہن مفلوج تھا اور ہمیشہ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ جیل تک اطہر علی کا عملہ اس کا پیچھا کرتا رہا اور انہوں نے جونہی اس کا پیچھا چھوڑا تو ڈاکٹر فاروق حیدر ایک سچے انسان کے روپ میں پھر لوٹ آیا۔ اس کی روح جاگ اُٹھی اور اس کا خفتہ ضمیر بیدار ہو گیا اور اس نے دھاڑیں مار مار کر لوگوں کو ہماری بے گناہی اور اپنی اذیت کی دردناک داستانیں سنائی ہیں۔ اسکی چیخوں کی آواز عدل کے ایوانوں تک پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر فاروق حیدر سیاسی زندگی میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اس ملک میں سیاسی کارکنوں کے ساتھ ڈاکوؤں، قاتلوں اور راہزنوں سے زیادہ بُرا سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ پولیس کے ظالمانہ ہتھکنڈوں سے ناواقف تھے۔ انہیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ عدالت میں بیان دینے کی پاداش میں وہ پولیس کے مزید ظلم و تشدّد سے محفوظ رہ سکیں گے۔ عدالت میں جب ان کے بیان ہو رہے تھے تو ان کے دل و دماغ پر مارشل لاء کا ڈراؤنا بھوت بُری طرح سوار تھا۔ پولیس کے بدنامِ زمانہ افسر ملک شفیع ڈی۔ ایس۔ پی اور احمد خاں انسپکٹر ان کے ساتھ عدالت کے اندر تک آتے تھے اور اطہر علی اور ملک صدیق ایس۔ پی عدالت کے باہر رہتے تھے اور وقفہ کے دوران ڈاکٹر فاروق حیدر پھر ظالم پولیس کے اس جھرمٹ میں اپنے آپ کو پاتے تھے۔ پولیس افسر انہیں اپنے گھیرے میں لے کر اپنی جھوٹی کہانی رٹاتے رہتے تھے۔ پولیس کے اس شرمناک فعل کی طرف ہمارے صفائی کے معزز وکیل نے قابلِ احترام عدالت کی توجہ بھی دورانِ شہادت مبذول کرائی تھی۔

قلعہ میں ہمارا ایک ایک دن ایک ایک ہزار سال کا تھا اور ایک ایک رات قیامت سی لمبی

درد کے شہر میں

احمد رئیس

موسمِ ہجر میں
درد کے شہر میں
ظلم کی چھاؤں میں
سولیوں کی گزرگاہ پر
کتنے ہی راہ رو
کتنے ہی قافلے
سوئے منزل چلے
سوئے منزل چلے
کتنے ہی راہ رو
جن کے چہروں پہ تھا عزم کا بانکپن
اک نئی سرخوشی
اک نئی زندگی
جن کے ہونٹوں پہ تھی حسن کی داستاں
پیار کا تذکرہ
جن کی نظروں کی شمعیں ضیا بار تھیں
کیف و مستی سے سرشار تھیں
جن کے دل کے نگر میں تھی پھیلی ہوئی
چاندنی ـــــــــ خلق و ایثار کی
جن کے زیر قدم

نہیں جاتا تھا لیکن اسلام کے دعوے دار حکومت کے دور میں مسلمانوں سے قرآن پاک چھین لے گئے اور انہیں پابندی سے نماز ادا کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی تھی۔

مجھے جب قلعہ سے سکھر ڈسٹرکٹ جیل پہنچایا گیا تو میں نے پہلی بار انسانوں کی شکل دیکھی اور مجھے احساس ہوا کہ سکھر جیل قلعہ کے مقابلہ میں ایک جنتِ ارضی ہے۔ میرے وطنِ عزیز کو بھی جنت ارضی سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن ہمیں اس کا اتنا شدید احساس پہلے نہ تھا جو اب پیدا ہو گیا ہے۔ میں اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے اپنی بقیہ زندگی وقف کر چکا ہوں۔ سکھر جیل میں مجھے ایک نئ دنیا ملی ہے۔ میں ویسے بھی بچپن سے سندھ میں رہتا چلا آیا ہوں اور سندھ کی دھرتی سے مجھے خاص پیار اور لگاؤ ہو چکا ہے۔ سکھر جیل کے نہ صرف سیاسی اور اخلاقی قیدیوں بلکہ عملہ کے برتاؤ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ میں سندھ کے ایک ایک ذرّے سے پیار کرتا ہوں۔ میری روح کو ایک نئی توانائی حاصل ہوئی ہے اور دورانِ حراست مجھے جس پستی میں گرایا گیا تھا اس سے پھر اُٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ میرے دل سے مایوسی اور بددلی کی وہ گھٹن دور ہو گئی ہے جو قلعہ سے ورثہ میں ملی تھی۔ میں اپنے اندر ایثار و قربانی کا پھر وہی جذبہ پاتا ہوں جو گرفتاری سے قبل موجود تھا۔ میرے نزدیک زندگی ہی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے اور میں اسے خُدا کی راہ میں لٹا کر سچی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میری جنگِ آزادی صرف کشمیر کے مظلوم عوام کو ظلم سے نجات دلانے تک محدود نہیں ہے بلکہ دُنیا پر صرف خُدا کی حکومت چاہتا ہوں۔ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانا میرا ایمان ہے اور میں ایمان کی یہ پونجی لے کر دنیا سے واپس اپنے حقیقی وطن لوٹ جانا چاہتا ہوں اور اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ میرے گناہوں کو معاف فرمائے اور دُنیا کے ظالمانہ فیصلوں کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

جی ایم لون

❂

میر عبدالقیوم

تحریکِ حریتِ کشمیر میں جموں کے میر خاندان کو نمایاں مقام حاصل ہے۔اس خاندان کے ایک بزرگ میر حسین بخش نے 1931ء میں بندشِ خطبہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے حکومتِ وقت کو للکارا تھا۔ میر حسین بخش میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان کے حقیقی تایا تھے۔

میر عبدالقیوم یکم جنوری 1919ء کو جموں شہر میں پیدا ہوئے۔انہوں نے میٹرک تک تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول جموں سے حاصل کی۔2, اپریل 1931ء کو جموں میں عیدالضحیٰ کے روز بندش خطبہ کا جو سانحہ رونما ہوا میر عبدالقیوم اپنے والد اور تایا کے ہمراہ اس مجمع میں موجود تھے۔جامع مسجد کے خطیب مفتی محمد اسحاق نے جب گائے کی قربانی کا ذکر کیا تو ڈیوٹی پر موجود ایک ہندو پولیس انسپکٹر کھیم چند غصے میں آ گیا اور اس نے مفتی صاحب کو خطبہ بند کرنے کا حکم دیا۔مفتی صاحب نے خطبہ روک دیا تو میر حسین بخش اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے گرجدار آواز میں کہا۔''انسپکٹر ہوش میں آو، جانتے ہو تم مداخلت فی الدین کے مرتکب ہو رہے ہو۔مسلمان ہر ظلم برداشت کر سکتا ہے مگر مذہب اور دین میں مداخلت کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔مسلمانوں کا یہ ہجوم اگر بپھر گیا تو تمھاری تکہ بوٹی کر دے گا۔'' سارا مجمع میر حسین بخش کی آواز سے آواز ملانے لگا۔ یہ دیکھ کر کھیم چند وہاں سے کھسک گیا۔مسلمانوں نے نماز عید ادا کی۔ننھا عبدالقیوم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔وہ اپنے تایا کے اس جرأت مندانہ اقدام سے بہت متاثر ہوا۔نمازِ عید کی ادائیگی کے بعد مسلمانانِ جموں مداخلت فی الدین کے خلاف سراپائے احتجاج بن گئے۔جموں میں حکومت مخالف جلسے جلوس آئے روز کا معمول بن گئے۔تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں حصہ لینے کے لئے اپنے بزرگوں اور

فصلِ گل

نو بہارِ چمن
انقلابِ زمن
جن کے ہاتھوں نے جب مل کے یلغار کی
ڈھا دیئے قصرِ ظلماتِ شب!
وہ جری سورما
من چلے راہ رو
سرفروشی کی دل میں تمنا لئے
روشنی کا مبارک ارادہ لئے
جب بھی آگے بڑھے
تیرگی میں افق در افق چھا گئے
رنگ چھلکا گئے
نور برسا گئے
زندگی کا لہو نذر کرتے ہوئے
احمریں صبح کے جام بھرتے ہوئے
خود نہ جانے کہاں کھو گئے
درد کے شہر میں
ظلم کی چھاؤں میں
سولیوں کی گزرگاہوں پر ــــــــــ

سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور سرحد عبور کر کے سیالکوٹ آ گئے۔ سیالکوٹ میں آ کر جموں کے سرکردہ لوگوں نے لٹے پٹے خانماں برباد مہاجرین جموں کشمیر کی بحالی اور فلاح و بہبود کے لیے ایک تنظیم قائم کی جس کا نام ''جموں کشمیر انجمن مہاجرین'' رکھا گیا۔ اس تنظیم کے صدر چوہدری محمد شریف، نائب صدر خان محمد رفیق خان، جنرل سیکرٹری میر عبدالمنان، خزانچی شیخ منظور حسین اور فنانس سیکرٹری میر عبدالقیوم کو منتخب کیا گیا۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر کو مہاجرین کے مسائل و مشکلات سے آگاہ کیا گیا۔ مذکورہ انجمن کی کوششوں سے مہاجرین کو مستقل رہائش، خوراک، روزگار اور صحت کی سہولیات بہم پہنچائی گئیں۔ انجمن نے اپنا ایک ترجمان اخبار ''آزاد کشمیر'' کے نام سے جاری کیا۔ راست گوئی اور بے باکی کے سبب یہ اخبار زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ حکومتِ پاکستان نے اس کی بندش کے احکامات جاری کر دیئے۔

اپریل 1948ء میں میر عبدالقیوم انجمن مہاجرین کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر تلاشِ معاش کے سلسلے میں پہلے لاہور اور پھر کراچی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کریسنٹ پبلسٹی سروس کے نام سے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی قائم کر لی۔

کراچی منتقل ہونے کے بعد تقریباً ایک سال تک تو میر عبدالقیوم صرف اپنے کاروباری معاملات میں الجھے رہے۔ بالآخر انہوں نے اور خواجہ عطاء اللہ نے مل کر منصوبہ بنایا کہ کراچی میں جموں کشمیر کے مہاجرین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے انھیں منظم و متحد کیا جائے۔ کراچی میں انھوں نے مہاجرین کشمیر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تلاش کیا اور انھیں کمیٹیوں میں شامل کیا۔ جب ہر سیکٹر میں کمیٹیاں بن گئیں تو ایک جنرل اجلاس بلایا گیا۔ مسٹر کے۔ ایچ۔ خورشید ان دنوں کراچی میں وکالت کر رہے تھے۔ انھیں مہاجرین کی اس جماعت کی صدارت سنبھالنے کی پیش کش کی گئی جو انہوں نے قبول کر لی۔ فائز لیبارٹریز کے محمد شفیع جماعت کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ اس جماعت کا نام ''جموں سوشل اینڈ ویلفیئر ایسوسی ایشن'' رکھا گیا۔

1958ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے خلاف جو سخت ردِعمل ہوا اس میں کراچی کے کشمیریوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کشمیر آرٹ ایمپوریم میں کشمیریوں کی ایک

بڑوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جموں کے کم عمر لڑکوں نے بھی ایک تنظیم ''انجمن اطفالِ اسلام'' قائم کی تھی۔ اس کے صدر غازی اسمٰعیل اور سیکرٹری جنرل میر عبدالقیوم مقرر ہوئے۔ سری نگر میں 13 جولائی 1931ء کے روح فرسا واقعہ کے نتیجے میں جب حکومت مخالف تحریک پوری ریاست میں پھیل گئی تو جموں اور سری نگر اس تحریک کے مرکز قرار پائے۔

حکومت مخالف احتجاجی مظاہروں میں شرکت کی پاداش میں بارہ برس کی عمر میں میر عبدالقیوم اپنی تنظیم کے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار ہوئے۔ 3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کا منصوبہ پیش ہوا تو ریاست جموں کشمیر میں بھی ہندو مسلم کی بنیاد پر کشیدگی بڑھنے لگی۔ جموں میں راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ غیر مسلموں کو مسلح کرنے لگیں تو مسلمانوں میں بھی عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا چنانچہ جموں میں مسلم نیشنل گارڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ میر عبدالقیوم اس تنظیم میں شامل ہوئے اور اس کے شعبہ فنانس کے انچارج مقرر ہوئے۔ 14 اگست کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو جموں کے مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش سے جلسے جلوس نکالے اور ''پاکستان ڈے'' منایا۔

قیامِ پاکستان کے بعد جموں میں حالات کشیدہ ہوتے چلے گئے۔ مسلمانانِ جموں کو مستقبل کے پیش آمدہ خطرناک حالات سے بچانے کے لیے میر خاندان کے بزرگوں، نوجوانوں اور عورتوں نے اہم کردار ادا کیا۔ 22 اکتوبر 1947ء کو مظفرآباد پر پاکستان کی طرف سے قبائلی حملے کے نتیجے میں جب جموں میں چھ نومبر کو قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی تو ان حالات میں میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان نے نہایت جرأت مندانہ کردار ادا کیا۔ مسلم کانفرنس کے بیشتر سرکردہ راہنما جموں شہر سے فرار ہو کر پاکستان میں پناہ گزین ہو گئے۔ مسلمانانِ جموں نے بےکسی اور بےبسی کی حالت میں تھے۔ جموں کے بے دست و پا مسلمانوں نے چند روز تک تو حملہ آور ہندوؤں کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر وہ ان کے تابڑتوڑ خونی حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حکومت نے جموں کے ان مسلمانوں کو جو پاکستان جانے کے خواہش مند تھے، انھیں پولیس لائن میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ ان ہزاروں پناہ گزینوں کو بسوں میں سوار کر کے پاکستان بھیجنے کے بہانے شہر سے نکال کر راستے میں ان کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان اور ان کے خاندان کے کچھ لوگ اس قتلِ عام

پیدائشی حقِ خود ارادیت دلانے کے لیے جدوجہد کرے۔ چنانچہ کراچی میں محمد شفیع صاحب کے گھر ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں سردار گوہر رحمان نے بھی شرکت کی اور فیصلہ کیا گیا کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کی طرز پر یہاں بھی محاذ رائے شماری کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ کراچی میں محمد شفیع، گوہر رحمان اور میر عبدالقیوم وغیرہ کی شب و روز کوششوں کے نتیجے میں ایک بار پھر حلقہ وار کمیٹیاں بنائی گئیں اور جون 1964ء میں کراچی میں جنرل اجلاس بلایا گیا۔ جس میں 300 افراد نے شرکت کی۔ چنانچہ متفقہ طور پر میر عبدالقیوم کو کراچی کی ایڈہاک کمیٹی کا کنویئر بنایا گیا۔ چنانچہ 4,3 اپریل 1965ء کو سیالکوٹ کے مقام پر ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا جس میں کراچی سے خیبر تک اور بھمبر سے مظفر آباد تک نمائندہ کشمیریوں نے شرکت کر کے جموں کشمیر محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان کا قیام عمل میں لایا۔

محاذ کا ابتدائی تنظیمی ڈھانچہ حسب ذیل تھا۔

عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ (میر پور)	صدر
غلام محمد لون (کراچی)	سینئر نائب صدر
امان اللہ خان	سیکرٹری جنرل
مجید امجد بٹ	جوائنٹ سیکرٹری
محمد مقبول بٹ	پبلسٹی سیکرٹری
جی ایم خان	اسسٹنٹ سیکرٹری
میر عبدالقیوم	خزانچی

یہ انتخاب عمل میں آنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ سوچیت گڑھ جا کر No Man,s Land کے اُس پار سے مادرِ وطن جموں کشمیر کی مٹی لا کر اُس کو ہاتھوں میں تھام کر حلف اٹھایا جائے کہ مادرِ وطن کی مکمل آزادی و خود مختاری کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

محاذ رائے شماری میں شمولیت کے بعد میر عبدالقیوم اپنی سیمابی طبیعت کے سبب محض جلسے،

میٹنگ منعقد ہوئی جس میں جموں اور وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے کشمیریوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں جی۔ ایم۔ لون بھی شریک تھے۔ میٹنگ کی صدارت کے۔ ایچ۔ خورشید نے کی۔ اتفاقِ رائے سے طے پایا کہ کراچی میں کشمیریوں کی ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے۔ چنانچہ ایک ایڈہاک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کے کنوینر کے ایچ خورشید اور سیکرٹری جنرل مظفر درانی کو منتخب کیا گیا۔ متفقہ طور پر طے پایا کہ اس تنظیم کا نام ''کشمیر لبریشن مومنٹ'' (KLM) رکھا جائے۔ انہی دنوں مسلم کانفرنس کے مرکزی راہنما چوہدری غلام عباس کراچی کے دورے پر تشریف لے گئے۔ وہ حکومت کے خلاف کوئی تحریک شروع کرنا چاہتے تھے۔ جب انھیں پتا چلا کہ کراچی میں KLM کے نام سے ایک تنظیم قائم ہو چکی ہے تو انھیں یہ نام پسند آیا اور انہوں نے تحریک کا نام KLM رکھ لیا۔ چوہدری غلام عباس نے میر عبدالقیوم سے بھی ملاقات کی کیونکہ میر صاحب نے کراچی میں کشمیریوں کو منظم کرنے میں اب تک سب سے اہم اور بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ چوہدری غلام عباس نے میر عبدالقیوم اور ان کے رفقاء کو KLM میں شمولیت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی خاطر یہ لوگ چوہدری غلام عباس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ KLM کا آغاز ہوا تو کراچی کے کشمیریوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن مرکزی قائدین کی گرفتاری کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔

اس تحریک کے نتیجے میں سردار ابراہیم خان کو کرسیٔ صدارت سے الگ کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ کے۔ ایچ۔ خورشید کو 1959ء میں آزاد کشمیر کا صدر نامزد کیا گیا۔ کے۔ ایچ۔ خورشید نے پہلی بار آزاد کشمیر میں بنیادی جمہوریتوں کا نظام (بی ڈی سسٹم) متعارف کروایا۔ تو کراچی سے میر عبدالقیوم بھی بی ڈی ممبر منتخب ہوئے، کے ایچ خورشید کے صدارتی انتخاب میں انہی 2400 بی ڈی ممبران نے حصہ لیا تھا۔ میر عبدالقیوم نے صدارتی امیدوار کے ایچ خورشید کی حمایت کی۔

1964ء میں مسٹر کے ایچ خورشید کو حکومت پاکستان نے جس شرمناک اور گھناؤنے انداز سے کرسیٔ صدارت سے الگ کر کے پس دیوارِ زنداں دھکیل دیا اس سے کشمیر کے آزادی پسندوں اور حریت پسندوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ریاست گیر منظم سیاسی جماعت قائم کی جائے۔ جو حقیقی معنوں میں کشمیری عوام کی ترجمان ہو اور کشمیریوں کو ان کا

فارم سے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں باقاعدہ سرگرمیاں شروع کرنے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جی ایم لون صاحب سے بھی بات چیت کی۔ میجر امان اللہ کو بھی پشاور سے کراچی بلایا گیا۔ NLF کے منصوبے پر تفصیلی غور و فکر کے بعد بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ایک گوریلہ دستہ بھیجنے پر اتفاق رائے ہوا۔ مالی وسائل اور دیگر تمام انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔ طے پایا کہ میجر امان اللہ اور مقبول بٹ چند کارکنوں کے ہمراہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوں گے اور وہاں تنظیمی و سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کریں گے۔ مسٹر امان اللہ خان نے مقبول بٹ کے اہلِ خانہ کی مالی اعانت کا ذمہ اٹھایا۔ بھارتی کشمیر روانگی کے وقت میجر امان اللہ کو کراچی سے کل 21 ہزار روپے فراہم کیے گئے جن مین جی۔ ایم۔ لون نے 12 ہزار، میر عبدالقیوم نے 7 ہزار اور امان اللہ خان نے 2 ہزار روپے عطیہ دیا۔ جون 1966ء میں NLF کا مشن بھارتی مقبوضہ میں داخل ہو گیا۔ اس گروپ نے مقبول بٹ کی سربراہی میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا لیکن راز افشا ہونے پر بھارتی سیکورٹی فورسز کی ایک کارروائی کے دوران مسلح جھڑپ کے نتیجے میں اورنگ زیب شہید ہو گیا۔ جب کہ صوبیدار کالا خان، میر احمد اور مقبول بٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس گرفتاری کی خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ میجر امان اللہ گرفتاری سے بچ گئے اور واپس آ گئے۔ مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کی خبر پھیلنے پر تنظیم کے ترجمان امان اللہ خان نے پریس کانفرنس کے ذریعے NLF کے قیام اور اغراض و مقاصد کو مشتہر کر دیا۔ یہ راز افشا ہونے پر پاکستان کے انٹیلی جنس اداروں نے اور افسر شاہی نے محاذ رائے شماری اور NLF کے لیڈروں کا گھیراتنگ کرنا شروع کر دیا اور ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔

بھارتی مقبوضہ کشمیر سے واپس آ کر میجر امان اللہ نے NLF کے اپنے ساتھیوں کو تمام تفصیلات بتائیں۔ انہوں نے کراچی کے دورے کے دوران میر عبدالقیوم اور جی ایم لون کو تحریک آزادی کشمیر کے لیے مزید 50 ہزار روپے فراہم کرنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ طے پایا کہ میجر امان اللہ کراچی میں کچھ عرصہ قیام کریں اور میر عبدالقیوم کے ہمراہ مخیر حضرات سے مل کر پیسے کا بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ میر عبدالقیوم اپنے کاروباری دوستوں اور دیگر مخیر کشمیری حضرات کے پاس میجر

جلوسوں ،نعروں اور قرار دادوں پر یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ محاذ رائے شماری کو انقلابی خطوط پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب امان اللہ خان اور مقبول بٹ نے محاذ رائے شماری میں ایک عسکری ونگ بنانے کا منصوبہ بنایا تو میر عبدالقیوم بھی اس منصوبے میں شامل ہو گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جب تک بھارت کی کمر نہ توڑی جائے اس وقت تک بھارت کشمیر سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ 12, مئی 1965ء کو کراچی سے امان اللہ خان اور میر عبدالقیوم پشاور کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوئے۔ پشاور ائیر پورٹ پر مسٹر مقبول بٹ نے انھیں خوش آمدید کہا۔ ائیر پورٹ سے یہ لوگ سیدھے میجر امان اللہ کے گھر پہنچے اور وہاں ایک خصوصی میٹنگ میں بحث و تمحیص اور غور وفکر کے بعد طے پایا کہ بھارت مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لیے نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جائے جو گوریلہ جنگ کا آغاز کرے۔

مقبول بٹ اور میجر امان اللہ سے میر عبدالقیوم کی یہ پہلی روبرو ملاقات تھی۔ اس موقع پر جموں کشمیر کی آزادی کے لیے ایک حلف پر دستخط لیے گئے۔ اور چاروں افراد نے حسب ذیل فرائض سنبھالے۔

1- اپریشنل ونگ زیر سربراہی میجر امان اللہ

2- سیاسی و پبلسٹی ونگ زیر سربراہی امان اللہ خان

3- فنانس ونگ زیر سربراہی میر عبدالقیوم

4- کوآرڈی نیشن ونگ زیر سربراہی مقبول بٹ

این۔ایل۔ایف کے شعبہ مالیات کو میر عبدالقیوم صاحب نے نہایت دیانت داری اور ایمان داری سے چلایا اور تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا۔

این۔ایل۔ایف کے تمام ممبران نے کوڈ نام اختیار کیے، میر عبدالقیوم کو کوڈ نام ''خالد'' دیا گیا۔ 14, اگست 1965ء کو راولپنڈی میں محاذ رائے شماری کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں 1965ء کی جاریہ جنگ کے حق میں قرارداد منظور کی گئی۔

اکتوبر 1965ء میں مقبول بٹ کراچی آئے اور میر عبدالقیوم کو بتایا کہ NLF کے پلیٹ

اور جاوید ساغر کے نام جاری کی گئی۔

1970ء کو آزاد کشمیر میں ایک ایکٹ نافذ کیا گیا تو محاذ رائے شماری نے اسے دستاویز غلامی کا نام دیتے ہوئے اسے رد کر دیا اور اس ایکٹ کے خلاف عوامی رابطہ مہم شروع کی۔ اسی ایکٹ کے تحت اکتوبر 1970 کو ہونے والے صدارتی انتخابات کا بھی بائیکاٹ کیا گیا۔ جمہوریت اور انتخابات کے نام سے رچائے جانے والے ڈرامے کو محاذ کے قائدین نے بے نقاب کیا۔

15 تا 23 نومبر 1970ء کو محاذ نے گلگت بلتستان کے عوام کے حقوق کی خاطر ہفتہ گلگت بلتستان منایا۔ اس سلسلے میں زبردست عوامی مہم شروع کی گئی۔ محاذ کا ایک اعلیٰ سطحی وفد گلگت بھیجا گیا۔ محاذ کے قائدین کو حکومتِ پاکستان نے گلگت بدر کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ کو تین ماہ تک قید با مشقت کی سزا دی گئی۔

گلگت بلتستان کی خاطر جد و جہد میں میر عبدالقیوم اور کراچی برانچ کے دیگر ساتھیوں نے مرکزی تنظیم کو ہر ممکن مالی امداد فراہم کی اور جلسے جلوس اور مظاہروں میں بھرپور شرکت کی۔

بھارتی طیارہ گنگا کے اغواء کی پاداش میں محاذ رائے شماری کے صفِ اول کے جن راہنماؤں کو گرفتار کر کے قید و بند اور وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا ان میں میر عبدالقیوم بھی شامل تھے۔ میر صاحب کو کراچی سے 27 اپریل 1971ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ دورانِ قید وہ جس وحشیانہ سلوک کا نشانہ بنے اس کی روئیداد آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے۔ میر عبدالقیوم نے عدالت العالیہ پاکستان میں اپنی صفائی میں جو بیان جاری کیا تھا وہ ''اب منزل دور نہیں'' کے عنوان سے کراچی سے بعد ازاں کتابی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کا پیش لفظ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس پیش لفظ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کشمیر کی تاریخ کے موجودہ دور میں بھی میر حسین بخش کے نقشِ قدم پر چلنے والے اُن کے اپنے خاندان سے اور افراد بھی سامنے آتے ہیں۔ ان سب میں نمایاں قربانی دو سگے بھائیوں نے دی۔ میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان اور ہماری دانست میں ان دو بھائیوں کی قربانی اتنی عظیم ہے کہ

امان اللہ کو لے گئے اور انھیں اپنی ضرورتوں سے آگاہ کیا۔ لوگوں نے کشمیر کی تحریکِ آزادی کی خاطر بڑھ چڑھ کر تعاون پیش کیا۔ میجر امان اللہ کو مختلف اوقات میں میر عبدالقیوم نے 34,900 روپے فراہم کیے۔ میر عبدالقیوم کی ہمراہی میں میجر امان اللہ نے سیالکوٹ اور راولپنڈی میں بھی فنڈز اکٹھے کرنے کی مہم چلائی جس کے نتیجے میں کل 40 ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ اتنی خطیر رقم ہاتھ آنے کے بعد میجر امان اللہ کی نیت بدل گئی۔ مسٹر امان اللہ خان سے ان کے خانگی حالات بھی کشیدہ ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے عملاً NLF سے کنارہ کش ہو کر جمع شدہ رقم ہڑپ کر گئے۔ میر عبدالقیوم کو میجر امان اللہ کے اس رویے سے بہت دُکھ پہنچا۔ اور وہ سخت دلبرداشتہ ہوئے۔ جب دسمبر 1968 میں سری نگر جیل سے فرار ہو کر مقبول بٹ آزاد کشمیر میں داخل ہوئے تو FIU نے انھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ چند ماہ بعد انھیں رہا کیا گیا۔ تو انہوں نے آزاد کشمیر اور پاکستان کے مختلف شہروں کا تفصیلاً دورہ کیا۔ کراچی کے دورے کے دوران میر عبدالقیوم سے ہونے والی ملاقات میں طے پایا کہ بٹ صاحب خود اپنی نگرانی میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گوریلا کارروائیاں جاری رکھیں اور اس کے لیے جس حد تک مالی معاونت کی ضرورت ہو گی اس کا بندوبست کیا جائے گا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں لٹریچر پہنچانے کی ایک مہم شروع کی گئی امان اللہ خان کا لکھا ہوا کتابچہ ''الفتح اور کشمیری نوجوان'' بڑی تعداد میں بھارتی مقبوضہ کشمیر بھیجا گیا۔ دیگر کئی موضوعات پر مشتمل لٹریچر بھی بھیجا گیا۔ اس لٹریچر پر اٹھنے والے بیشتر اخراجات محاذ کی کراچی برانچ نے برداشت کیے۔

5,4 نومبر 1969ء کو مظفر آباد میں محاذ رائے شماری کا ایک تاریخی کنونشن منعقد ہوا جس میں تنظیم کی تشکیل نو عمل میں لاتے ہوئے مقبول بٹ کو تنظیم کا مرکزی صدر مقرر کیا گیا۔ جب کہ میر عبدالمنان سیکرٹری جنرل نامزد ہوئے۔

مئی 1970ء کو حکومت پاکستان نے محاذ رائے شماری اور NLF کے سات اراکین کے نام ایک وارننگ جاری کی جس میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ وہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں جاری اپنی سرگرمیاں فوراً بند کر دیں کیونکہ اس سے بھارت کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہونے کا خطرہ ہے۔ یہ وارننگ مقبول بٹ، ڈاکٹر فاروق حیدر، جی۔ ایم۔ لون، میر عبدالمنان، میر عبدالقیوم، امان اللہ خان

کی بات ہے کہ اگر میر نذیر پر ڈھائے گئے مظالم کی مثال ڈھونڈنا ہو تو وہ بھی بالآخر میر حسین بخش کے خاندان ہی سے ملے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ میر نذیر سے بھی زیادہ ظلم جناب میر قیوم اور میر منان پر ہوا ہے۔ لیکن حقیقی ظلم یہ ہے کہ میر حسین بخش کے خاندان کے افراد پر ظلم کی انتہا لاہور کے شاہی قلعہ میں پاکستانی پولیس کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ کشمیر کی تاریخِ حریت کا سب سے دلخراش باب ہے۔

بھارتی حکومت کا میر نذیر اور رشید پر ڈھایا ہوا ظلم وتشدد ہماری سمجھ میں آسکتا ہے ہمیں اس پر افسوس نہیں فخر ہے۔ لیکن پاکستانی پولیس کا میر قیوم اور میر منان پر تشدد! یہ ایک اس قدر دردناک اور ساتھ ساتھ مجہول منظر ہے کہ ہمارے ہونٹ چپ اور ہماری آنکھیں خشک ہیں۔ یحییٰ خان کے منحوس ٹولہ نے یہ کیا عجیب سوانگ رچایا تھا۔ میر حسین بخش، میر نذیر اور میر رشید کے خون کو بھارتی جاسوس ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اے کاش! یحییٰ خان کا منحوس دور اس سرزمین پر کبھی نہ آیا ہوتا۔ یہ فاتر العقل شخص تو کشمیر کی تاریخ کے ابجد سے بھی واقف نہ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اگر میر قیوم اور میر منان بھارتی جاسوس ہوں تو پھر سارے کشمیر میں کوئی محبِ وطن نہیں۔ اے بیوقوف یحییٰ خان! میر قیوم اور میر منان تو وہ شخص ہیں جن سے منصوب ہو کر بھارتی جاسوسی کے الزام نے بذاتِ خود رفعت حاصل کر لی ہے۔

میر قیوم کے اس بیان کو پڑھ کر ہر باغیرت کشمیری کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ ہائی جیکنگ کی تفتیشی ٹیم کا انچارج جو کہ ہندوستان سے مہاجر ہو کر آیا تھا دراصل ایک مخبوط الحواس اور نیم پاگل شخص ہے لیکن یہ کیا بدقسمتی ہے کہ اس شخص کی مخبوط الحواسی کا تمام خمیازہ کشمیر کے سب سے زیادہ حریت پسند اور عزت مآب خاندان کو بھگتنا پڑا ہے۔

ہمیں اس عدالتی بیان سے علم ہوا ہے کہ لاہور شاہی قلعہ

شاید کشمیر کی تاریخ کا رُخ متعین کر لے۔ کشمیر کا موجودہ دَور میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان کا دَور ہے۔ ہوا یوں ہے کہ پاکستان اور کشمیر کے عوام سے مسئلہ کشمیر پر ایک طویل عرصہ تک فراڈ کھیلا جاتا رہا ہے۔ اس ملک پر مسلط نوکر شاہی اور دیگر مفاد پرست طبقہ دانستہ طور پر کوشش کرتا رہا ہے کہ کشمیری عوام اپنے وطن کو خود اپنی طاقت پر بھروسہ کر کے جدوجہد آزادی شروع نہ کر دیں۔ ان قابلِ نفرت لوگوں نے عوام کو محض دلفریب نعروں ہی میں الجھائے رکھا ہے۔ میر عبدالقیوم اور میر عبدالمنان کے سینہ میں حریت کی لَو تو سَدا جلتی ہی رہی تھی لیکن پاکستان اور کشمیری عوام کے ساتھ ہوتے ہوئے اس فراڈ کے منظر کو دیکھ کر پوری آنچ پر آ گئی۔ ایک بار پھر میر حسین بخش کے بھتیجوں نے خم ٹھونکا۔ علمِ بغاوت بلند کیا اور سینہ سپر ہو کر میدان میں آ گئے۔ اس جرم کی پاداش میں ہمت کے ان جیالوں پر جو گزری ہے اس کی مختصر داستان قارئین کے سامنے اس عدالتی بیان کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔

غالباً پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین باب اِن دو ذی وقار بھائیوں پر یہاں کی پولیس کا تشدد ہے۔ تشدد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آنکھ کے ان تاروں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو انہوں نے امام حسین علیہ السلام کی سی ثابت قدمی سے برداشت کیا۔ آخر کیوں نہ کرتے۔ ان کا تو تمام خاندان ہی حسینی رنگ میں رنگا ہوا ہے لیکن شاید ہی کوئی کشمیری لاہور کے شاہی قلعہ کے یزیدوں کو معاف کر سکے گا۔ یہ اٹل ہے کہ کشمیر کی تاریخ میں **اطہر** اور اس کے ٹولہ کا نام **یزید** کی طرح ذلیل ہو گا۔ جو مظالم اس خبط الحواس پولیس افسر نے قمر العالم اور اس قماش کے دوسرے پولیس افسروں کے ذریعہ ہمارے محترم قائدین پر کروائے وہ ناقابلِ معافی ہیں۔ یہ بھی کتنی ستم ظریفی

کے سرہانے رینگ کر آئیں اور تجھ سے گڑگڑا کر اپنے ظلم کی معافی کی درخواست کریں۔

اے حسین بخش! تو مجاہد تھا اور بے مثال دلیر تھا۔ ظالموں کو معاف کرنا یا راندہ درگاہ کرنا تیرا اختیار ہوگا۔ لیکن وہ قوم جس کے لیے تو نے اس قدر قربانی دی ہے اتنا ضرور کرے گی کہ تیرے خاندان پر ظلم کرنے والے جانور نالی کے کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے تیرے پاس آئیں اور تجھ سے خطا پوشی کی بھیک مانگیں"۔ ("اب منزل دور نہیں" صفحہ 10)

آج جو سلسلہ ء دار سے وابستہ ہیں
کل یہی لوگ تو تاریخ کا عنواں ہوں گے

اب بغاوت پہ تُل گیا ہوں میں
جتنی چاہے تُو مشکیں کس میری

(احمد عطاء اللہ)

میں پولیس نے میر حسین بخش کے خاندان کی عفت مآب بیبیوں کو زبردستی بلوا کر رسوا کرنے کی دھمکی دی۔ یہ ذلالت کی انتہا ہے ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔ ایک عام خاتون کے بارے میں بھی یہ دھمکی ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن میر حسین بخش کے خاندان کی بیٹیوں کے بارے میں اس دھمکی کو سُن کر ہر کشمیری اور پاکستانی کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے۔ میر حسین بخش نے پاکستان کے لیے قربانی دی تھی لیکن جہاں تک ہم کشمیریوں کا تعلق ہے ہم یعنی وہ لوگ جن کے جسم کا ہر رونگٹا میر حسین بخش کے خاندان کا زیرِ احسان ہے اور تا قیامت اِس احسان کے تلے رہے گا۔ اس میر حسین بخش کا جس نے ہماری آزادی کی خاطر اپنے خون کو بہانے سے دریغ نہ کیا۔ ہمارے سر میں تو منوں خاک پڑ گئی ہے، ہمارے ذہن ماؤف ہو گئے ہیں۔ ہماری زبانیں گنگ ہیں۔ ہمیں کچھ بجھائی نہیں دے رہا!!۔

اے حسین بخش ہمیں یقین ہے تو اس صورتِ حالات سے اپنی قبر میں بے چین ہو گا لیکن اے محترم قائد! صبر کر تو نے ہی اس قوم کو اُٹھ کر ظلم کا گلا دبوچ لینے کا سبق سکھایا ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب تیرے خاندان کی بیبیوں کو دھمکیاں دینے والے یہ ظالم اپنے ظلم پر بہت نادم ہوں گے۔

اے حسین بخش! یہ تجھ سے ہمارا وعدہ رہا کہ اس ملک میں آئندہ کوئی شخص کسی خاتون کو لاہور کے شاہی قلعہ میں بلوا کر رسوا کرنے کی دھمکی دینے کی جرأت نہ کرے گا!

اے حسین بخش! وہ دن بہت نزدیک ہیں جب درجنوں اطہر تیرے مرقد کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوں گے تا کہ وہ تیری قبر

وہ کون سا جذبہ تھا جس نے اس پیرانہ سالی میں جبکہ انسان ریٹائر ہو جانے کی فکر میں ہوتا ہے اور پھر جبکہ میرے اُوپر انتہائی محنت طلب کاروبار کے علاوہ اپنی جواں سال بچیوں کی شادیوں کی ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ بھی موجود تھا۔ میں نے کیوں اِن ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے ایک ایسی تنظیم میں شمولیت اختیار کی جو صرف نوجوانوں کے لیے باعثِ کشش ہو سکتی تھی۔ اپنے معمر ہونے کا خیال کیے بغیر میں نے کیوں اِس آگ میں بے خطر کودنے کو ترجیح دی اور کشمیر کے مردہ مسئلے کو صدارتوں، وزارتوں، مصلحت کوشیوں اور کانفرنسوں کے سرد خانے سے نکالنے اور اسے نئے رنگ اور نئے ڈھنگ پر لے جانے والے اپنے زیرک، نڈر اور دانشورانہ صلاحیتوں کے مالک ساتھیوں سے مل کر دیوانوں کی طرح ہر اس تحریک کا جو استخلاصِ وطن کے لیے خالی خولی نعروں کی بجائے عملی صورت میں شروع کی گئی، کا کیوں پوری طرح ساتھ دیا۔ اگر اس ملک (پاکستان) کی باگ ڈور مخلص محبِ وطن اور دردِ دل رکھنے والے عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ نہ صرف ہمارے نظریات کا خیر مقدم کرتے بلکہ ہمارے راستے کی مشکلات دُور کر کے ہمارے لیے بڑی آسانیاں پیدا کرتے تاکہ ہم وطن کی آزادی کی تحریک کو زیادہ بہتر طریقہ سے آگے بڑھا سکتے مگر اس ملک کی باگ ڈور اقتدار پرست، خود غرض اور ابن الوقت لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوتی چلی گئی جن کی زندگی کا مقصد صرف مسندِ اقتدار پر قائم رہنا اور کشمیر کی آزادی کے مسئلے کو استعمال کر کے اپنی کرسیوں کو بچانا تھا اس لیے ہم محض اُن کی کشمیر پالیسی سے اختلاف رکھنے کے باعث اُن کی آنکھوں میں بُری طرح کھٹکنے لگے اور پھر وہ ہمیں کچل دینے کے منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں رہے۔ سابق صدر ایوب اور یحییٰ کی ملٹری رجیم منسٹری آف کشمیر افیئرز کے علاوہ سردار قیوم خان پوری طرح جانتے تھے کہ ہم گزشتہ پانچ سال سے کن خطوط پر کام کر رہے ہیں اور یہ کہ کشمیر کی آزادی کے لیے یہی ایک بہترین راستہ ہے۔ سردار قیوم خان الیکشن سے پہلے ہمارے دفتر بھی آئے تھے اور جماعت کے ذمہ دار لوگوں کی موجودگی میں مقبوضہ کشمیر میں گوریلا سرگرمیوں پر تبادلہ خیالات بھی کیا تھا اور یہ خواہش بھی

عدالتی بیان

(اب منزل دور نہیں)

اس مقدمے میں پاکستان کی سابقہ ''ملٹری رجیم'' نے مجھ جیسے محب وطن اور کشمیر کے فدائی پر ایسے بھیانک اور گھناؤنے الزامات لگائے ہیں جن کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ 1947ء کے قتلِ عام میں میرے خاندان کے کئی افراد صرف اِس وجہ سے نہایت بے دردی سے شہید کر دیئے گئے کہ وہ پاکستان کے حامی تھے اور پھر اُن شہداء کی لالہ زار لاشوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے بھیڑیئے میری اور میرے بھائی میر عبدالسنان کی لاشیں اس لیے تلاش کرتے رہے تاکہ انہیں تسکین ہو سکے کہ پاکستان کے نظریہ کو اُجاگر کرنے والوں کے ٹکڑے کر دیئے گئے اور یہ کہ وہ پاکستان زندہ سلامت نہ جا سکے۔ میری زندگی کا ایک طویل حصہ ظالم و جابر ڈوگرہ حکومت اور مکار و دغاباز بھارتی سامراج کی مخالفت میں گزرا ہے۔

اِن الزامات کی روشنی میں میرے لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنی 53 سالہ زندگی، خاندان اور وطنِ عزیز کے اس دور کے وہ تمام حالات و کوائف سامنے لاؤں جس سے مجھے واسطہ پڑا تھا تاکہ عدالت عالیہ میرے ماضی سے پوری طرح روشناس ہو سکے اور ساتھ یہ پتہ چل سکے کہ میں نے کیسے ناموافق دور میں ہوش سنبھالا۔ کِن حالات و واقعات سے متاثر ہو کر بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں ڈوگرہ مہاراجہ کی حکومت کے خلاف آواز بلند کی اور اس پُر خار میدان میں قدم رکھا۔

تھے اس لیے وہ خوش ہونے کی بجائے ہمیں زک پہنچانے کے منصوبے بنانے لگے۔

گنگا طیارہ جلانے کا ہمارا کوئی پروگرام نہ تھا کیونکہ بھارت جیسے مکار اور دغا باز ملک کو ہم خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے اور کوئی ایسی چیز نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے پاکستان کی مشکلات میں اضافہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ جب ہم آغا افضل چیف سیکرٹری پنجاب سے غیر رسمی طور پر ملے تو ہم نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر دیا اور ہماری جماعت کے ایک دانشور جناب غلام محمد لون صاحب نے آغا افضل صاحب کو صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جس مقصد کے لیے جہاز اغواء کیا گیا ہے وہ پورا ہو چکا ہے۔ آپ اگر جہاز کو اپنے کنٹرول میں کرنا چاہتے ہیں تو مقبول بٹ صاحب کو کہہ دیں تا کہ جہاز آپ کے حوالے کر دیا جائے۔ اس سے آپ کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور ہم بھی عوام کو جواب دینے کے قابل ہو سکیں گے جس پر افضل آغا صاحب نے جواب دیا تھا کہ ہائی جیکنگ کا واقعہ ہمارے لیے بالکل نیا ہے۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ ویسے سواریوں کو بحفاظت جہاز سے نکالنا حکومت کا فرض تھا وہ ہم ادا کر چکے ہیں، رہا جہاز تو یہ محاذِ آزادی کی ملکیت ہے، اسے رکھیں یا تباہ کریں ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

حکومت چاہتی تو کسی بھی وقت جہاز اپنے کنٹرول میں لے سکتی تھی مگر چونکہ حکمران ٹولہ کی نیت خراب تھی اور اُن کے دل میں چور آ گھسا تھا اور وہ گنگا کے اغواء کے سنہری موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے جہاز کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے بجائے اس کے جلنے کے حالات خود پیدا کیے اور اس طرح ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت انہوں نے ہاشم و اشرف کو ورغلا کر جہاز جلانے کے لیے ہموار کیا۔ یوں ایک طرف انہیں یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملا کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کی پروازیں بند کرنے کے لیے شاطرانہ چال چلی ہے اور گنگا کو خود اغواء کرایا ہے اور دوسری طرف این۔ ایل۔ ایف کے قابلِ فخر کارنامہ کی وجہ سے عوام میں جو نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا تھا اور کشمیریوں کے متعلق اُن کے دلوں میں قدر و منزلت کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے انہیں کچل دینے کے لیے دو دھاری تلوار کا وار کیا اور پھر فوراً ہمارے خلاف حکومت کی مشینری حرکت میں آ گئی۔

ظاہر کی تھی کہ اس تحریک کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے وہ بھی ہمارے ساتھ ''**المجاہد**'' نام سے کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہماری جماعت کے ساتھ صرف اُس جماعت کا سمجھوتہ ہو سکتا تھا جو پہلے ''فیلڈ'' میں اپنا وجود قائم کرے اور عملی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہو۔ ہم ایسی کسی جماعت سے ملنے کو تیار نہ تھے جو صرف نعرہ بازی کا سہارا لیتی ہو۔ اس طرح سردار قیوم مایوس ہو کر تشریف لے گئے چونکہ ہم سابقہ ''ملٹری رجیم'' کے منظورِ نظر نہ تھے اس لیے وہ ہماری ہر کارروائی کو کشمیری و پاکستانی عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے ہماری خبروں کو بلیک آؤٹ کرنے کے سلسلہ میں پریس کو ہدایات دیتے رہے اور اس طرح ہماری کارروائیاں اخبارات میں بڑی مشکل سے آتی تھیں۔ اعلانِ تاشقند کے بعد کشمیریوں میں بددلی کے آثار کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا جس کے لیے کشمیریوں کی طرف سے کوئی ایسا کارنامہ انجام دینے کی ضرورت تھی جس سے کشمیریوں کی مایوسی بھی دُور ہو جائے اور عالمی رائے عامہ بھی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس کے ساتھ ہی آزادی پسند اقوام کی ہمدردیاں بھی حاصل کی جا سکیں اور دنیا پر بھی یہ ثابت کیا جا سکے کہ کشمیری بھی ایک زندہ قوم ہیں جو گوریلا سرگرمیوں پر یقین رکھتی ہے اور ان کے دِلوں میں بھارت کے خلاف ایک لاوا اُبل رہا ہے۔ چنانچہ بھارتی طیارہ گنگا کا اغوا اِس جدوجہد کا ایک حصہ تھا جس نے ثابت کر دیا کہ کشمیری نوجوان بھی دوسری زندہ قوموں کی طرح بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر دُنیا کو حیران و ششدر کرنے کی صلاحیت اور جذبہ رکھتے ہیں۔ ''گنگا'' کو لاہور کے ہوائی اڈا پہ اتارنے سے ہمارا مقصد ایک حد تک پورا ہو چکا تھا۔

ہوائی جہاز کے اغواء کی خبر کو جہاں دُنیا بھر کے اخبارات نے شہ سرخیوں سے شائع کیا وہاں پاکستان کے اخبارات بھی اس خبر کو نہ روک سکے اور اس طرح ''ملٹری رجیم'' کی تمام پابندیوں کا بند ٹوٹ کر رہ گیا۔ اگر یہ لوگ کشمیر کے معاملہ میں مخلص ہوتے تو اس واقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوتے دنیا بھر میں ایک ہلچل مچا سکتے تھے مگر چونکہ یہ ''**چالیس چور علی بابا**'' کے گروہ سے تعلق رکھتے

رحمت جوش میں آ گئی ۔ 20 دسمبر 1971ء کو ہمارا یہ مقدمہ اِس معزز عدالت کے سامنے راولپنڈی میں پیش ہوا۔ اِسی روز اِس ملک کو برباد کرنے والا یحییٰ خان اپنی حکومت کا چارج جناب بھٹو کے سپرد کر رہا تھا۔ ''چاہ کن را چاہ در پیش'' کشمیریوں کی تحریکِ آزادی کو اپنے ذلیل اور خطرناک ہتھکنڈوں سے ختم کرنے سے پہلے وہ جابر و ظالم اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔ ہمیں غدار ثابت کرنے سے پہلے وہ خود خاندانی غدار ثابت ہوا۔ قدرت کا انتقام بھی کس قدر شدید ہوتا ہے مگر اِنسان ہے کہ طاقت کے نشہ میں بھول جاتا ہے کہ اور بھی کوئی طاقت ہے جو اِس کا محاسبہ کرنے کے لیے موجود ہے........

بھارتی سامراج پر ضرب کاری، گنگا کا اغوا

30 جنوری 1971ء کو بھارت کے فوکر فرینڈ شپ طیارہ ''گنگا'' کا آپریشن سامنے آ گیا۔ جسے کشمیر کے دو حریت پسند نوجوان ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کمال جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے لاہور لے آئے اور اِس طرح جموں کشمیر نیشنل فرنٹ (قومی محاذِ آزادی) کے خلاف پبلسٹی کے محاذ پر حکومت نے جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، اُن کا بندھ ٹوٹ کر رہ گیا۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے شام تک اِس خبر کو پوری طرح روکنے کی کوشش کی۔ مگر چونکہ غیر ممالک نے اِس خبر کو ریلیز کر دیا تھا، اِس لیے ریڈیو پاکستان کو بھی شام 8 بجے کی خبروں میں یہ بتانا ہی پڑا کہ کشمیر کے دو حریت پسند بھارت کا ایک طیارہ ''گنگا'' اغوا کر کے لاہور لے آئے ہیں۔ پاکستان کے عوام اور پوری دنیا کو پہلی بار محسوس ہوا کہ کشمیر کے اندر ایک لاوا اُبل رہا ہے اور اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار جہاز اغوا کر کے دنیا کو بہم پہنچایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کشمیریوں کو مواقع فراہم کیے جائیں تو وہ بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اِس خبر سے کشمیریوں کے متعلق اِس پروپیگنڈہ کی قلعی کھل گئی کہ یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے اور بزدل ہیں۔ پاکستان کے لوگ کشمیریوں کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہیں اور خاص کر زندہ دِلان لاہور نے ہاشم و اشرف کی جرأت پر دادِ تحسین کے نعروں سے لاہور کی فضا کو پُر جوش بنا دیا۔ لوگ والہانہ انداز میں ایئر پورٹ کی طرف

پہلے افواہوں کا سلسلہ بڑے زور و شور سے شروع کر دیا گیا کہ یہ لوگ ہندوستان کے ''جاسوس'' ہیں ''چوروں کا یہ ٹولہ'' بغضِ معاویہ میں یہ بھول گیا کہ اس کارروائی سے نہ تو پاکستان کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ کشمیریوں کا ہی کوئی بھلا ہوگا۔ انہوں نے کشمیریوں کی تحقیر کا سامان دنیا بھر میں خود فراہم کیا اور کشمیریوں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں نفرت کے بیج خود بوئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی حکمتِ عملی کی وجہ سے کشمیر حاصل کرنے کی بجائے پاکستان کا ''**سنہرا بنگال**'' بھارت کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اس بات کا بھی خیال نہیں کیا کہ مقبوضہ کشمیر کے لوگ جو پاکستان کے لیے نیک جذبہ رکھتے ہیں۔ اِن کے غلط عمل سے کہیں اُن کے خلاف نہ ہو جائیں۔ اِنہوں نے کسی بھی دُور اندیشی کو خاطر میں نہ لایا۔ اور انکوائری کا بہانہ بنا کر مغربی پاکستان اور آزاد کشمیر کے طول و عرض میں جہاں جہاں بھی قومی محاذِ آزادی اور محاذ رائے شماری کے سرکردہ لوگ موجود تھے۔ ان کے خلاف دارو گیر کا سلسلہ شروع کر دیا اور لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے پولیس کی بھاری مدد سے جگہ جگہ چھاپے مارنے شروع کر دیے اور خانہ تلاشیاں کی گئیں۔ ایک ہی وقت میں پشاور سے لے کر کراچی اور میرپور سے لے کر گلگت تک پولیس کا پورا عملہ حرکت میں آ گیا۔ اور ہر جگہ خوف و ہراس کی فضا پیدا کر کے رکھ دی گئی اور اس کارروائی کے بعد کئی ماہ تک ہمیں غیر قانونی اور غیر جمہوری طریقہ سے نظر بند کر کے پاکستان اور آزاد کشمیر کے عقوبت خانوں میں زیرِ تفتیش رکھا، بلکہ ہمارے ساتھ ایسے ایسے انسانیت سوز، رُوح فرسا، دلآزار اور سفاکی کے مظاہرے کئے گئے (جن کا ذکر میں تفصیل سے آگے کروں گا) جسے اگر جرمنی کے نازی بھی دیکھتے تو شرم و ندامت سے ان کا سر بھی جھک جاتا۔ اِس طرح ہمارے ساتھیوں کے دلوں میں کشمیر کی آزادی کے لیے جو جذبہ موجزن تھا اسے ظلم و ستم اور اپنے سفاکانہ عمل سے اوچھے ہتھیاروں سے کچلنے کے سلسلہ میں انہوں نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہونے دیا۔ خود سر اور فرعون مزاج یحییٰ خان اور ان کے حواری یہ بھول گئے کہ آزادی کی تحریکیں اس طرح سے کبھی دبا نہیں کرتیں بلکہ ان مجنونانہ حرکتوں سے تو اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظالم و جابر سابقہ حکمران ٹولہ کی ایما پر ہم پر یہ جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا اور ہمیں مارشل لاء کورٹ کے ذریعہ تختہ دار پر لٹکانے کے مکمل انتظامات کر لیے گئے۔ اللہ تعالیٰ جو سب کچھ دیکھ رہا تھا، اُس کی

میں تقریباً 3 بجے گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ منان صاحب کا دفتر سے کئی بار فون آ چکا ہے۔ میں نے جب منان صاحب کو فون کیا تو اُنہوں نے تمام تفصیل بتا دی۔ منان صاحب نے یہ بھی کہا کہ آپ فوراً لون صاحب کی دکان پر پہنچیں۔ میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔ میں جب لون صاحب کی دکان پر پہنچا تو وہاں اور بھی ساتھی موجود تھے۔ مگر لون صاحب دکان پر نظر نہیں آئے۔ اُن کے گھر فون کیا تھا تو وہ گھر پر بھی نہیں تھے۔ چنانچہ رات 9 یا 10 بجے منان صاحب کے ہاں سب دوست اکٹھے ہوئے۔ لون صاحب بھی وہیں پہنچ گئے۔ دوستوں نے زور دیا کہ دو آدمی لاہور چلے جائیں، چنانچہ لون صاحب اور میں دوسرے دن 31, جنوری کی صبح کو فلائٹ سے لاہور پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر بڑا ہنگامہ تھا۔ لوگ بار بار جہاز کے قریب جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر پولیس انہیں آگے جانے سے روک رہی تھی۔ ہم نے ایئر پورٹ پر ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کو بھی کھڑے پایا۔ وہ بھٹو صاحب کا جو ڈھاکہ سے آنے والے تھے، انتظار کر رہے تھے۔ ہم بھی ڈاکٹر مبشر صاحب کے قریب چلے گئے۔ اُنہوں نے کھڑے کھڑے بات کرتے ہوئے کہا کہ بھٹو صاحب کو "گنگا" کے بارہ میں بذریعہ فون اطلاع کر دی گئی ہے۔ جس کے جواب میں اُنہوں نے فرمایا ہے کہ اِس معاملہ میں سخت رویہ رکھیں۔

مذاکرات

اِس کے بعد کسی نے ہمیں بتایا کہ مقبول احمد بٹ صاحب اور ڈاکٹر فاروق حیدر چیف سیکرٹری کے ہاں گئے تھے۔ چنانچہ ہم چیف سیکرٹری کی کوٹھی جا پہنچے۔ بٹ صاحب اور ڈاکٹر فاروق صاحب وہاں موجود تھے اور ہمارے پہنچنے تک آغا صاحب سے اُن کی بات چیت ہو چکی تھی۔ ہم چند منٹ تک وہاں رُکے۔ آغا افضل صاحب نے بٹ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کو دعوت دی تھی۔ اِس لیے وہ لنچ کے لیے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل روانہ ہو گئے اور ہم وہاں سے غلام محمد لون صاحب کے چھوٹے بھائی غلام نبی لون کے ہاں چلے گئے۔ شام کو بٹ صاحب نیڈوز ہوٹل میں پریس کو خطاب کر رہے تھے۔ چنانچہ لون صاحب اور میں نیڈوز ہوٹل پہنچے اور پریس کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ پریس

اُمڈے چلے آتے تھے اور جہاز کو جلانے کے لیے بار بار گنگا کا رُخ کرتے تھے۔ مگر پولیس اُنہیں لاٹھیوں اور آنسو گیس کے ذریعے پیچھے دھکیل رہی تھی۔ اِس خبر سے جہاں محاذِ آزادی کا نام بلند ہوا، وہاں سردار قیوم کی کھوکھلی ''المجاہد'' تحریک کو سخت دھچکا لگا اور اندرونِ خانہ محاذِ رائے شماری اور اس کے عسکری ونگ این۔ ایل۔ ایف کے خلاف کھچڑی پکنے لگی۔ جس روز یہ جہاز آیا ڈاکٹر فاروق کی بہن نے کراچی میرے آفس فون کیا۔ میں اُس وقت آفس میں موجود نہ تھا۔ اِس لیے اُنہوں نے منان صاحب کو کہا کہ ڈاکٹر فاروق نے کئی بار آپ کو فون کیا ہے مگر آپ کی لائن مصروف ملی۔ اُنہوں نے ''گنگا'' جہاز کے لاہور میں اُترنے کی اطلاع دی اور کہا کہ تھوڑی دیر پہلے ہاشم کا لاہور ائیر پورٹ سے فون آیا تھا کہ میں انڈیا کا فوکر فرینڈ شپ طیارہ اغوا کر کے لے آیا ہوں۔ جہاز کی سواریوں کو اُس نے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ اب اُس نے پوچھا ہے کہ اِس کا کیا کیا جائے۔ لہٰذا آپ فوراً فیصلہ کر کے بتائیں تاکہ اُسے جواب دیا جاسکے۔ اُس نے 10 منٹ کے اندر جواب مانگا ہے۔ منان صاحب نے فوراً لون صاحب کو فون کیا۔ لون صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ انہیں کہہ دیں کہ جہاز کسی بھی صورت جلنا نہیں چاہیے۔ البتہ وہ یہ مطالبہ کریں کہ جب تک بھارت ہمارے آدمی جو مقبوضہ کشمیر میں قید ہیں رہا نہیں کریں گے، ہم جہاز کو واپس جانے نہیں دیں گے۔ چنانچہ منان صاحب نے ڈاکٹر فاروق کی بہن کو اپنے فیصلہ سے مطلع کر دیا۔ ڈاکٹر فاروق کی بہن نے ڈاکٹر فاروق کا یہ پیغام بھی دیا تھا کہ آپ فیصلہ کرنے کے بعد لاہور ائیر پورٹ پر ٹریفک مینجر غفار صاحب کے ذریعے ہاشم کو بھی اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیں۔ منان صاحب نے غفار صاحب کو بار بار فون کرنے کی کوشش کی مگر اُن کی لائن نہ مل سکی۔ چنانچہ اُنہوں نے شیخ رحمان کو فون کیا اور اُنہیں ''گنگا'' کے لاہور ائیر پورٹ پر اترنے کی خبر سناتے ہوئے کہا کہ آپ فوراً ائیر پورٹ پر پہنچیں اور ٹریفک مینجر غفار کو مل کر ہاشم کو کہیں کہ جہاز جلانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ بھارت سے مطالبہ کریں کہ وہ ہمارے مقید ساتھیوں کو رہا کرے۔

تو یہ این۔ایل۔ایف کی ملکیت ہے۔ اسے جو چاہیں کریں۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ گفتگو کے دوران مقبول احمد بٹ صاحب نے چیف سیکرٹری صاحب کو کہا کہ جہاز کی سواریاں ہماری اجازت کے بغیر بھارت نہ بھیجی جائیں کیونکہ جب تک مقبوضہ کشمیر کی حکومت ہمارے تمام قیدی واپس نہیں کرتی، ہم جہاز کی سواریاں واپس بھیجنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ جس پر آفتاب احمد خان صاحب نے کہا کہ سواریاں چونکہ باہر آچکی ہیں اور ہماری نگرانی میں ہیں اس لیے اب سواریوں کو بحفاظت بھارت پہنچانا ہماری ذمہ داری میں داخل ہے۔ جس پر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ سواریاں تو آپ نے خود نکلوائی ہیں۔ اگر آپ کو ہمارے اُن آدمیوں سے کچھ ہمدردی ہوتی جو مقبوضہ کشمیر کی قید میں ہیں، تو آپ ہمارے لیے موقع فراہم کرتے کہ ہم بھارت سے سودابازی کر سکتے۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم سودابازی کی پوزیشن کھو چکے ہیں تو یہ سراسر آپ کی زیادتی ہے۔ آفتاب احمد صاحب کوئی جواب نہ دے سکے اور خاموش ہو گئے۔

بھٹو صاحب سے ملاقات

اِس کے بعد ہم مایوس ہو کر وہاں سے فلیٹیز ہوٹل چلے گئے جہاں بھٹو صاحب قیام پذیر تھے۔ مقبول احمد بٹ صاحب، غلام محمد لون صاحب اور میں نے بھٹو صاحب سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر مبشر صاحب بھی موجود تھے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ پاکستان کی حکومت نے سواریوں کو بھارت بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ پوری کوشش کریں کہ سواریاں اُس وقت تک بھارت نہ جا سکیں جب تک مقبوضہ کشمیر کی حکومت آپ کے آدمی رہا نہیں کرتی۔ اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میری پوری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ اِس سلسلہ میں میں خود بھی وزارتِ خارجہ سے بات چیت کروں گا۔ اُنہوں نے ڈاکٹر مبشر صاحب کو بھی ہدایت کی کہ ہمارے ساتھ ہر قسم کا تعاون کیا جائے۔ اُس کے بعد ہم ایئر پورٹ روانہ ہو گئے اور کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد واپس ہوٹل آ گئے۔ غلام محمد لون صاحب اُس روز واپس کراچی چلے گئے۔ دوسرے روز 2، فروری 1971ء کو جب ہم ایئر پورٹ پہنچے تو حکومت نے 2

کانفرنس سے فارغ ہو کر ہم مقبول بٹ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چیف سیکرٹری صاحب کے ہاں گئے۔ جہاں کھڑے کھڑے بٹ صاحب نے اُن سے بات کی۔ آغا صاحب نے کہا کہ میں گورنمنٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اُن سے مل کر ہم سب دوبارہ ایئر پورٹ پر گئے اور بٹ صاحب نے سردار وکیل کو ساتھ لیا۔ ہم سب ہاشم و اشرف کو ملنے جہاز تک جا پہنچے اور دونوں سے ملاقات کی۔ اُن دونوں سے لون صاحب کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ اِس کے بعد انٹر نیشنل ہوٹل گئے کیونکہ چیف سیکرٹری نے ہماری رہائش کا وہاں انتظام کروا دیا تھا۔ یکم فروری 1971ء کو مقبول احمد بٹ، ڈاکٹر فاروق اور جاوید ساغر نے پھر چیف سیکرٹری صاحب سے ملاقات کی۔ ہم بھی تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گئے۔ ہمیں لان میں بیٹھے تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہمیں بھی بلایا گیا۔ اُس وقت چیف سیکرٹری کے پاس ارباب مختار صاحب کے علاوہ آفتاب احمد خان صاحب بھی موجود تھے۔ بات چیت کے دوران غلام محمد لون صاحب نے چیف سیکرٹری صاحب کو کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ جہاز آپ کے حوالے کرایا جائے تو آپ مقبول احمد بٹ صاحب کو کہہ دیں تاکہ وہ پریس کانفرنس میں اس کا اعلان کر دیں کہ پاکستان گورنمنٹ کے کہنے پر ہم نے جہاز اُن کے حوالے کر دیا ہے۔ اِس سے آپ کی ذمہ داری بھی ختم ہو جائے گی اور عوام کے سامنے ہماری پوزیشن کو بھی دھچکا نہیں لگے گا۔ ہم لوگوں کو کہہ سکیں گے کہ حکومتِ پاکستان کے زور دینے پر ہم نے جہاز جانے دیا ورنہ اگر جہاز ہم ایسے ہی چھوڑ دیتے ہیں تو لوگ طعنے دینے لگیں گے کہ یہ کشمیری بھی کیسے لوگ ہیں جہاز کی سواریاں بھی چھوڑ دیں اور جہاز بھی واپس کر دیا۔ ہمیں دنیا کو یہ بتانا تھا کہ کشمیری بھی جاندار قوم ہے۔ اِنہیں اگر پوری طرح سے تیار کیا جائے اور تمام سہولتیں مہیا کیا جائیں تو وہ بھی جان کی بازی لگا سکتے ہیں اور گنگا کے اپریشن سے ہم نے دنیا کو اِس کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ جہاز اگر جلا بھی دیا جائے تو بھارت کو کوئی خاص مالی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ جہاز انشورڈ ہے۔ لون صاحب کے خیالات سننے کے بعد چیف سیکرٹری صاحب نے فرمایا کہ ہمیں جہاز کی سواریوں کی فکر تھی۔ سواریاں ہم نے نکلوا لی ہیں۔ رہا جہاز

کے اعزاز میں جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اِس جلوس میں صوبائی دارُالحکومت کی تمام سیاسی پارٹیوں کے علاوہ پیپلز پارٹی بھی پیش پیش تھی۔ جلوس جس راستہ سے بھی گزرتا ہزاروں کی تعداد میں لوگ سڑکوں اور عمارتوں کی چھتوں پر پُر جوش نعروں اور تالیوں سے ہاشم قریشی، اشرف قریشی اور محاذِ آزادی کے راہنماء مقبول احمد بٹ کا استقبال کرتے اور ہر طرف سے پھولوں کی بارش ہو جاتی۔ حدِ نظر تک لوگوں کے سروں کا ایک وسیع و عریض سمندر تھا۔ ایک جوش تھا، کہ روکے نہ تھمتا تھا۔ ٹرک پر حریت پسند نوجوانوں کے علاوہ پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، شیخ رشید صاحب اور احمد رضا قصوری بھی سوار تھے۔ تین گھنٹے بعد جب جلوس سنہری مسجد سے گول باغ پہنچا تو مقبول بٹ صاحب نے ایک نہایت پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، شیخ رشید صاحب اور احمد رضا قصوری صاحب نے بھی عوام کو خطاب کیا۔ جلوس کے اختتام پر جب ہم لاہور ہوٹل پہنچے تو مغربی پاکستان کے دوسرے شہروں سے بھی حریت پسندوں کو دورہ کرنے کے دعوت نامے آئے ہوئے تھے۔ غالباً 15، فروری کو گوجرانوالہ پہنچے۔ جہاں حریت پسندوں کا لاہور کی طرح فقید المثال استقبال ہوا۔ اُس رات ہم راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ حریت پسندوں کے راولپنڈی پہنچنے کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی اور ریکس ہوٹل راولپنڈی میں ملنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ راولپنڈی میں مقیم کشمیریوں اور سٹوڈنٹس کی کئی تنظیموں نے حریت پسندوں کو علیحدہ علیحدہ طور پر استقبالیے دیئے۔ جس میں ہاشم، اشرف اور مقبول بٹ صاحب نے بھی تقاریر کیں۔ میں چند روز راولپنڈی ٹھہرنے کے بعد سیالکوٹ روانہ ہو گیا اور کچھ دن سیالکوٹ میں گزارنے کے بعد کراچی چلا گیا۔

ہاشم قریشی نے کچھ عرصہ بعد فون کیا کہ میرے تمام کاغذات جو ہسپتال میں آپ کے حوالے کیے گئے ہیں واپس بھیج دیں۔ چنانچہ یہ سب کاغذات میں نے میر عبدالمنان کی دستی جو محاذِ رائے شماری کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے سلسلہ میں میر پور جا رہے تھے، اُنہیں بھیج دیئے۔ ہاشم و اشرف بھی میر پور

بجے کے بعد ہائی جیکرز سے ملنے پر پابندی لگا دی تھی۔ ایئر پورٹ پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو نعرے لگا رہا تھا کہ جہاز فوراً جلا دیا جائے۔ لوگ جہاز کے قریب جانے کی کوشش کرتے تو پولیس اُنہیں پیچھے ہٹا دیتی اِس کے بعد پولیس نے جاوید ساغر کو جو جہاز میں موجود تھے، بہانہ کر کے جہاز سے نکال دیا اور اِس طرح ہائی جیکرز سے بٹ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کا رابطہ ختم ہو گیا۔ میں ایئر پورٹ کچھ دیر رُکنے کے بعد ہوٹل آ گیا۔

گنگا نذرِ آتش ہو گیا

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب عبدالخالق انصاری صاحب ہوٹل پہنچے اور اُنہوں نے بتایا کہ جہاز کو ہائی جیکرز نے آگ لگا دی اور ہاشم اور اشرف جل گئے ہیں اور اُنہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ہم فوراً سروسز ہسپتال پہنچے جہاں ہاشم و اشرف کو آکسیجن دی جا رہی تھی۔ وہ بے ہوش تھے۔ اشرف کا چہرہ اور ہاتھ جھلس گئے تھے اور اُس کی پٹی کر دی گئی تھی۔ ہم رات کافی دیر تک ہسپتال میں رہے اور پھر جاوید ساغر کو وہاں چھوڑ کر واپس ہوٹل آ گئے۔ دوسرے روز صبح جب ہم ہسپتال پہنچے تو ہاشم اور اشرف ہوش میں آ چکے تھے۔ بیمار پُرسی کو آنے والوں کا ہسپتال میں تانتا بندھا تھا۔ جب ہم ہسپتال سے جانے لگے تو ہاشم نے مجھے کہا کہ میرا کوٹ ساتھ لے جائیں اور ساتھ اُنہوں نے جہاز میں سفر کی ٹکٹیں مسافروں کی فہرست اور کچھ دیگر کاغذات دیئے کہ انہیں اپنے پاس حفاظت سے رکھ دیں۔ چنانچہ اُنہیں لے کر میں ہوٹل آ گیا۔ چند دن ہوٹل انٹرنیشنل میں رہنے کے بعد بٹ صاحب نے چیف سیکرٹری کو کہا کہ ہمارا انتظام لاہور ہوٹل میں کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم لاہور ہوٹل منتقل ہو گئے۔ تمام دن یہاں بے حد مصروف گزرتا اور ملنے والوں کا دن بھر رش رہتا۔ غالباً دس بارہ روز ہسپتال میں رہنے کے بعد ہاشم و اشرف صحت یاب ہو گئے۔

عقیدت مندانہ استقبال

زندہ دلانِ لاہور اُن کا استقبال کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ چنانچہ 13 فروری کو اِن

کارروائی کی ابتداء کر دی گئی تھی۔ اِس کے بعد 14 اپریل 1971ء کو مری، راولپنڈی اور پشاور سے ہاشم قریشی، اشرف قریشی، ڈاکٹر فاروق حیدر، جاوید ساغر اور مقبول احمد بٹ صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر 20 اپریل کی شام کو تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ جس میں ہائی جیکنگ کے واقعہ کو نام نہاد ''ہندوستانی سازش'' کا نام دیا گیا اور اِس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی آئی کہ انکوائری کے سلسلہ میں عنقریب کراچی اور آزاد کشمیر میں مقیم محاذِ رائے شماری کے دیگر لیڈروں سے بھی پوچھ گچھ کی جائے گی اور اِس خبر کے بعد 27 اپریل کی رات سے کراچی، پنجاب اور آزاد کشمیر میں داروگیر کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

گرفتاری

27 اپریل رات کو ایک بجے میں ایک دعوت سے فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ غالباً صبح 4 بجے کے لگ بھگ پولیس کی ایک خاص جمعیت نے میرے مکان پر چھاپہ مارا۔ میں اُس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز میں نے نہیں سنی۔ مجھے نہیں معلوم کہ گھر کا دروازہ کس نے کھولا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ آدمیوں کا شور سن کر جب میری بیوی نے اندر کا دروازہ کھولا تو پولیس میرے سونے کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرے چاروں طرف پولیس کے آدمی کھڑے تھے۔ نیند بھری آنکھوں سے مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی، کہ کیا قصہ ہے۔ پولیس اُس دوران میرے ساتھ کے کمرے میں جہاں میری جوان سال بیٹیاں سو رہی تھیں، داخل ہو چکی تھی میری بیوی اور بچیوں کو فوراً کمرے خالی کر کے دوسرے کمرے میں جانے کا حکم ہوا۔ سب لوگ فوراً کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ میں جب ڈرائنگ روم میں آیا تو وہاں کئی آدمیوں کو جن میں عبدالحق ڈی ایس پی اور شمشیر علی انسپکٹر پولیس بھی شامل تھے، کو کھڑے دیکھا۔ اُنہوں نے بغیر کچھ کہے سُنے میرے گھر کی تلاشی شروع کر دی اور ٹرنکوں کی الماریوں سے سامان نکال کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ بالکل یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اِس گھر میں کوئی افیم، چرس یا اسمگل شدہ کوئی چیز موجود ہے اور کسی مخبر کے کہنے پر پولیس حرکت میں

والوں کی دعوت پر میرپور گئے ہوئے تھے، یہاں بھی اِن کے اعزاز میں زبردست جلوس نکالا گیا۔

تحقیقاتی کمیشن کا قیام

مارچ کے دوسرے ہفتہ میں ایک روز وزارتِ خارجہ کی طرف سے اچانک یہ اعلان ہوا کہ ''ہائی جیکنگ'' کے واقعہ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے گی۔ اِس سلسلہ میں محاذ کے کارکنوں کو متعلقہ حکام کی طرف سے یہ تاثر دیا گیا کہ اِس تحقیقات کا مقصد محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہائی جیکنگ کے واقعہ میں حکومتِ پاکستان کا کوئی ہاتھ نہیں اور اِس طرح بین الاقوامی شہری ہوابازی کے ادارہ میں پاکستانی موقف کو تقویت پہنچانا ہے۔ حکام محاذ کے لیڈروں کو برابر تاثر دے رہے تھے کہ تحقیقات تو محض ایک دکھاوا ہے۔ جس کا مقصد بین الاقوامی سطح پر بھارت کے مقابلہ میں پاکستان کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے اور دوسری طرف شیخ مجیب الرحمان کے مطالبہ کو بھی پورا کرنا ہے۔ اُنہی دنوں یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ ڈھاکہ میں مذاکرات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

اِس کے ساتھ آزاد کشمیر کی حکمران جماعت بالخصوص سردار قیوم خان صدر آزاد کشمیر اور ان کی بہی خواہ پاکستانی نوکر شاہی نے محاذِ رائے شماری اور جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے خلاف قسم قسم کی گمراہ کن افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔ ہائی جیکنگ کے سلسلہ میں روزِ اوّل ہی سے این۔ایل۔ایف کی کمان نے متعلقہ حکام کے ساتھ تعاون اور اعتماد کی ایک روایت قائم کی تھی۔ اور اِس روایت کے احترام میں اُنہوں نے سرکاری حکام کی یقین دہانیوں پر اعتماد کرتے ہوئے تحقیقاتی کارروائی کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ مگر بعد کے واقعات نے یہ ظاہر کر دیا کہ تحقیقات کارروائی محاذ کو کچلنے، تحریک آزادیٔ کشمیر کو سبوتاژ کرنے، یحییٰ خان اور اُس کے حکمران ٹولے کی عوام دشمن سازشوں کو مضبوط بنانے اور اِس کے لیے جواز پیدا کرنے کے ناپاک منصوبہ کی ایک کڑی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ تحقیقات کافی تاخیر سے یعنی 27 مارچ 1971ء کو اُس وقت شروع کی گئی جب دو روز قبل 25 مارچ کو پاکستان میں عوامی نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی روکنے کے لیے مشرقی پاکستان میں فوجی

سب کو علیحدہ علیحدہ سیلز میں بند کر دیا گیا اور اُس کے ساتھ ہی پوچھ گچھ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔

سی آئی اے کراچی کا تفتیشی مرکز

میں کئی روز تک اپنا بیان لکھتا رہا۔ ہر چار گھنٹہ بعد اے ایس آئی کی ڈیوٹی لگتی۔ وہ فوراً بیان لکھنے کا حکم دے دیتا۔ پہلے چند دن اسی بیان بازی میں گزرے۔ اسی دوران ہمیں پتہ چلا کہ ڈی آئی جی مسٹر اطہر آ رہے ہیں۔ اُس وقت تک ہمیں گھر سے بستر اور کھانا بھی آ رہا تھا اور شیو کرنے کی بھی اجازت تھی۔ مگر جونہی مسٹر اطہر پہنچے، اُنہوں نے آتے ہی ہمیں جگائے رکھنے کا حکم دے دیا۔ ہمارے بستر اُٹھوا کر ہمارے گھر والوں کو واپس کر دیئے گئے۔ ہمارا گھر کا کھانا بند کر دیا گیا۔ نہانے غسل کرنے اور کپڑے بدلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اِس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں ہتھکڑی لگا دی گئی۔ جو دن رات لگی رہتی اور نماز کے دوران بھی اُسے نہ کھولا جاتا۔ مسلسل جاگتے رہنے سے ہماری آنکھیں سوجھ چکی تھیں۔ مسٹر اطہر نے جب دوسری بار آنا تھا تو شمشیر علی انسپکٹر نے مجھے آ کر کہا۔ تھوڑی دیر تک ڈی آئی جی آئیں گے۔ اگر اُنہیں ذرا بھی یہ محسوس ہوا کہ یہاں آپ کو آرام ملا ہے، تو ہم پر برس پڑیں گے۔ لہٰذا اپنی آنکھوں کو مل مل کر سرخ کر لیں۔ میں نے جواب دیا کہ اتنے روز سے تو آپ جگا رہے ہیں، اب بھی آپ کو کوئی شبہ ہے؟ ہماری آنکھیں آپ کو سُرخ نظر نہیں آتیں؟ ڈی آئی جی کے آتے ہی مجھے اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُنہوں نے مجھے دیکھتے ہی غصہ میں آ کر گالیاں دینا شروع کیں اور خود ہی زدوکوب کرنا شروع کیا۔ مجھے اُس نے "مرغا" بنایا اور ساتھ میری پیٹھ پر بلاک رکھوایا۔ جب میں تھک جاتا اور کمر کو نیچی کرتا میرے جسم پر چھتر برسائے جاتے۔ مجھے اطہر نے یہ بھی کہا کہ تم دونوں بھائیوں کو پھانسی لگ جائے گی۔ جس طرح تم لوگوں کی پبلسٹی کرتے تھے اِس طرح اب ہم تمہاری پبلسٹی کریں گے۔ اُن کے جانے کے بعد آغا سلطان ایس پی، عبدالوحید ڈی ایس پی اور عبدالحق ڈی ایس پی نے بار بار بلا کر میرے بیانات قلم بند کئے۔ میں حقائق بیان کرتا رہا جس پر یہ سب غصہ میں آ کر کہتے کہ اگر آپ پولیس کی مرضی کے مطابق بیان نہ دیں گے تو پھر ہم اور

آ گئی ہے۔ پولیس افسران نے گھر کے چاروں طرف پولیس کے آدمیوں کی ڈیوٹی لگادی کہ کوئی چیز یا کوئی آدمی باہر نکلنے نہ پائے۔ پولیس نے اپنے عمل سے گھر بھر میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی۔ چھ گھنٹے کی لگاتار محنت اور کوشش کے بعد پولیس نے جن چیزوں کو اپنے قبضہ میں کیا وہ حسب ذیل تھیں۔

۱۔ میرا اور میری بیوی کا پاسپورٹ (جو عمرہ کرنے کے سلسلہ میں میں نے کچھ عرصہ قبل تیار کروایا تھا)۔

۲۔ موٹر کی رجسٹریشن بک۔

۳۔ ٹیلیفون نمبر بک ۲ عدد (جس میں میرے گاہکوں کے نمبر نوٹ تھے)۔

۴۔ محاذِ رائے شماری کے لٹریچر کی ایک ایک کاپی۔

۵۔ اخبارات کے کٹنگ کی ۳ فائیلیں۔

۶۔ ذاتی چیک بکس کی کونٹر فائلز۔

۷۔ ایک لفافہ گروپ فوٹو۔

۸۔ میرے والد اور تایا کا ایک فریم شدہ فوٹوگراف۔

۹۔ میجر امان اللہ کی محاذِ آزادی کے سلسلہ میں فائل۔

غالباً 10 بجے صبح تک جب پولیس تلاشی کے کام سے فارغ ہو گئی تو مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا گیا۔ مجھے کوئی وارنٹ گرفتاری نہیں دکھایا گیا، بلکہ یہ کہا گیا کہ ہم خود مجسم وارنٹ ہیں۔ میں جب اپنے مکان سے نیچے سڑک پر آیا تو پولیس دیکھ کر تماشہ دیکھنے والوں کا ایک ہجوم موجود تھا اور لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ مجھے پولیس کی گاڑی میں فوراً سی آئی اے کے آفس پہنچایا گیا۔ میرے بعد میر عبدالمنان صاحب، غلام محمد لون صاحب، صدیق بابا صاحب، غلام محی الدین بانکا صاحب، میر ہدایت اللہ صاحب، محمد یوسف قریشی اور مقبول نائیک کو گرفتار کر کے لایا گیا اور

پاس صرف بستر کی ایک چادر، ایک پاجامہ، ایک قمیض، ایک تولیا اور جائے نماز تھی۔ میں نے فوراً چادر میں یہ کپڑے باندھے اور اسٹیشن کی راہ لی۔ دوسرے دن شام کو شدید قسم کی گرمی میں پسینے سے شرابور اور گرد میں اٹا ہوا۔ جب میں پولیس گارڈ کے ساتھ شاہی قلعے میں پہنچا تو مجھے شاہی قلعہ لاہور کے تاج نامی لائینز آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے نہایت خون خوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''تم ہو میر عبدالقیوم'' اس کے بعد وہ مجھے لے کر ایک سنگین کوٹھڑی کے پاس آ گئے اور مجھے اندر داخل کرنے سے پہلے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کپڑوں کی گٹھڑی کو دیکھ کر بولے ''اوے ایدے وچ کی اے؟'' میں نے جواب دیا کہ ''اس میں دو ایک کپڑے ہیں'' جس پر وہ جھٹ بول اٹھا ''اوے گھبرائیں تینوں ایہہ کپڑے وی شاید پان دی لوڑ نہ پوے'' مجھے لائز آفیسر کی یہ بات اُس وقت سمجھ میں نہ آسکی۔ گٹھڑی کی تلاشی لینے کے بعد مجھے کوٹھڑی میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ میں نے کوٹھڑی میں داخل ہو کر کپڑوں کی گٹھڑی سیمنٹ کے بنے ہوئے پلیٹ فارم پر جوں ہی پھینکی۔ لائیز آفیسر نے سمجھا کہ میں نے گٹھڑی کو شاید غصے سے پھینکا ہے۔ جس پر وہ برہم ہو گیا اور اُس نے جھٹ غلیظ قسم کی ایک وزنی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہوش وچ ہیں نا؟ اے کراچی نئیں ہون لاہور ای۔'' اور اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک اور غلیظ سی گالی بکتے ہوئے کہا ''تن کے رکھ دیاں گے ای۔'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ مجھ سے کون سی ایسی گستاخی سرزد ہو گئی ہے۔ جس پر آپ برہم ہیں۔ وہ بولا ''بکواس نہ کر ایدھر آ'' میں فوراً کوٹھڑی کے دروانے کے قریب آیا تو وہ بولا کہ ''اوئے پیٹھ دروازے نال لا'' میں نے پیٹھ دروازے کے ساتھ لگا لی۔ پھر اس نے میرے دونوں بازو اوپر اٹھوائے اور میرے دونوں ہاتھوں کو اُلٹی ہتھکڑی لگوا کر دروازے کے ساتھ کچھ اس طرح جکڑ دیا کہ میں اپنے بازو ایک انچ نیچے اوپر نہ کر سکتا تھا۔ اور اس کے بعد وہ کوٹھڑی کو تالا لگوا کر گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ گرمی پورے جوبن پر تھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہنے لگا۔ پیشانی جب پسینہ سے شرابور ہو جاتی تو اُسے صاف کرنے کے لیے مجھے بار بار اپنا گھٹنا اوپر اٹھانا پڑتا مگر گھٹنا بڑی مشکل سے ناک

سختی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں نے ہر بار یہی جواب دیا کہ میں نے بالکل درست بیان دیا ہے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے این۔ ایل۔ ایف کا حساب طلب کیا۔ جو میں نے خود مہیا کیا اور جس کے بعد عبدالوحید ڈی ایس پی کے ساتھ مجھے اپنے دفتر جانا پڑا۔ میں نے لیجر اور چیک بکس کی کونٹر فائلز وحید صاحب کے حوالے کیں۔ وحید صاحب نے میرے دفتر میں بیٹھ کر تمام حساب چیک کیا۔ جو بالکل درست ثابت ہوا۔ دو تین گھنٹے اِس چیکنگ کے بعد جب میں سی آئی اے آفس پہنچا، تو آغا سلطان ایس پی نے فوراً وحید صاحب سے سوال کیا کہ کچھ ملا؟ جس پر وحید صاحب نے جواب دیا کہ این۔ ایل۔ ایف کے حسابات میں نے چیک کر لیے ہیں، جو بالکل درست ہیں۔ جس پر آغا صاحب نے بے ساختہ کہا کہ آپ بے گناہ آدمی ہیں۔ مگر یونہی چکر میں پھنس گئے ہیں۔ جن لوگوں نے این۔ ایل۔ ایف کی مالی اعانت کی تھی۔ عبدالوحید نے اُن سب کو سخت پریشان کیا اور کہا کہ اگر آپ نے یہ کہا کہ ہم پیسہ دیتے تھے، تو تمہیں قلعہ لاہور بھیج دیا جائے گا۔ میرے دفتر کے تمام سٹاف کو بھی بے حد پریشان کیا گیا اور اُنہیں بُلا بُلا کر مرغا بنایا جاتا رہا ہے۔ سی آئی اے کے آفس میں رہتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ماہ ہونے کو آیا تھا۔ اِس عرصہ میں تمام چھوٹے افسر یہ جان چکے تھے کہ ہم سب لوگ بے گناہ ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتے کہ چونکہ ہماری ملازمت کا سوال ہے۔ اِس لیے ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ویسے چھوٹے سٹاف نے ہمیں ہر ممکن سہولت دی۔

شاہی قلعہ کے عقوبت خانہ میں

سی آئی اے آفس کراچی کی پچاس روزہ انکوائری کے باوجود ڈی آئی جی اطہر مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ شاہی قلعہ لاہور کے "مذبح" خانہ میں ہمیں بھیجنے کے انتظامات ہونے لگے۔ سب سے پہلے غلام محمد لون صاحب کو دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر 15، جون 1971ء کو ہمارے سامنے سے لے جایا گیا۔ 16 جون کو مجھے حکم ہوا کہ فوراً تیار ہو جائیں۔ میرے پاس نہ تو بستر تھا اور نہ پہننے کے لیے کپڑے۔ مجھے اتنا وقت بھی نہ دیا گیا کہ میں اپنے گھر سے ضروری سامان منگوا لیتا۔ میرے

لیا اُس وقت ہم تمہاری خلاصی نہ چھوڑیں گے۔" جب اُس روح فرسا تشدد کے باوجود اُنہیں کچھ نہ ملا تو پھر مجھے قمر عالم کے سامنے لایا گیا۔ جس نے اپنے ہاتھوں سے مجھ پر چھتر برسانا شروع کئے۔ ٹرک کے ٹائر سے تیار کیا ہوا "چھتر" جب میرے جسم پر پڑتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ جسم کی کھال اُتر چکی ہوگی اور ضرب کی جلن سے میں تڑپ جاتا۔ پھر مجھے مادرزاد ننگا کر کے چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر بٹھایا جاتا اور بے حد تڑپ جاتا اور ٹانگوں کو دُوہرا کر کے اُنہیں مخالف سمتوں میں اندر کی طرف بُری طرح کسا جاتا۔ جس سے یہ محسوس ہونے لگتا جیسے میری ٹانگوں کی نسیں پھٹنے لگی ہیں۔ اُن کے اِس عمل سے میری چیخیں بلند ہونے لگتیں۔ کبھی مجھے چارپائی کے ساتھ الٹا باندھ کر دوہرا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ جس سے ریڑھ کی ہڈی پر اتنا دباؤ پڑتا کہ اُس کے چٹخنے کی صورت نظر آنے لگتی۔ میں درد کی شدت سے بلبلا اُٹھتا۔ چارپائی کی رگڑ سے جب میری پنڈلیوں کا گوشت اُتر جاتا تو یہ ظالم جلاد زخم پر مرچیں چھڑکنے لگتے (پنڈلی پر اب تک زخم کا نشان موجود ہے)۔ چارپائی کے ساتھ ننگا باندھ کر چارپائی کو اِس طرح کھڑا کیا جاتا کہ سر نیچے ہو جاتا اور ٹانگیں اوپر ہو جاتیں اور اِس طرح کافی دیر تک اُلٹا رکھا جاتا۔ مادرزاد ننگا کر کے اور ہاتھوں کو جسم کے ساتھ باندھ کر ایک آدمی مجھے اتنا اٹھاتا کہ میرا سر چھت پر لگے ہوئے پنکھے کے قریب پہنچ جاتا اور یوں محسوس ہوتا کہ پنکھے کے تیزی سے چلتے ہوئے بلیڈز میری گردن کاٹ کر رکھ دیں گے۔ کئی بار مجھے مادرزاد ننگا کر کے چارپائی سے جکڑ دیا گیا اور پھر میری جائے مستور پر موم بتی جلا کر موم کے گرم گرم قطرے ٹپکائے گئے۔ جس سے میری چیخیں نکل جاتیں۔ (میرے جسم پر تشدد کے نشانات اب بھی موجود ہیں) جو اُن بے رحم درندہ صفت انسان کی انسانیت سُوز بربریت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مجھے یہ کہا گیا کہ تمہاری نسیں کاٹ کر تمہاری مردانہ قوت ختم کر کے رکھ دی جائے گی۔ مجھے مادرزاد ننگا کر کے چارپائی کے ساتھ باندھا گیا اور میرا منہ کھلوا کر اس میں پیشاب کرنے کی کوشش کی گئی اور بار بار وہ حیوان قسم کا آدمی اپنی جائے ستر میرے منہ کے ساتھ لگانے لگا۔ قمر عالم ایس پی نے ایک دفعہ بھنگی سے "پاخانہ" منگوا کر میرے منہ میں اپنے ہاتھ سے خود

تک پہنچا اور پیشانی سے پسینہ صاف نہ ہونے سے بیحد الجھن ہوتی۔ پیاس کی شدت سے لاچار ہو کر جب میں پانی مانگتا تو کوٹھڑی سے باہر ڈیوٹی پر موجود رائفل بردار سپاہی ایک بے حد غلیظ قسم کے ٹوٹے ہوئے ٹین کے گلاس میں پانی ڈال کر گلاس سولاخوں کے اندر لے جا کر میرے منہ میں انڈیل دیتا۔ سپاہی کو جب بار بار پانی میرے منہ میں ڈالنا پڑا تو وہ بھی غصہ میں آ گیا اور اُس نے بھی کچھ اس طرح کی صلواتیں سنانا شروع کر دیں۔ ''اُوئے کی کھا کے آیا ایں، پانی پی پی کے ڈھڈ پھٹ جائے گا ای۔'' جس پر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہنا شروع کیا کہ تم لوگ یزید ہو۔ مجھے دروازے کے ساتھ جکڑ بھی رکھا ہے۔ اور پھر پانی مانگنے پر گالیاں سناتے ہو۔ میں رات بھر اسی طرح تڑپتا رہا۔ بازو شل ہو چکے تھے۔ ٹانگیں سوجھ چکی تھیں۔ اور میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ آخر صبح کے وقت جب ''جلادوں'' نے میرے بازو کھولے تو بازو اوپر سے یوں گرے جیسے اُن کا باقی جسم کے ساتھ تعلق ختم ہو گیا ہے۔ ہاتھ کافی دیر تک سُن رہے۔ اُلٹی ہتھکڑی لگا کر دروازے سے جکڑنے کا سلسلہ کوئی ایک ہفتہ جاری رہا۔ آخری دنوں میں ہاتھوں کی سوزش کی وجہ سے ہتھکڑی کلائی میں پیوست ہو گئی۔ جس سے کلائی میں زخم ہو گیا تھا۔ (جس کا نشان اب بھی میری کلائی پر موجود ہے)۔ جب خون کا دوران بن ہو جاتا اور بے ہوش ہو کر جب میری گردن لٹک جاتی تو پھر مجھے دروازے سے کھول کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا جاتا جوں ہی مجھے ہوش آتا تو پھر یہ ظالم مجھے ادھر اُدھر ٹہلاتے اور اس کے بعد پھر دروازے کے ساتھ کس دیتے۔ وہ دن رات مجھ سے ایک دو تین کا ورد بھی کرواتے رہتے تاکہ انھیں یہ پتہ چلتا رہے کہ میں سو تو نہیں گیا۔ جب کبھی میں گنتے گنتے رک جاتا تو ڈیوٹی پر موجود سپاہی بندوق کا کندہ میری پیٹھ پر دے مارتا۔ بعض دفعہ وہ اپنے جوتے کو حرکت میں لے آتا۔ گنتی کے بجائے اگر میں ''آیت کریمہ'' کا ورد شروع کر دیتا تو اُس پر وہ درندہ صفت جلاد برہم ہو کر غلیظ قسم کی گالیاں بکنے لگ جاتا اور کہتا صرف گنتی کرو۔ ایک دن لائنز افسر تاج چوہدری نے کہا کہ ''یہاں محمد خان جیسے ڈاکو چند منٹوں میں سب کچھ بک گئے تو بھلا تمہاری کیا بساط ہے۔ جب تک ہم نے تم سے سب کچھ اُگلوانہ

جاتا۔ یہ عمل اِس قسم کا ہے کہ صرف تین منٹ تک اسی حالت میں رکھنے سے ہاتھ و بازو شل ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل بار بار دُھرانے سے میرے بازو فالج زدہ ہو گئے اور میں ایک ماہ تک استنجا تک کرنے کے قابل نہ رہا۔ میرے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں پانی کا لوٹا اٹھا سکوں۔

میرے پاس این۔ ایل۔ ایف کا چونکہ شعبہ مالیات تھا۔ اس لیے مجھے شاہی قلعہ کے ایک جلاد ملک محمد شفیع کی طرف سے ''**جاسوسوں کی ماں**'' کا خطاب دیا گیا اور اسی وجہ سے میرے اوپر انتہائی سختی کی گئی کہ میں پیسہ حاصل کرنے کا ذریعہ اُن کی حسبِ خواہش بیان کروں۔ میں زدوکوب کے دوران آخر دم تک یہی کہتا رہا کہ یہ پیسہ میں ان 27 آدمیوں سے لیتا رہا جو یا تو میرے گاہک تھے یا کراچی کے ایسے صاحبِ حیثیت کشمیری تھے، جو مجھے پوری طرح جانتے تھے۔ میں اپنے کراچی کے بیان میں ہر چیز اُنہیں بتا چکا تھا۔ لیجر اور بنک کا پورا حساب اِن کے حوالے کر چکا تھا۔ اخراجات کی پوری تفصیل اُن پر پوری طرح واضح کی جا چکی تھی۔ پھر بھی اُن کو یقین نہیں آتا، تو اِس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں نے کہا یا آپ مجھے کھل کر بتائیں کہ آپ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں۔ جس پر قمر عالم کی نگرانی میں چھتروں، مکوّں اور جوتوں کی بارش شروع ہو گئی اور قمر عالم کہنے لگا کہ ''ابھی تک تمہیں سمجھ ہی نہیں آئی ہم تم سے کیا چاہتے ہیں، تم کتنے مکار آدمی ہو۔'' اِن کے زدوکوب کے دوران اگر میری چیخیں بلند ہوتیں تو قمر عالم کہتا کہ تھوڑی سی سختی پر کتنا شور وغل کرتا ہے۔ جس پر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جرأت کر کے کہہ ہی دیا کہ ذرا یہ ''چھتر'' میرے حوالے کریں اور آپ میری جگہ پر آجائیں پھر دیکھتا ہوں کہ آپ اسے برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اِس پر بھی میری خاصی مرمت کی گئی۔ ایک دفعہ ایس پی قمر عالم نے حکم دیا کہ میں اپنا بیان لکھ کر دوں۔ میں نے ابھی بیان کے دو تین صفحات ہی لکھے تھے کہ قمر عالم نے وہ ورق لے کر پڑھنے شروع کیے۔ میرا بیان چونکہ حقائق پر مبنی تھا، جس پر وہ برہم ہو گیا اور اس نے دانت پیس کر ورق پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور یہ ٹکڑے چھتروں کی بوچھاڑ میں میرے آگے بڑھا دیئے اور ان ٹکڑوں کو چبا کر کھانے کا حکم دیا۔ پہلے

ڈلوایا۔ جس سے یکدم میرے ہونٹوں پر دانے نکل آئے۔ اس کے بعد گندگی سے بھرا ہوا برتن اور جوتوں کے ہار میری گردن میں لٹکا کر ننگے بدن اور ننگے پاؤں جون کی چلچلاتی دھوپ میں لوہے کی طرح تپتی ہوئی زمین پر کھلے بندوں گھمایا گیا۔ جس سے میرے پاؤں پر چھالے پڑ گئے۔ غلاظت سے بھرا برتن اُس وقت میری گردن سے علیحدہ نہ کیا جاتا۔ جب تک بے ہوش ہو کر میں زمین پر گر نہ پڑتا۔ میرے گلے میں جھاڑو ڈال کر ننگے بدن بھی پھرایا گیا اور ظالم اچھل اچھل کر پیٹھ پر ٹانگیں بھی مارتے۔ میرے ننگے جسم پر بار بار بجلی کے جھٹکے دیئے گئے جس سے میں چیخ چیخ کر اُچھلنے لگتا اور ظالم میرا مذاق اُڑاتے۔ وہ زنبور سے میری ناک اور کان کو سختی سے دباتے اور سوانگ بھرتے۔ مجھے تقریباً 16 روز تک لگاتار دن رات جگایا گیا۔ چار آدمی ہر وقت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھے رہتے اور مجھے پلک تک جھپکنے نہ دیتے۔ نیند غلبہ کرنے لگتی تو جھٹ دو آدمی بازوؤں سے جکڑ کر مجھے گھمانے لگتے۔ اِس کے باوجود اگر چلتے ہوئے میں نے کبھی آنکھ جھپک دی تو ننگے جسم پر فوراً جلتا ہوا سگریٹ داغ دیا جاتا۔ یا پھر ماچس جلا کر اس کا تاؤ دیا جاتا۔ مجھے قلعہ کی دیوار سے گرانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ دریائے اٹک میں ڈبونے کی تڑی دی گئی۔ اِسے بھی میں نے قبول کر لیا اور اُنہیں جواب دیتے ہوئے کہا کہ اِن اذیتوں سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے گولی مار دیں۔ میں ہاتھ پھیلا کر خندہ پیشانی سے سینہ پر گولی کھا لوں گا۔ ایک دفعہ جب میں اپنے سیل میں تلاوت کر رہا تھا تو قمر عالم اچانک وہاں آ گیا۔ مجھے پڑھتے دیکھ کر وہ چلا کر بولا ”ارے! قرآن پڑھنے کی اِسے کس نے اجازت دی۔“ اِس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد لائنز آفیسر تاج نے غصہ میں آ کر مجھ سے ”پنجسورہ“ اور دعائے جمیلہ چھین لیں۔ میں نے جب یہ کہا کہ یہ تو قرآن ہے۔ تو اِس نے گالیوں کے دوران کہا یہ سب ریڈنگ میٹریل ہے۔ جس کے پڑھنے کی یہاں اجازت نہیں۔ میری مقعد (Rectum) میں مرچیں ڈالی گئیں۔ جس سے مقعد میں شوزش ہو گئی اور میں دیر تک مرچوں کی جلن سے تڑپتا رہا۔ میرے بال اکھاڑے گئے۔ میرے بازوؤں کو کھڑا کر کے باندھا جاتا اور میری گردن میں ڈنڈا کسا

دنوں قلعہ میں ایم ایم احمد (صدارتی مشیر برائے بیرونی قرضہ جات) کے بھانجے حامد محمود اور ان کی بیوی پر وائرلیس بغیر لائسنس رکھنے کے بارے میں انکوائری ہو رہی تھی اور ہر دو کو زدوکوب کیا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بھی ڈٹا رہا تو کہیں یہ ظالم اور بھیڑیئے میری معصوم بچیوں کو قلعہ میں نہ لے آئیں اور انہیں بے عزت نہ کریں۔ اِس لیے میں ہمت ہار بیٹھا میں اپنی جان کی قربانی تو دے سکتا تھا۔ مگر اس اذیت کو برداشت کرنا میرے بس سے باہر ہو گیا اور میں نے گلوگیر آواز میں قمر عالم کو کہا کہ خدا کے لیے اپنے ارادہ سے باز آجایئے۔ میری بیٹیاں آپ کی بیٹیاں ہیں اور آپ کی بیٹی کو میں اپنی بیٹی خیال کرتا ہوں۔ جس پر اِس سنگدل انسان نے میرے منہ پر چھتر برسانے شروع کیے اور اس طرح اپنی بیٹیوں کی عزت بچانے کی خاطر میں نے اُن کی مرضی کا بیان دینا قبول کر لیا۔ پھر کیا تھا، اُن کی جان میں جان آئی اور اِس طرح اُنہوں نے ظلم و ستم کا سلسلہ بند کر دیا۔ مجھے کپڑے دھونے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ مگر چونکہ میرے ہاتھ اور بازو فالج زدہ تھے۔ اس لیے میں کپڑے دھونے سے قاصر تھا۔ چنانچہ کسی دوسرے کو میرے کپڑے دھونے کو کہا گیا۔ مجھے اُس روز اُنہوں نے بڑے اہتمام سے غسل بھی کروایا۔ کیونکہ میں خود جسم کو صابن لگانے سے بھی لاچار تھا۔ انہوں نے مجھے اپنی کوٹھڑی میں سونے کی اجازت بھی دے دی۔ میں کوئی تین روز تک لگاتار سوتا رہا۔ تشدد کے دوران مجھے کئی دفعہ قلعہ کے ''جلادِ اعظم'' درانی کے کمرے میں اُس وقت لایا جاتا جب وہ کسی دوسرے کو تختہ مشق بنا رہا ہوتا اور چیخ و پکار اور خوف و ہراس کمرے میں چھایا ہوتا تھا۔ پٹنے والے سے زیادہ تماشہ دیکھنے والے کی چیخیں نکلتی تھیں اور خوف سے اُس کے جسم پر کپکپی طاری ہوتی تھی۔ ایک دفعہ جب حامد محمود ایم۔ ایم احمد کے بھانجے کو مارا جا رہا تھا تو مجھے ننگا کر کے لایا گیا تھا تاکہ میں زدوکوب کا منظر دیکھ کر گھبراؤں اور اُن کی مرضی کا بیان دینا قبول کر لوں۔ مجھے دو کرسیوں کے درمیان بٹھا کر اور پھر چادر سے ڈھانپ کر یہ کہتے ہوئے چھپا دیا گیا کہ اگر درانی کی تم پر نظر پڑ گئی تو تمہیں فنا کر دے گا۔ اور پھر چپکے سے ایک اور جلاد نے مجھے یہ کہہ کر کرسیوں سے نکالا کہ جلدی سے آنکھ بچا کر

تو میں نے اسے مذاق سمجھا۔ مگر جب اُس نے اِنہیں چبانے پر زور دیا تو بحالت مجبوری کاغذ کے اُن ٹکڑوں کو مجھے گائے کی طرح چبا کر کھانا پڑا۔ غرض سفاکی اور ظلم کے تمام حربے استعمال کرنے کے بعد جب یہ "جلاد" مجھ سے اپنی مرضی کا بیان حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔ تو پھر اُنہوں نے چھوٹے افسروں کو آگے بڑھایا۔ جنہوں نے اپنے لہجہ میں نرمی برتنا شروع کی اور نہایت ہمدردانہ طریقہ سے کہنا شروع کیا کہ کیوں اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔ یہ افسر بڑے ظالم ہیں۔ جب تک تم اِن کی مرضی کا بیان دینا قبول نہیں کرو گے، کسی بھی صورت تمہاری خلاصی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اِن کی مرضی کا بیان دے کر اپنی جان چھڑاؤ اور ہماری بھی۔ جب کیس شروع ہو گا تو اُس وقت کہہ دینا کہ پولیس نے ظلم وستم کر کے بیان لیا ہے۔ مجھے سلطانی گواہ بنانے کے لیے قمر عالم ایس پی نے بڑی کوشش کی اور کہا کہ باہر سے تمہاری کئی سفارشیں آئی ہیں۔ اس وجہ سے ہم تمہاری طرف مائل ہوئے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ تم دونوں بھائیوں میں سے ایک کو بچا لیا جائے۔ ورنہ تمہارے بیوی بچے تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اب تم فیصلہ کر لو کہ تم دونوں میں سے پھانسی سے کون بچنا چاہتا ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ آپ میرے چھوٹے بھائی کو بچا لیں، میں پھانسی لگنے کو پوری طرح تیار ہوں۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ میر منان نے بھی ایسا ہی جواب دیا تھا کہ آپ میرے بڑے بھائی کو بچا لیں۔ میں ہر سزا کے لیے پوری طرح سے تیار ہوں۔ اِس طرح جب وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ہمیں راضی نہ کر سکے تو پھر انہوں نے ایک اور گھناؤنے قسم کا حربہ اختیار کیا۔ مجھے قمر عالم نے وارننگ دی کہ تمہاری بیٹیوں کو پکڑ کر قلعہ میں لایا جائے گا اور اِن کی بے عزتی کی جائیگی۔ اِس شیطان صفت انسان نے ایسے نازیبا الفاظ منہ سے کہے، میری زبان اور قلم اس چیز کی اجازت نہیں دیتے کہ اُن الفاظ کو میں تحریر میں لاؤں۔۔۔۔۔ اِس بد خصلت افسر نے میری بیٹیوں کو کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز لانے کے سلسلہ میں میرے سامنے چوہدری احمد خان کو حکم دیا کہ وہ کراچی آغا سلطان ایس پی کو فون کرے کہ میر قیوم کی دونوں بیٹیوں کو فوراً بذریعہ ہوائی جہاز لاہور بھیج دیں۔ اُن

کھا لیتے ہیں ورنہ وہ پڑے پڑے خراب ہو جاتا ہے۔ نہ اسے اپنے جسم کا ہوش ہے اور نہ اپنے کپڑوں کا پتہ ہے، چوہدری صاحب نے بات کو اور زیادہ قدرتی ظاہر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ہم میر صاحب کو مینٹل ہسپتال بھی لے گئے تھے، جس پر مینٹل ہسپتال کے ڈاکٹر نے کہا کہ ''اسے اب لے کر آئے ہیں جب یہ لاعلاج ہو چکا ہے'' چوہدری صاحب کا اِتنا کہنا تھا کہ میں کثرت جذبات سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اور میرے منہ سے الفاظ نکلنے لگے کہ ظالمو تم لوگوں نے یہ کیا کر دیا۔ اس کے تو چھوٹے چھوٹے معصوم و نازک بچے ہیں۔ اب اُن کا کیا بنے گا۔ ظالمو تم لوگ خدا کو کیا جواب دو گے۔ جس پر چوہدری صاحب گھبرا گئے اور مجھے تسلی دینے لگے کہ فکر مند نہ ہوں۔ ہم اُن کے علاج میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کر رہے، انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں اس اطلاع کے بعد اپنی کوٹھڑی میں کئی روز تک چپکے چپکے روتا رہا۔ مگر اندر سے میرا دل یہی کہتا تھا کہ یہ اطلاع غلط ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آخر ایک دن میں نے لانگری سے بڑی منت سماجت سے یہ پوچھ ہی لیا کہ دیکھو میں تم سے افیم، چرس یا شراب کا مطالبہ نہیں کر رہا، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرے چھوٹے بھائی کی صرف خیریت بتلا دیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ پاگل ہو چکا ہے، میں تمہیں انسانیت کا واسطہ دیتا ہوں جس پر لانگری کے اندر کا انسان جاگ اٹھا اور اُس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ کسی نے بکواس کیا ہے۔ میں تو روز اُنہیں کھانا دے کر آتا ہوں۔ وہ بالکل ہوش و حواس میں ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ لانگری کو گلے لگا کر اس کا منہ چوم لوں مگر چونکہ میں سلاخوں کے اندر تھا اِس لیے ایسا کرنے سے قاصر رہا۔

مجھے ایک دن چوہدری احمد خان انسپکٹر نے بتایا کہ تمہارا دفتر سیل ہو چکا ہے۔ بنک کو آرڈر ہو چکے ہیں کہ اِنہیں پیسے کی ادائیگی نہ کی جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ تمہارے بیوی بچوں کے بنک اکاؤنٹس بھی ''جام'' کیے جا چکے ہیں۔ تمہارے بیوی بچے ایک ایک پیسہ کو ترسیں گے اور سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔

میں نے اُنہیں جواب دیا کہ رزق تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اگر یہ رزق

کمرے سے نکل جاؤ اور اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر لو۔ مجھے کمرہ تشدد میں زدوکوب کرتے ہوئے لے جاتے وقت کئی دفعہ جاوید ساغر نے بھی دیکھا کیونکہ اُن کا سیل میرے راستے میں پڑتا تھا۔

اِس دفعہ کی فضا ہر وقت دل گداز چیخوں سے گونجتی رہتی تھی۔ میں اُن چیخوں سے بچنے کے لیے اکثر اپنے کانوں میں روئی دبائے رکھتا اور بعض اوقات روئی کے باوجود میں اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ دیتا تھا۔ ان چیخوں کے دوران کبھی کبھار چوہدری احمد خان میری کوٹھری کے باہر آکر مجھے اطلاع دیتے کہ جانتے ہو یہ کس کی چیخیں ہیں اور میں جب سر ہلاتا تو وہ طنزیہ لہجہ میں کہتے کہ تمہارا خون کس قدر سفید ہو گیا ہے کہ اب تم اپنے بھائی کی آواز بھی پہچان نہیں سکتے۔ مجھے ایک دفعہ قمر عالم نے کہا کہ اس شاہی قلعہ کی کچھ روایات ہیں۔ انسان کو یہاں نہ دن کا پتہ چلتا ہے اور نہ رات کا، نہ مہینے کا علم ہوتا ہے اور نہ سال کا۔ یہ وہ تاریخی جگہ ہے جہاں بھارت کے وزیرِ اعظم نہرو پر مقدمہ چلا ۔جس چکی میں تم مقیم ہو اُس میں ایک وقت پنڈت نہرو بھی رہ چکے ہیں۔ اِس چکی میں جے پرکاش نارائن کو برف کی سلوں کے درمیان رکھا گیا۔ یہ وہی چکی ہے جس میں حسن ناصرؒ نے دم توڑا اور اب تم اس چکی میں دم توڑو گے۔

قلعہ لاہور میں جسمانی تشدد کے علاوہ مجھے ذہنی اذیت سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ چوہدری احمد خان سے ایک دفعہ میں نے اتنا پوچھ لیا کہ اگر آپ مجھے میرے ساتھیوں کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتے تو کم سے کم میرے چھوٹے بھائی میر عبدالمنان کی خیریت ہی سے آگاہ کر دیجئے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کے متعلق صحیح صورت حال بتاتے اِن کی ''**پولسیانہ**'' رگ بیدار ہو گئی اور اس نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا کہ میر صاحب...... وہ بات کرتے کرتے نہایت ڈرامائی انداز میں رک گئے۔ میں پریشان ہو گیا اور جھٹ بول اٹھا۔ چوہدری صاحب صاف صاف بتایئے کیا بات ہے۔ خدا کے لیے بولیے۔ جس پر اُنہوں نے ٹھہر ٹھہر کر یہ کہنا شروع کیا کہ تشدد کی زیادتی کی وجہ سے اُن کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔ وہ اپنی کوٹھری میں چپ سادھے گم سم پڑے رہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے تو کھانا

چائے پی رہا تھا ادھر اس کے پاس ملٹری کا کوئی آفیسر بھی موجود تھا اُس نے بربریت کا رعب ڈالنے کے لیے پیالی کی گرم گرم چائے ہوا میں لہرا کر منان صاحب کے ننگے بدن پر پھینک دی۔ جس سے اُن کے جسم پر آبلے بن گئے۔

ظلم کی حد تو یہ ہے کہ ایک دفعہ جب مجھ پر بربریت کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا تو میرے چھوٹے بھائی میر عبدالمنان کو کمرے کے باہر لا کھڑا کیا گیا۔ میری باہر کی طرف پشت تھی مجھے قمر عالم نے کہا ذرا پیچھے دیکھو، کاش میں باہر نہ دیکھتا میں نے جو منظر دیکھا وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے مجھے سکتہ ہو گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ منان صاحب باہر مادر زاد ننگے کھڑے ہیں۔ اُن کی گردن میں ڈنڈا کسا ہوا تھا اور گلے میں جوتیوں کے ہار پڑے تھے۔ میری نظریں جھک گئیں۔ مجھے حکم دیا گیا کہ اسے کہو کہ میں تو سب کچھ بتا چکا ہوں تم بھی سب کچھ بتا دو۔

مجھے ایک دفعہ چوہدری احمد خان نے بڑے موڈ میں آکر کہا تم نے کبھی غور کیا کہ تشدد گاہ کے قرب و جوار میں کوئی پرندہ نظر کیوں نہیں آتا؟ اُنہوں نے مجھے خوفزدہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ جگہ ایسی خطرناک ہے کہ یہاں چیخوں کی آوازیں سُن کر پرندے بھی آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

مجھے لون صاحب کے بارہ میں ایک دفعہ بتایا گیا کہ وہ حالت نزع میں ہیں۔ مگر میں نے اِسے سفید جھوٹ سے تعبیر کیا کیونکہ اِس سے پہلے منان صاحب کے بارہ میں ان کی غلط اطلاع کی قلعی کھل چکی تھی۔

مجھے امان اللہ صاحب کے متعلق بھی پتہ چلا کہ جب انہیں قلعہ میں لایا گیا تھا تو اُنہوں نے کسی پولیس آفیسر سے میرے بارہ میں پوچھا تھا۔ چنانچہ انہیں بتایا گیا کہ میر قیوم کا تو کل جہلم تھا۔ اس اطلاع سے اُن کا دل بھی بیٹھنے لگا تھا۔

لون صاحب کو ایک دفعہ یہ اطلاع دی گئی کہ حکومتِ پاکستان اِن لائنز پر غور کر رہی ہے کہ کیوں نہ تمہاری جائیدادیں ضبط کر لی جائیں۔ ڈی آئی جی اطہر نے لون صاحب کو طنزیہ لہجے میں

آپ جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا تو میرے بیوی بچے تو کیا آپ ساری دنیا کو فاقوں مار سکتے تھے۔ کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ کارساز ہے۔ اُن کا کوئی نہ کوئی اور بندوبست کر دیگا۔ قمر عالم بولا کہ تم کشمیری کتنے ذلیل اور نمک حرام ہو ہمارے ملک میں آکر بزنس بھی کرتے ہو، یہاں کا کھاتے ہو اور اس ملک کی جڑیں بھی کاٹتے ہو۔ میں نے جواب دیا ہم نے اب تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی، جس کی بنا پر ہم پر یہ الزام عائد کیا جا سکے۔ ہم سب محبِ وطن ہیں اور آپ لوگوں سے کہیں زیادہ اِس ملک سے پیار کرتے ہیں۔ مگر آپ یہ طعنہ کہ ہمارا اِس ملک پر کوئی حق نہیں۔ صریحاً آپ کی زیادتی ہے۔ ہم نے پاکستان کی محبت میں جموں کے دو لاکھ کشمیریوں کی قربانی دی ہے اور اب تک دیتے چلے آرہے ہیں۔ اگر ہم پاکستان کے بدخواہ ہوتے تو اب تک ہم نے بھارت سے سمجھوتہ کر لیا ہوتا۔ قمر عالم نے میری باتیں سنی اَن سنی کر دیں اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے پھر بولا کہ اگر ہم تم سب لوگوں کو بیوی بچوں سمیت حدِ متارکہ جنگ عبور کرا کر کشمیر بھیج دیں تو کیا تم جانا پسند کرو گے؟ میں نے جواب دیا کہ جب آپ لوگ ہمیں بھارت کے آدمی سمجھتے ہیں تو ایسی صورت میں آپ ہمارا بھلا کریں گے۔ یہ سزا تو نہ ہوئی یہ تو انعام ہوا۔ قمر عالم اپنی غلط بات پر شرمندہ ہوا اور اس سے جب کوئی جواب بن نہ پڑا تو کوئی بہانہ بنا کر اُٹھ کر چلا گیا۔

18, دسمبر 1971ء کو جب کیس شروع ہونے کے سلسلہ میں ہمیں مغربی پاکستان کے مختلف جیلوں سے راولپنڈی لایا گیا اور سب ساتھی جب ایک مدت بعد آپس میں ملے، تو کئی ایک چیزوں کا انکشاف ہوا۔ منان صاحب نے بتلایا کہ شاہی قلعہ لاہور میں جب ایک دفعہ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر میں نے قمر عالم سے پانی پینے کے لیے کہا تو پولیس کے اُس بے رحم اور بدخصلت افسر نے جو اپنے کو پکا مسلمان اور پانچ وقت کا نمازی کہتا تھا، جھٹ سے جواب دیا کہ خنزیر کا پیشاب، گدھے کا پیشاب، کتے کا پیشاب، میرا پیشاب اِن میں سے جس کے پیشاب کی ضرورت ہو بتا دیجیے۔ ہم آپ کی پیاس بجھانے کے لیے فوراً حاضر کریں گے۔ ایک دفعہ پوچھ گچھ کے دوران جب قمر عالم بیٹھا

دھکیل دیں گے اور کہیں گے یہ بھارتی جاسوس تھا اس لیے جیل توڑ کر بھاگ گیا ہے۔

ہاشم نے بتایا کہ مجھے 2000 وولٹ کے بلب کے سامنے بٹھایا جاتا تھا اور حکم تھا کہ میں بلب کی طرف دیکھتا رہوں اور جونہی میں بلب کے سامنے سے آنکھیں ہٹانے کی کوشش کرتا چھتروں کی بوچھاڑ شروع کر دی جاتی۔ جس کی وجہ سے اُن کی آنکھوں پر بہت بُرا اثر پڑا۔

لون صاحب نے بتایا کہ مجھے کہا جاتا کہ اپنے گھٹنوں کو دوہرا کر کے اور بازوؤں کو بڑھا کر کرسی کی مانند بن جاؤ۔ اگر میں تھک کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا تو چھتر برسنے لگتے۔

ہم اِس قدر سخت جان ثابت ہوئے کہ اُن کے انسانیت سوز ظلم وستم کے باوجود ''شاہی قلعہ'' سے زندہ سلامت نکل آئے اور وہاں سے ہمارے جنازے نہ اُٹھ سکے۔ لیکن اِس قلعہ نے ہمیں اعصابی امراض کی جو ''سوغات'' بخشی وہ شاید قبر تک ہمارا ساتھ نہ چھوڑے۔

غرض جب میں نے اُن کے حسب منشا بیان دینا قبول کیا اور اُس کے تین روز بعد جب میں اپنی نیند پوری کر چکا تو پھر انہوں نے لکھا ہوا بیان مجھے پڑھنے کے لئے دیا اور تاکید کی کہ اسے زبانی یاد کر لو۔ میں کئی روز تک اُن کا بیان پڑھتا رہا۔ ایک دن ملک محمد شفیع ڈی ایس پی نے مجھے بلا کر کہا کہ آج تمہیں محمد صدیق ایس پی بلائے گا اور سوالات کرے گا۔ اُس کو ہمارے بیان کے مطابق جواب دینا (محمد صدیق ایس پی قمر عالم کے چلے جانے کے بعد آیا تھا)۔

چنانچہ تھوڑی دیر بعد مجھے ایس پی صدیق نے طلب کر لیا۔ سوالات ہوتے رہے، بیان کے مطابق میں جوابات دیتا رہا۔ مجھے ایس پی صدیق نے سوالات کے درمیان ایک سوال یہ بھی کیا کہ مظفر آباد کنونشن پر کیا خرچ آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ تقریباً پانچ چھ ہزار روپے خرچ آئے تھے۔ ایس پی بولا کہ کیا بات کرتے ہو، اُس پر چالیس ہزار روپے خرچ ہوا تھا۔ میرے پاس اِس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اِس لیے مجھے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ جب اُس نے اِس کے متعلق بار بار سوالات کیے تو میں نے کہہ دیا کہ ملک محمد شفیع نے مجھے اگر چالیس ہزار روپے ظاہر کرنے کو کہا ہوتا تو مجھے کیا اعتراض

پوچھا کہ اگر تمہیں بمعہ تمہارے اہل وعیال کے ملک بدر کر دیا گیا تو تم ہندوستان، بنگلہ دیش یا کشمیر، ان میں کون سی جگہ جانا پسند کرو گے؟ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ سابقہ حکومت ''بنگلہ دیش'' بنانے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی۔

ایک دفعہ قمر عالم نے لون صاحب کو بڑے تحکمانہ انداز میں کہا کہ ڈی آئی جی اطہر آرہا ہے۔ اگر اُسے یہ محسوس ہو گیا کہ تمہارے ساتھ پوری طرح سختی نہیں ہوئی تو سمجھ لو کہ پھر تمہاری خیر نہیں اور یہ کہتے ہوئے اُس نے لون صاحب کے منہ پر چھتر برسانے شروع کر دیئے۔ جس سے اُن کا چہرہ سُن ہو گیا۔ اِس پر شاہی قلعہ کے سب سے بڑے جلاد درانی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب تو یہ پورا کشمیری سیب بن چکا ہے۔

لون صاحب نے اکتوبر 1966ء میں این۔ ایل۔ ایف کو جو دس ہزار روپے دیئے اُس پر اطہر کہنے لگا کہ اُس زمانہ میں اپنی جیب سے دس ہزار روپے بھلا کون دے سکتا ہے۔ جس پر لون صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر کی آزادی کے لیے والہانہ تڑپ کی وجہ سے کشمیری حلقوں میں میر عبدالقیوم کی ایسی پوزیشن ہے کہ دس ہزار تو کیا اگر وہ دس لاکھ بھی مجھ سے طلب کریں تو کم سے کم میں انکار نہیں کر سکتا۔

ایک دفعہ لون صاحب کو کہا گیا کہ اگر تم یہاں سے خلاصی کروانا چاہتے ہو تو ہمارے سلطانی گواہ بن جاؤ مگر اِس صورت میں تمہیں یہ بھول جانا ہو گا کہ تمہارا کوئی دوست ساتھی یا کوئی بھائی بھی تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ تم نے نیا جنم لیا ہے۔ جس پر لون صاحب نے قمر عالم کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ میری بچیاں ابھی چھوٹی ہیں اور اُن کے دلہن بننے میں ابھی کافی دیر ہے۔ مگر قیوم کی بچیاں تو شادی کے قابل ہیں۔ میں میر قیوم کے خلاف بیان دے کر اور انہیں بھارتی جاسوس کی شکل میں پیش کر کے اُن کی معصوم بچیوں کی زندگی کو کیسے اجاڑ سکتا ہوں۔ جس پر برہم ہو کر اُن پر دوبارہ ظلم وستم ڈھائے گئے۔ اشرف سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ اسے کہا گیا کہ ہم آپ کو حدِ متارکہ جنگ کے اُس پار

کے بعد مجھے محمد شفیع ملک نے کہا ڈی آئی جی اطہر کے پاس سومناتھ کپور اور بھٹناگر اسسٹنٹ سیکرٹری انڈین ہائی کمیشن کی تصاویر ہیں وہ تمہیں اندر جا کر پہچاننا پڑیں گی۔ میں نے کہا وہ تصاویر مجھے پہلے دکھا دیجیے اور بتا دیجئے کہ یہ کس کس کی تصاویر ہیں تاکہ اُن کے پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ وہ بولے کہ مسٹر اطہر تصاویر دکھانے کو تیار نہیں۔ میں نے کہا کہ جب میں اُن لوگوں کو جانتا ہی نہیں، اُنہیں ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تو میں اُن تصاویر کے متعلق انہیں کیسے بتا سکوں گا۔ وہ بولے کہ ہمیں خود کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کریں۔ تمہارے جی میں جو آئے کہہ دینا۔ اتنے میں مسٹر اطہر نے اندر بلا لیا۔ اس کے کمرے میں ایک کرنل معین بٹ بھی بیٹھے تھے۔ مسٹر اطہر نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ تم کیوں جھوٹ بولتے ہو، کیوں اپنے ساتھیوں کو خواہ مخواہ پھنساتے ہو، کیوں اپنے سگے بھائی کے پیچھے پڑے ہو، کیوں سچ نہیں بولتے۔ جس پر میں نے اطہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ذرا ایک دفعہ پھر دہرائیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ بولے کہ میں کہہ رہا ہوں کہ سچ بولو اور اپنے ساتھ دوسروں کو پھنسانے کی کوشش نہ کرو۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ میں جب سچ بولتا ہوں تو آپ کے ماتحت افسران کہتے ہیں کہ اگر تم نے جھوٹ نہ بولا تو تمہاری بیٹیوں کو شاہی قلعہ میں لا کر بے عزت کیا جائے گا، تمہاری بیوی کی عزت لوٹی جائے گی اور اگر میں اُن سب کی عزت بچانے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیتا ہوں اور اپنے ساتھ اپنے ساتھیوں کے علاوہ اپنے ماں جائے بھائی کو بھی نہیں بخشتا تو آپ کہتے ہیں کہ سچ بولیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے صاف صاف بتائیں کہ میں کیا کروں۔ آپ لوگ تو مجھے پاگل بنا کے چھوڑیں گے۔ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی تھی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ اطہر اور کرنل خاموشی سے میری باتیں سن رہے تھے۔ جب میں نے بات ختم کی تو اطہر نے کہا کہ آپ سچ بولیں۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے دوبارہ میری بیوی اور بچیوں کو قلعہ میں لانے کی دھمکیاں شروع ہو گئیں تو؟ وہ کہنے لگے کہ تم اطمینان رکھو اب تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ جس پر میں نے جواب دیا کہ میں نے جو بیان ابتداء میں

ہوسکتا تھا۔ جس پر ملک محمد شفیع جو پاس ہی بیٹھے تھے، زرد پڑ گئے۔ اوراس کے ساتھ ہی ایس پی کے چہرے پر بھی غصے کے آثار نظر آنے لگے۔ مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔ اِس کے بعد جب ملک شفیع ڈی ایس پی اوراحمد خاں انسپکٹر کمرے سے باہر آئے تو مارے غصہ سے اُن کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ غالباً اِنہیں کہا گیا ہوگا کہ تمہارا گواہ کچا ہے۔ ملک شفیع نے مجھے مکّوں، دوہتڑوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ تم بڑے مکار ہو، تم نے ہماری پوزیشن خراب کر کے رکھ دی۔ تم اِس قلعہ میں بس گل سڑ جاؤ گے۔ میں نے کہا میرا کیا قصور ہے، جب آپ نے خود ہی اتنا پیرہ لکھا تھا تو میں آخر کیا کہتا۔ ملک شفیع بولے کہ کہہ دیتے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ یہ کیوں کہہ دیا کہ ملک صاحب نے اتنا پیرہ لکھا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھے خاصا زدوکوب کیا اور مجھے میری کوٹھڑی میں لے جا کر دروازے سے اُلٹی ہتھکڑی لگا کر جکڑ دیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے پھر ایک نیا بیان لکھا اور مجھے پڑھنے کے لیے دے دیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے ڈی آئی جی اطہر نے بلوالیا۔ میں اُن دنوں بے حد نحیف تھا اور میرے بازو بالکل کام نہیں کرتے تھے۔ میں ایک کمرہ میں بیٹھا تھا کہ ایک ڈاکٹر صاحب آگئے اور بولے کہ آپ کمزور ہوگئے ہیں، اس لیے آپ کا میڈیکل چیک اپ کیا جائے گا۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھے گلوکوز کے انجکشن کا بہانہ کر کے بیہوشی کا انجکشن لگا دیا۔ جس سے مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ مگر چونکہ میں نے ناشتہ کیا ہوا تھا اِس لیے پوری طرح بے ہوش نہ ہوسکا۔ غالباً یہ وہی عمل تھا جسے Neuroanalysis کہا جاتا ہے۔ اِس طرح مجھے بے ہوش کر کے سوالات کئے جاتے رہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں بے ہوش نہیں تھا، مجھے جو سولات کئے جاتے رہے ہیں، اُن کے بیان کے مطابق جواب دیتا رہا۔ سوالات کے دوران جب میں نے پلٹ کر سوال کرنے والے کو دیکھا تو وہ ڈی آئی جی مسٹر اطہر تھا۔ میں ڈی آئی جی کو پہلے کراچی سی آئی اے کے آفس میں چند ایک دفعہ دیکھ چکا تھا۔ اِس نے مجھے پیٹا بھی تھا۔ اِس لیے میں نے دیکھتے ہی کہا کہ میں آپ کو پہچانتا ہوں آپ مسٹر اطہر ہیں۔ جس پر مسٹر اطہر گھبرا گئے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اِس

100 بار اُٹھک بیٹھک مکمل نہ کی، اُن ظالموں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ بار بار ڈنڈا کہنے سے میرے بازو پھر ناکارہ ہو گئے۔ چوہدری احمد خان بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ میری سفارش کرتے ہوئے اس نے ملک شفیع کو کہا کہ "ملک صاحب یہ پہلے ہی بے حد کمزور اور نحیف ہو چکا ہے۔ برسات کا موسم ہے کہیں مر ہی نہ جائے"۔ جس پر پاس بیٹھے ہوئے مظفر نامی انسپکٹر نے کہا کہ "کیا فرق پڑے گا خس کم جہاں پاک" اور اس کے ساتھ ہی اس نے غصے میں آ کر میری گردن پر زوردار مکا مارا۔ چھتروں سے بھی پیٹنا شروع کیا اور بے نطق گالیاں بھی دیں۔ اُس کے پاس بیٹھے ہوئے ملک فیض اے ایس آئی نے بھی کہنا شروع کیا کہ ملک صاحب یہ آدمی مجھے بڑا ہی "مکری" لگتا ہے۔ ملک شفیع کے پاس چوہدری بدرالدین ڈی ایس پی بھی آ کر بیٹھتا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کشمیری قوم کو گالیاں دینے لگتا اور اکثر کہتا کہ "اِس آدمی کو میرے حوالے کر دو دیکھوں گا کہ کیسے نہیں بتاتا۔" مجھے چاروں طرف سے صلواتیں سنائی جا رہی تھیں کہ اتنے میں ملک صاحبان اور چوہدریوں کا کھانا آ گیا۔ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ کر سب افسران کھانا کھانے لگے۔ میں ننگے بدن فرش پر بیٹھا تھا۔ کھانے کے دوران ملک شفیع نے ایک سپاہی کو کہا کہ اِسے بھی کھانا کھلا دو تا کہ کھانے کے بعد پھر اس کی "خاطر مدارت" کا سلسلہ شروع کیا جا سکے۔ چنانچہ میرے لیے دال اور دو روٹیاں آ گئیں۔ میں نے ہوائی چپل پر نشست جمائی اور چوکڑی مار کر روٹی کھانے لگا۔ پولیس افسران مرغے اُڑاتے ہوئے ساتھ ساتھ طنز بھی کرتے کہ اتنی مار کھانے کے باوجود یہ شخص دن بدن موٹا ہوتا جا رہا ہے اور اِس میں معمولی سا فرق بھی نہیں پڑا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اُنہوں نے مجھے سیل میں بھیج دیا۔ میں دو تین روز تک وہیں رہا۔ اِس کے بعد ایک دن پھر اُنہوں نے بلایا اور نیا بیان مجھے دے دیا کہ اسے سیل میں لے جا کر یاد کرو۔ جب تم اسے پوری طرح یاد کر لو گے تو پھر تمہیں مجسٹریٹ کے سامنے جا کر یہ بیان زبانی لکھوانا ہو گا۔ میں کافی دن تک یہ بیان یاد کرتا رہا اُس دوران چوہدری احمد خان اور ملک فیض سیل میں آ کر کہہ جاتے کہ یاد رکھو مجسٹریٹ کے سامنے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ ورنہ دوبارہ شاہی قلعہ واپس آ جاؤ گے اور پھر

کراچی میں دیئے تھے، وہی سچا بیان ہے اور باقی جو باتیں مجھ سے کہلوائی جارہی ہیں وہ پولیس کے تیار کئے ہوئے بیان کے مطابق ہیں، جو بالکل جھوٹ اور صریحاً غلط ہیں اور اِن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میرے جواب پر کرنل اور اطہر خاموش ہو گئے اور مجھے باہر جانے کا حکم دے دیا۔ ملک محمد شفیع میانوالی تمام باتیں باہر سُن رہا تھا۔ جونہی میں باہر نکلا وہ مجھ پر برس پڑا اور مکے مارنے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے کہ کیسے ''مکری'' آدمی سے پالا پڑا ہے۔ اتنا کچھ سمجھانے کے باوجود یہ جھٹ پٹڑی سے اتر جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ جو جی میں آئے کہہ دینا، تمہیں پورا اختیار ہے۔ ملک شفیع نے گالیوں کے دوران کہا کہ اس کا یہ مطلب تھوڑا تھا کہ تم کہو کہ میں نے جو کچھ بتایا یہ جھوٹ تھا اور پولیس کی کہانی کے مطابق تھا۔ میں نے تو تصاویر کے متعلق کہا تھا کہ کچھ بھی بتا دینا۔ اُنہوں نے مجھے مارتے مارتے لائنز آفسر چوہدری تاج کے سپرد کیا کہ اِسے لے جا کر اُلٹی ہتھکڑی لگا کر دروازے سے کس دو۔ چنانچہ چوہدری تاج مجھے مارتے مارتے نیچے سیل میں لے گیا اور اُلٹی ہتھکڑی لگا کر دروازے کے ساتھ جکڑ دیا۔ اِس کے بعد مجھے پھر ایس پی صدیق نے بلایا اور (LIEDETECTOR) کی مدد سے مجھ پر کئی سوالات کئے۔ جن کے جواب میں ٹھیک ٹھیک دیتا رہا۔ مجھے (LIEDETECTOR) کی رپورٹ کے متعلق احمد خان انسپکٹر نے بتایا تھا کہ تم بالکل سچے ثابت ہوئے ہو۔ پولیس نے یہ رپورٹ عدالت العالیہ میں پیش نہیں کی اور ضائع کر دی۔ مسٹر اطہر نے اپنے بیان میں قبول کر لیا تھا کہ (LIEDETECTOR) استعمال ہوا ہے۔ مگر رپورٹ ضائع کر دی گئی۔ مشین نے تمہاری ہر بات کا جواب درست بتایا ہے۔ کچھ دن سیل میں رکھنے کے بعد مجھے پھر انکوائری آفس بلوا کر سختی شروع کر دی گئی۔ پھر میری گردن میں ڈنڈا کس دیا گیا۔ مجھے ایک پاؤں کے بل کھڑا کیا گیا۔ مجھے مرغا بنایا گیا۔ میں نے ڈنڈ بھی پیلے۔ ایک سو بار مجھ سے اُٹھک بیٹھک بھی کروائی گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ میں دس بار اُٹھ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ جونہی میں رُکتا مجھ پر مکے اور چھتر برسنے لگتے اور میں پھر اُٹھک بیٹھک کرنے لگ جاتا۔ اسی طرح دم لے لے کر جب تک میں نے

بھی چائے منگوا دیں۔ چنانچہ میرے لیے فوراً چائے آ گئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے پانچ منٹ بعد مجسٹریٹ خواجہ رشید نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا کہ یہ بیان پڑھتے جائیں میں لکھتا جاتا ہوں۔ میں نے وہ بیان یہ کہتے ہوئے پڑھنے سے انکار کر دیا کہ یہ بیان میرا نہیں ہے۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے بیان اپنے سامنے رکھ کر خود ہی اِس کی نقل شروع کر دی۔ اُس دوران ملک شفیع بار بار ریٹائرنگ روم میں آ کر مجسٹریٹ سے لکھے ہوئے صفحات لے کر باہر پڑھتے رہے اور اگر کوئی لفظ رہ جاتا تو وہ اُسے مجسٹریٹ سے درست کروا لیتے۔ چھ گھنٹے تک یہ بیان لکھا جاتا رہا اس کے بعد یہ بیان مکمل ہونے کے بعد اُس کا آخری صفحہ انہوں نے یہ کہتے ہوئے مجھے دیا کہ اس پر اپنے دستخط کر دیں۔ جی میں آیا کہ میں کہوں کہ یہ بیان جھوٹ، فریب اور سازش ہے۔ مگر یہ الفاظ میرے گلے میں اٹک گئے کہ کہیں یہ لوگ مجھے پھر سے قلعے میں نہ لے جائیں اور میری بچیوں اور میری بیوی کی عزت خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ چنانچہ میں نے اپنی بچیوں کی عزت بچانے کی خاطر اپنے ہاتھوں سازش کی۔ اس دستاویز پر دستخط ثبت کر دیئے۔

جونہی میں نے بیان کے آخری صفحہ پر دستخط کئے ملک شفیع کے چہرے پر خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بیان دینے کے بعد جب میں عدالت کے ریٹائرنگ روم سے باہر آیا تو غلام حسین بٹ ایس پی موجود تھے۔ بات چیت کے دوران میں نے اُنہیں بتایا کہ اِن لوگوں نے مجھ پر بے حد ظلم کئے ہیں اور جھوٹا بیان مجھ سے منسوب کیا ہے۔ بٹ صاحب میری بات سن کر چونکتے ہوئے بولے۔ یہ جو بیان تم نے دیا ہے حقیقت نہیں۔ میں نے انہیں فوراً جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میں ایک دو بار اندر بھی گیا تھا مجھے اگر کہہ دیتے تو میں اس بیان کو ہونے ہی نہ دیتا اور آپ کو بیان لیے بغیر ہی کراچی بھیج دیتا۔ اُنہوں نے بتایا کہ منان اور لون نے بھی بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے انہیں بیان لیے بغیر ہی سندھ کی مختلف جیلوں میں بھیج دیا ہے۔ اس طرح بٹ صاحب کی زبانی منان صاحب اور لون صاحب کے قلعہ سے چلے جانے کا عقدہ

تمہاری کوئی شنوائی نہیں ہوگی اور تمہارے ساتھ تمہاری بچیوں کو بھی بے عزتی ہو جائے گی۔ یاد رکھو مارشل لاء کا زمانہ ہے۔ ہمارے پاس پورے اختیارات ہیں، ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ مقبول احمد بٹ نہیں مانتا تھا مگر جب اسکی بیوی کو قلعہ لاہور میں لایا گیا تو اسے بیان دینے پر راضی ہونا ہی پڑا تھا جسے سن کر میں کانپ گیا اور انہیں یقین دلایا کہ جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی کروں گا۔ اور یہ کسی بھی صورت پسند نہیں کروں گا کہ میری بچیوں کو یہاں لے کر آئیں۔ آخر ایک دن صبح سویرے مجھے حکم دیا گیا کہ اپنا سامان وغیرہ اکٹھا کر کے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں نے جلدی اپنے دو تین کپڑے چادر میں لپیٹے اور تیار ہو گیا۔ میرے کپڑوں کی گٹھری ساتھ لینے کی بجائے کوٹھڑی ہی میں رہنے دی گئی تاکہ مجھے خیال رہے کہ یہ مجھے واپس بھی لا سکتے ہیں۔ میں کوئی 9 بجے کچہری کے لیے پولیس وین میں روانہ ہوا۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے میں نے ملک شفیع سے گزارش کی کہ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے میرا چپل ٹوٹا ہوا ہے۔ میں نے کئی بار لائنز افسر کو بھی اِس کی مرمت کے لیے کہا مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ چنانچہ میں رسیاں باندھ کر گزارہ کرتا رہا۔ میں نے ایک دفعہ بھنگی کو بھی کہا تھا کہ اِس کی مرمت کرا کے لا دے۔ جس پر غصہ میں آ کر اس نے کسی دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ وقت بھی آنا تھا کہ قلعہ کا ایک ملزم ہمیں حکم دے کہ میرا جوتا مرمت کروا کر لا دو"۔ ملک صاحب کو رحم آ گیا اور اس نے موازی پانچ آنے اپنی جیب سے نکال کر ایک سپاہی کو دیئے کہ اس کا چپل جلد مرمت کروا کے لے آؤ۔ قلعہ کے 70 روز کے قیام میں یہ پہلا احسان تھا جو اُنہوں نے مجھ پر کیا اور اس طرح کئی روز تک ننگے پاؤں پھرنے کے بعد میرے پاؤں کے تلوے اور ایڑیاں سخت ہو چکی تھیں۔

کورٹ میں پہنچنے کے بعد کچھ دیر تک مجسٹریٹ کا انتظار کرنا پڑا۔ مجسٹریٹ جب آیا تو ملک شفیع اور ملک فیض نے مجسٹریٹ کے لیے لنچ کا بندوبست کیا اور ساتھ پھل وغیرہ سے بھی اُن کی خاطر مدارت کی۔ میں بھی مجسٹریٹ کے ساتھ ہی ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ مجسٹریٹ نے چوہدری شفیع کو کہا کہ اِسے

داستان جو یہاں کے سفاک درندہ صفت اور خونخوار انسان نما بھیڑیوں نے این ۔ایل ۔ایف اور محاذِ رائے شماری کے محبِ وطن بے لوث اور مہذب کارکنوں کے ساتھ غاصب یحییٰ خان کی ملٹری رجیم وزارتِ امورِ کشمیر کے اجارہ داروں اور سردار قیوم نے اپنی ملی بھگت کے تحت روا رکھی، ذہنی اور جسمانی اذیتیں تو ایک طرف ہمیں معاشی طور پر بھی مفلوج کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ہمیں شاہی قلعہ سے مغربی پاکستان کی مختلف جیلوں میں ایک ایک کر کے بکھیر دینے کے باوجود اذیت پسند ڈی ۔آئی ۔جی اطہر نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا اور ہر جیل کے متعلقہ حکام کو مارشل لاء اتھارٹی کی طرف سے انتہائی سخت قسم کی ہدایت جاری کروا دیں۔ تا کہ ہمیں کہیں بھی آرام و سکون میسر نہ آسکے۔ سختی کا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اس ذہنی مریض کا بطور سیکرٹری فیڈرل پبلک سروس کمیشن تبادلہ نہیں ہو گیا۔

جنابِ والا! اِس مقدمے میں ہائی جیکنگ کے واقعہ کو محض ایک بہانہ بنایا گیا ہے۔ ہماری جماعت محاذِ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) اور اِس کے عہدیداروں اور کارکنان کا اگر کوئی قصور ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ پاکستان کو صحیح معنوں میں پاکستان دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک ایسا پاکستان جو پاکستانی عوام کی خواہش کے عین مطابق ہو، جو بھارتی مقبوضہ کشمیر کے 35 لاکھ مظلوم کشمیری مسلمانوں کا حامی و سرپرست اور حقیقی طور پر نجات دہندہ ہو۔ وہ آزاد کشمیر میں ایسے جمہوری نظام کو فروغ دینا چاہتے تھے جو برصغیر میں ''جمہوریت'' کا اعلیٰ ترین نمونہ ہونے کے علاوہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کے لیے باعثِ کشش ہو۔ ہم آزاد کشمیر کو تحریکِ حریت کشمیر کا بیس کیمپ بنا کر ریاست جموں کشمیر کے باقی ماندہ دو تہائی علاقہ کی نجات کے لیے اِسے ایک چھاؤنی کی صورت دینا چاہتے تھے۔ گلگت بلتستان سے ایف ۔سی ۔آر اور بدنام زمانہ ایجنسی نظام کو ختم کر کے وہاں پر مروجہ جمہوری اداروں کو فروغ دینا اور اِس علاقے کے چھ لاکھ جیالے اور حریت پسند عوام کو حق رائے دہی دلا کر اِنہیں آزاد کشمیر میں اُن کے تناسب آبادی کے لحاظ سے پوری پوری نمائندگی دلانا تھا اور یہ

کھلا۔ ورنہ یہ لوگ مجھے یہی بتا رہے تھے کہ لون صاحب نے ہماری مرضی کا بیان دے دیا ہے اور ہم اُنہیں اِس لیے قلعہ میں واپس لے آئے تھے کیونکہ انہیں لے جانے کے لیئے گارڈ کراچی سے آنا ہے۔ گارڈ کے آتے ہی اُنہیں سندھ بھیج دیا جائے گا۔ میں بٹ صاحب سے باتیں کر رہا تھا کہ اندر سے ملک شفیع اور ملک فیض بھی آ گئے۔ جب انہیں پتہ لگا کہ میں نے بٹ صاحب کو بتا دیا ہے کہ مجھ سے جھوٹے بیان پر دستخط لیے گئے ہیں تو وہ برہم ہو گئے اور کہنے لگے کہ تمہیں تو منع کیا تھا کہ کسی سے کوئی بات نہ کرنا مگر تم بکواس کرنے سے باز نہ آئے۔ جس پر میں نے کہا کہ ''ظالمو اب تو میں نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر ہی دیئے ہیں اب آپ کیوں پریشان ہو گئے''۔ جس پر وہ خاموش ہو گئے اُس کے بعد مجھے نولکھا تھانہ میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے 26 ,اگست 1971ء کی رات اُسی تھانہ میں (جس میں تقریباً 12 آدمی جن میں اکثریت گرہ کٹ اور جواری قسم کے لوگوں کی تھی) گزاری۔ جوالات میں اِس قدر گندگی اور پیشاب کی بو تھی کہ میں رات بھر بیٹھا رہا اور پل بھر کے لیے بھی میری آنکھ نہ لگ سکی۔ میں جب بھی اپنے دیئے بیان پر غور کرتا، میری روح کانپ جاتی۔ ظالموں نے میرے محبِ وطن ساتھیوں کو تو ایک طرف میرے ماں جائے بھائی کو بھی نہ بخشا۔ میں بے بس تھا۔ اپنی بیوی اور عفتِ مآب بچیوں کی عزت بچانے کے لیے مجھے یہ زہر ہلاہل پینا ہی پڑا۔ اُس بیان پر دستخط کرنے کے بعد ندامت اور شرم سے میرا سر جھک گیا اور میں اپنے بھائی اور محبِ وطن ساتھیوں سے نظریں چار کرنے کے بھی قابل نہ رہا۔ دوسرے روز 27 ,اگست 1971ء کو مجھے بتایا گیا کہ تمہیں کراچی نہیں بلکہ حیدر آباد بھیجا جا رہا تھا۔ جس سے میں پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہم حیدر آباد جانے کے لیے سٹیشن پر پہنچ گئے اور اُس کے ساتھ ایک کوٹھڑی میں پڑے ہوئے میرے کپڑے کوئی سٹیشن پر لے آیا اور دوسرے روز میں بذریعہ خیبر میل حیدر آباد پہنچ گیا۔

حرفِ مُدعا

جناب والا! یہ تھی شاہی قلعہ لاہور کے عقوبت خانے میں کی گئی جسمانی اور ذہنی اذیتوں کی

نسخہ ہے کہ اُن پر جھٹ سے کسی ملک کے جاسوس ہونے کا الزام لگا دو۔ بجائے اِس کے کہ وہ تعمیری کام سے اپنے ملک وملت کی کوئی خدمت انجام دے سکیں۔ اُنہیں جاسوسی کا نام دے کر اس چکر میں ڈال دو کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے میں مصروف ہو جائیں۔ اِس ملک کا حکمران طبقہ اب تک یہی کچھ کرتا چلا آیا ہے۔ اِنہیں کسی بھی اخلاقی قدر پر یقین نہیں۔ اِس طبقے کی اکثریت صرف مال و جاہ، اقتدار اور عیش وعشرت کی بھوکی رہی ہے۔ ان کا کوئی نصب العین نہ تھا۔ اُن کے جو جی میں آتا کر گزرتے۔ سابقہ حکمران طبقے کے افراد کے ہاتھوں قتل وغارت، جھوٹ، بددیانتی اور خیانت سب کے لیے دلیلیں موجود تھیں۔ ہر بات میں فریب، ہر بات میں ریا۔ اِنہیں نہ اللہ کا خوف تھا نہ اِس کا کوئی احترام۔ نہ بہشت کی خواہش اور نہ جہنم کا ڈر۔ نہ انہیں خدا کی خدائی پر کوئی یقین تھا اور نہ اس بات کا خوف کہ کل کو یوم حساب بھی آنے والا ہے۔۔ بہر حال وقت ایک بہت بڑی کسوٹی ہے جو ہر چیز کو آئینہ کی طرح سامنے لے آئے گی۔ تحریکیں غیر فانی ہوتی ہیں، وہ زندہ رہتی ہیں اور کبھی نہیں مرتیں۔ خواہ اِس کے لیے کیسے ہی سخت سے سخت ہتھکنڈے کیوں نہ اختیار کئے جائیں۔ ظلم اور استحصال کے خلاف جہاد کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ظالم زیادہ دیر تک ظلم نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ عادلِ مطلق ہے وہ ظلم ...... کا موقع تو دے سکتا ہے مگر اسے بغیر محاسبے کے نہیں چھوڑ سکتا۔ ہمارے اوپر جو ظلم ہوا ہے وہ رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا۔ ہماری مظلومیت اللہ تعالیٰ کے حضور میں فریاد کناں ہوگی اور قدرت ظالموں کو یقیناً کیفرِ کردار تک پہنچائے گی۔ اگر ہم جیسے لوگ جاسوس ہو سکتے ہیں تو پھر پاکستان اور آزاد کشمیر میں رہنے والا کوئی بھی کشمیری محبِ وطن نہیں ہو سکتا۔ بقولِ اقبال:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

میر عبد القیوم

انچارج شعبہ مالیات، جموں کشمیر قومی محاذِ آزادی

مورخہ 23 جون 1972ء

ہماری ہی جدوجہد اور قربانیوں کا ثمر ہے کہ حکومتِ پاکستان نے گلگت بلتستان کے بیشتر علاقوں سے ایف۔سی۔آر کی لعنت کے خاتمہ کا آخرکار اعلان کر ہی دیا۔

جناب والا! ہم نے عوام کے حقوق کے لیے جو آواز بلند کی وہ سابقہ حکومت کے اجارہ داروں کی طبع نازک پر گراں گزری اور اس طرح ہمیں کچل دینے کے لیے اُنہوں نے ہم پر دودھاری تلوار کا وار کیا۔ ایک طرف اپنا "کیس" مضبوط کرنے کے لیے دونوں "ہائی جیکرز" محمد ہاشم قریشی اور محمد اشرف قریشی کو قربانی کا بکرا بنایا اور دوسری طرف کشمیر کے بارے میں اُن کی حکمتِ عملی سے اختلاف رکھنے والے جموں وکشمیر محاذِ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کے تقریباً دوصد (200) محبِ وطن اور بے لوث سرکردہ کارکنوں کو ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہوئے "شاہی قلعہ" لاہور اور "دلائی کیمپ" مظفر آباد کے عقوبت خانوں میں بند کر دیا اور پھر اِن میں سے سات آدمیوں جناب مقبول احمد بٹ، جناب غلام محمد لون، جناب میر عبدالمنان، جناب ہاشم قریشی، جناب اشرف قریشی ، ڈاکٹر فاروق حیدر اور مجھے گھناؤنے قسم کے الزامات عائد کر کے غداروں کی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ پوری قوم جانتی ہے کہ محاذِ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر اور پاکستان) اور جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ (JKNLF) کے سبھی کارکن محبِ وطن ہیں اور کشمیر کی آزادی کے لیے دوسروں پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے عملی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ میں اپنی فرم کی Assessment Order کی نقول IWS4/2-12 ایگزبٹ کر چکا ہوں تاکہ میری مالی پوزیشن کا علم عدالت العالیہ کو ہو جائے۔ سابقہ حکومت کو یہ بھی معلوم تھا کہ اِن میں سے کوئی بھی اقتدار کا بھوکا نہیں اور نہ ہی ہوسِ زر اُن کو میدان سیاست میں کھینچ لائی ہے۔ دوسروں کی طرح اگر ہم بھی وزارتِ امورِ کشمیر کے ہاتھوں بک جاتے اور اُن کی تال پر ناچتے رہتے تو پھر ہماری یہ دُرگت بھی نہ بنتی اور نہ ہی ہم پر جاسوس ہونے کا شبہ ہی کیا جاتا۔

اِس ملک میں مخلص، بے لوث اور محبِ وطن لوگوں کا منہ بند کرنے کا بس ایک ہی آسان

میر عبدالمنان

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے نامور راہنما میر عبدالمنان ریاست جموں کشمیر کے سرمائی دارالحکومت جموں شہر کے ایک مذہبی گھرانے میں 27, اپریل 1921ء کو پیدا ہوئے۔ میر عبدالمنان نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد سیاسی بیداری اور افراتفری کا ماحول پایا۔ 1931ء میں جب مسلمانانِ کشمیر نے ڈوگرہ نظام کے خلاف بغاوت شروع کی اس زمانے میں وہ دس برس کے تھے۔ لاٹھی، گولی اور احتجاج کے اس ماحول نے میر عبدالمنان کو شدید متاثر کیا۔ وہ بچپن سے ہی حریت پسندانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے کے عادی بن گئے۔ بی اے کے بعد اُنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کر کے 1942ء میں وطن عزیز کو واپس لوٹ آئے۔

تحریک پاکستان عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ علی گڑھ کے طلبا نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میر عبدالمنان بھی آزادی اور حریت کے جذبات لئے جموں واپس پہنچے تو یہاں بھی وہ خاموش نہ رہ سکے۔ اُنہوں نے انجمن اسلامیہ جموں اور مسلم کانفرنس کی سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو تحفظ دینے کی خاطر ایک ''لاٹھی ٹریننگ سنٹر'' قائم کیا۔

1944ء میں ان کی اعلیٰ تعلیمی قابلیت کے پیشِ نظر حکومت نے انہیں ملازمت میں لے لیا۔ دورانِ ملازمت بھی اُنہوں نے در پردہ اپنی حریت پسندانہ سرگرمیاں جاری رکھیں جن کی پاداش میں اُنہیں قدم قدم پر تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ 1947ء میں اُنہوں نے اپنے بڑے

غزل

مرتضیٰ برلاس

وقت کی تیز تپتی ہوئی ریت پر پڑ گئے پاؤں میں آبلے دوستو
سانس اکھڑا کیا جسم ٹوٹا کیا، ہم نہ ہارے مگر حوصلے دوستو

رنگ و بو کی کشش ہے فریبِ نظر، اپنا دستِ رسا دیکھنا چاہیئے
ہاتھ جلتے ہوں جب پھول کی آنچ سے ایسے پھولوں سے کانٹے بھلے دوستو

میری ناکامیوں کی دبی آگ سے جانے کس کس کے دامن جھلس جائیں گے
بات چھیڑی تو پھر بات بڑھ جائے گی، یہ بھی سوچا کبھی من چلے دوستو

جو حقائق پرستی کی خاطر جیے، انکی حالت زبوں سے زبوں تر ہوئی
جو حقائق کو ٹھوکر لگا کر چلے، وہ ہی دنیا میں پھولے پھلے دوستو

شوقِ صحرا نوردی تو دیکھو ذرا، جس کو دیدارِ منزل گوارا نہیں
جتنی تیزی سے ہم سوئے منزل بڑھے، اور بڑھتے گئے فاصلے دوستو

انہی ایام میں کراچی میں بھٹو سورن سنگھ مذاکرات کا آغاز ہوا۔ وزراء خارجہ کا اجلاس میکلوڈ روڈ کراچی پر واقع سٹیٹ بینک آف پاکستان کی بلڈنگ میں ہوا۔ ان مذکرات کی اندرونی کہانی ایک واقف حال نے میر عبدالمنان تک پہنچادی۔ جس سے صاف عیاں ہوا کہ دونوں ملک ریاست جموں کشمیر کو مستقل بنیادوں پر تقسیم کرنے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تقسیم کشمیر کا منصوبہ میر عبدالمنان کیلئے نہایت تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے کراچی میں مقیم کشمیری عمائدین کو اس بارے خبردار کیا اور شام کو مسٹر کے ایچ خورشید کے دفتر میں میٹنگ کا فیصلہ کیا۔ میر عبدالمنان اور کے ایچ خورشید زمانہ طالب علمی سے ایک دوسرے کے بہت قریب رہ چکے تھے اور اے آر ساغر کے ہفت روزہ جموں میں بھی اکٹھے کام کرتے رہے تھے۔ تقسیم کشمیر کی ان خفیہ سازشوں کے خلاف میر عبدالمنان اور کراچی کے دیگر کشمیریوں نے بھرپور آواز بلند کی۔

1964ء میں شیخ محمد عبداللہ کے دورۂ پاکستان و آزاد کشمیر کے موقع پر یہاں بھی محاذ رائے شماری کے قیام کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی چنانچہ کراچی میں مقیم کشمیریوں نے اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ میر عبدالمنان ان کے شانہ بشانہ کام کرنے لگے کیونکہ اب انہیں اُمید کی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔ 4,3 اپریل 1965ء کو جب سیالکوٹ میں پارٹی کا تاسیسی اجلاس ہوا تو اس کی مجلس استقبالیہ کا صدر میر عبدالمنان کو بنایا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی انہوں نے ہی انجام دیئے۔ عہدیداروں کے چناؤ کے وقت میر عبدالمنان نے غیر مشروط طور پر جماعت کے ساتھ کام کرتے رہنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ 1969ء میں انہیں محاذ رائے شماری کا مرکزی سیکرٹری جنرل منتخب کرلیا گیا۔ 30 جنوری 1971 کو جب اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے بھارت کا فوکر طیارہ ''**گنگا**'' اغوا کیا تو اس کی پاداش میں جب بدنام زمانہ یحیٰی خان اور اس کے حواریوں نے کشمیری حریت پسندوں کو کچلنے کا منصوبہ بنایا تو محاذ کے سیکڑوں کارکنوں کے ہمراہ اواخر اپریل 1971ء میں میر عبدالمنان کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور انہیں کراچی سے لاہور کے شاہی قلعے میں پہنچادیا گیا جہاں ان پر بے پناہ تشدد ہوا۔

گنگا ہائی جیکنگ کیس کے دوران اس عظیم حریت کشمیری راہنما نے عدالت العالیہ کے

بھائی میر عبدالقیوم کے ہمراہ مسلم نیشنل گارڈ کے پلیٹ فارم سے مسلمانان جموں کو منظم کیا اور اُنہیں راشٹریہ سیوک سنگھ کے انتہا پسند حملہ آوروں سے بچالیا۔

1947ء میں جموں میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو میر عبدالمنان نے بہت سے مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ وہ 10، نومبر 1947ء کو ایک قافلے کے ہمراہ سوچیت گڑھ بارڈر پر پہنچے اور پہرے داروں سے نظریں بچا کر بارڈر کراس کر آئے۔

سیالکوٹ پہنچ کر میر عبدالمنان نے ایک دوست خان محمد رفیق خان کے ساتھ مل کر مہاجرین کی آباد کاری کیلئے سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایم احمد سے ملاقات کی اور مہاجرین کے لئے کچھ رعائتیں حاصل کیں، اُنہوں نے جموں سے بچ کر آنے والی چند چیدہ چیدہ شخصیات کو جمع کر کے ''انجمن مہاجرین جموں کشمیر'' کا قیام عمل میں لایا۔ اس تنظیم میں انہیں سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ جبکہ ان کے بھائی میر عبدالقیوم کو سیکرٹری مالیات بنایا۔ اس انجمن کی کوششوں سے جموں کے مہاجرین انتہائی قلیل عرصے کے لئے مہاجر کیمپوں میں رہ کر نئے الاٹ ہونے والے گھروں میں منتقل ہو گئے۔

میر عبدالمنان اور خان محمد رفیق خان نے راجہ غضنفر علی خان مرکزی وزیر مہاجرین سے ملاقات کر کے مہاجرین جموں کشمیر کے لئے ''فری راشننگ سکیم'' جاری کروائی جس کے بعد مہاجرین کے گھروں میں فری راشن ملنے لگا۔ مسلم کانفرنس کے کارکنوں نے اپنے لیڈروں کے ایماء پر مہاجرین کے لئے ملنے والی مراعات میں جب خرد بُرد اور لوٹ مار شروع کی تو میر عبدالمنان سخت مایوس ہو گئے۔ اُنہوں نے مسلم کانفرنس کے قائدین کو اس صورت حال سے باخبر کیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تو میر عبدالمنان نے سیاست سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنہوں نے اصلاح احوال کے لئے ایک روزنامہ ''آزاد کشمیر'' جاری کیا لیکن یہ اخبار بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ میر عبدالمنان نے سیاست سے مکمل علیحدگی اختیار کرتے ہوئے کوہِ نور ٹیکسٹائل مل میں ملازمت اختیار کر لی۔ جون 1962ء میں وہ یہ ملازمت چھوڑ کر کراچی چلے گئے جہاں ان کے بڑے بھائی میر عبدالقیوم ''کریسنٹ پبلسٹی سروس'' قائم کیے ہوئے تھے۔ میر عبدالمنان بھی بھائی کے ادارے میں کام کرنے لگے۔

میر عبدالمنان کا یہ عدالتی بیان ''حدیثِ وفا'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کا پیش لفظ لکھنے والے نے میر عبدالمنان کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

''قارئینِ کرام! حکومت کشمیری مجاہدین سے قدم قدم پر دھوکہ اور فریب کرتی رہی ہے۔ وقت آئے گا کہ یہ سارے راز طشت از بام ہو جائیں گے۔ اس وقت یہ مقدمہ اس ملک کی ایک خصوصی عدالت کے سامنے زیرِ سماعت ہے۔ ملزم میر عبدالمنان نے اس مقدمے میں اپنے تحریری بیان میں اپنی ساری زندگی کی قلمی تصویر پیش کی ہے۔ بظاہر یہ محض ایک عدالتی بیان ہے جسے ایک حریت پسند ''ملزم'' نے اپنی صفائی میں پیش کیا ہے لیکن درحقیقت یہ کشمیر کی جدوجہدِ آزادی کی ایک اہم دستاویز ہے۔ اس بیان کا ''ملزم'' اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو پاکستان کی سابق نوکر شاہی کی گہری سازش کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ یہ سازش طویل عرصے پر محیط ہے اور اس نے نہ صرف ''ملزم'' کی محکوم قوم کی منزلِ آزادی کو دور سے دور تر کر دیا بلکہ جادۂ حریت پر گامزن راہروؤں کے راستے میں ناقابلِ عبور مشکلات کھڑی کر کے انہیں ترکِ سفر پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر کیوں نہ اس سازش اور اس کے پیچھے کارفرما محرکات کی شدت سے مذمت کی جائے۔ یہ فریضہ بھی اسی ''ملزم'' نے نہایت صفائی کے ساتھ اور رندانہ وار انجام دیا ہے۔ اس نے سچ ہی تو کہا ہے کہ نوکر شاہی میں ''چھپے ہوئے بھارتی ایجنٹ'' میری قوم کی آزادی کے اصل دشمن ہیں اور پھر اس نے بھارتی ایجنٹوں کی واضح الفاظ میں نشاندہی بھی کی ہے۔

یہ ''ملزم'' کچھ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس نے ایسے خاندان میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی جو آزادیٔ وطن کی تحریک کا گہوارہ ہے۔ جس کے فرزندوں نے نسل در نسل جنگِ آزادی میں بے مثال قربانیاں پیش کیں۔ جنہوں نے انجام سے بے پرواہ ہو کر ''حاکمانِ وقت'' کو للکارا اور مردہ

سامنے اپنا بیان ریکارڈ کرواتے ہوئے اپنے سیاسی مؤقف اور کردار کی وضاحت یوں کی تھی:

''میں نصف کروڑ کشمیریوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہوں اور اس جدوجہد کی راہ میں جو مصائب پیش آتے رہے ہیں۔ اس کی جزا اور محنت کی مزدوری صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرتا ہوں۔ میں نے کشمیری عوام پر احسان کرنے کی نیت سے اس پُر خار وادی میں قدم نہیں رکھا تھا۔ میری محاذ رائے شماری میں شمولیت اس ملک گیر تنظیم پر کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ محاذ رائے شماری کا احسان ہے کہ اس نے حدِ متارکہ جنگ کے دونوں طرف بسنے والے کشمیریوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اور آج وہ مل کر بھارتی استبداد کے خلاف سینہ سپر ہو چکے ہیں۔ ہم جنگ آزادی کے سپاہی ہیں اور مفاد پرست طبقوں نے جو ہمارے خلاف شکوک و شبہات پیدا کر کے ریاستی تنظیم کو عوام کی نظروں میں گرانے کی ناپاک سازش کی ہے۔ اس سازش کی تہ میں صرف یہی ایک جذبہ محرک ہے کہ پاکستان کے کروڑوں عوام کی حمایت سے کشمیریوں کی مسلح جدوجہد کرنے والی تنظیم کو محروم کر دیا جائے او معاہدہ تاشقند کی بے حس و حرکت نعش کے اندر از سر نو جان ڈال دی جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ شبہات کے گہرے پردے ایک دن ضرور ہٹ جائیں گے اور دنیا پر اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ میرے تایا زاد بھائی میر محمد نذیر جناب شیرِ کشمیر کے ساتھ کشمیر سازش کیس میں سالہا سال تک اس الزام میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے کہ وہ پاکستانی ایجنٹ ہیں اور آج ہمارے خلاف یہ تہمت لگائی گئی کہ ہم بھارت کی شہ پر مسلح جدوجہد کر رہے ہیں۔ جب کہ دنیا پر واضح ہے کہ ہماری گوریلا سرگرمیوں کا دائرہ کار بھارتی مقبوضہ کشمیر تک محدود ہے۔'' (حدیثِ وفا، صفحہ 14، 15)۔

پیش آتے رہے ہیں ان کی جزا اور اپنی محنت کی مزدوری صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرتا ہوں۔'' ان الفاظ میں یقیناً کوئی تعلّی یا رنگ آمیزی نہیں۔ ان سے کسی پیشہ ور لیڈر کا غرور یا خودستائی کا کوئی پہلو ظاہر نہیں ہوتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے جو ان سادہ الفاظ سے عیاں ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس شخص نے جہدِ مسلسل کو اپنی زندگی کا لازمہ قرار دیا ہے اور اسی لئے ایک اور مقام پر وہ کہتا ہے کہ ''ہم جنگِ آزادی کے سپاہی ہیں۔''

جنگِ آزادی کا یہ سپاہی اور جہدِ مسلسل کا داعی میر عبدالمنان ہے۔ وہی میر عبدالمنان جسے سرزمینِ جموں کشمیر نے اپنی تاریخ کے ایک اہم اور نازک دور میں جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ ایسے دور میں جب کہ سرزمیں پر غلامی کے گھٹاٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ ظلم واستبداد کا دور دورہ تھا اور دور دور تک روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پھر میر منان نے آزادی کی مشعل کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور وطن کے گوشے گوشے میں آزادی کا نور پھیلانے کے مقدس کام میں محو ہو گیا۔ اسے جن حوادث سے واسطہ پڑا اُن کا اجمالی ذکر اس بیان میں ملے گا۔ اُنہی میں سے ایک حادثہ وہ ہے جس نے میر منان کو ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔

میر منان کے اس بیان میں ان کا جذبہ حُب الوطنی جگہ جگہ عیاں ہے۔ گو انہوں نے غایت درجہ کسرِ نفسی سے کام لیا ہے تاہم وہ لوگ جو اس مجسمہء ایثار وقربانی کو قریب سے جانتے ہیں ان کے لئے بھی اس میں کوئی کم سوغات نہیں۔ اس حق گو اور بے باک کا یہ بیان ایک پکار ہے اُس کی پا افتادہ قوم کے لئے ایک للکار ہے، کشمیری عوام کی آزادی کے دشمنوں کے لئے۔ ایک چیلنج ہے حق وانصاف اور انسانیت وشرافت کے مدعیوں کے لئے۔ ان کے اندازِ بیان میں سادگی بھی ہے اور بے باکی بھی۔ اس کا ادبی مقام خواہ کچھ

جسموں میں زندگی کی حرارت پیدا کر دی۔ جن کی حریت پسندی علامت کا روپ دھار چکی ہے۔ ایک ایسی علامت جو لازوال بھی ہے اور قابلِ رشک بھی، اس خاندانی پسِ منظر میں یہ ''ملزم'' اپنے لئے ایک پُر خار راستہ متعین کرتا ہے اور اس دور میں نظریہء پاکستان کا حامی اور تحریکِ پاکستان کا نقیب بن جاتا ہے۔ جب اس راہ پر چل نکلنا دار و رسن کی آزمائشوں کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ پھر یہ شخص مردانہ وار اس تحریک کو اپنے خونِ جگر سے سینچتا ہے اور اپنے شہر میں آزادی دشمن قوتوں کے خلاف ایک عظیم الشان تحریکِ مدافعت کو ترتیب دیتا ہے۔ اس تحریکِ مدافعت میں اس کا کردار ایک راہنما بلکہ ایک ہیرو کا سا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ عزم کرتا ہے کہ جس محکوم سرزمین نے اس کو جنم دیا ہے اس کی آزادی اور سربلندی ہی اس کا اصل نصب العین اور مقصدِ زندگی ہونا چاہئے۔ پھر وہ اپنی زندگی جدوجہد کے اسے راستے پر ڈالتا ہے۔ جدوجہد کی یہ کہانی برسوں کی طویل داستان ہے۔ اس میں بڑے پیچ و خم آتے ہیں۔ اس دوران کتنی ہی تصویریں ابھرتی اور مٹتی ہیں۔ گوناگوں حوادث اور واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سفر ہے جس نے خوشگوار اور ناگوار دونوں قسم کے لمحات آتے ہیں۔ اس میں تلخیاں بھی ہیں اور محرومیاں بھی، خوش فہمیاں بھی ہیں اور دلبرداشتگی بھی۔ البتہ ایک مستقل اور انمٹ قدر اس پورے سفر کو اس کی ناکامیوں اور تلخیوں کے باوجود خوشگوار بناتی ہے اور یہی قدر اس ''ملزم'' کا اصل سرمایہ زندگی ہے اور شاید اس کے باعث اس مردِ مجاہد کو عقیدت و احترام کا وہ مقام مل گیا ہے جو اس کے کئی ہمسفر حاصل کرتے کرتے رہ گئے۔ یہ ابدی قدر کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ''ملزم'' خود ہی نہایت سادہ الفاظ میں دے رہا ہے۔ ''میں نصف کروڑ کشمیریوں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہوں اور اس جدوجہد کی راہ میں جو مصائب

عدالتی بیان

(حدیثِ وفا)

بھارتی جہاز ''گنگا'' کا اغوا:

این ۔ ایل ۔ ایف نے اپنے محدود ذرائع کو روبہ عمل لاتے ہوئے مقبوضہ کشمیر میں 9، دسمبر 1969ء اور 9، دسمبر 1970ء کے درمیان متعدد کامیاب اپریشن کر کے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ''نئی بیداری'' کو طاقت بخشی ۔ 30، جنوری 1971ء کو وقوع پذیر ہونے والا ''گنگا'' جہاز کا اغوا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس کا مقصد ''مقبوضہ کشمیر'' کے اندر ایک محبّ وطن اور حریت پرست تحریک کے وجود کا دنیا کو احساس دلانا تھا۔ کیونکہ بھارت دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ کشمیر میں کسی قسم کی ''بھارت دشمن'' اور محبِ وطن تحریک کا کوئی وجود نہیں ہے اور کشمیری اپنی قسمت بھارت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر چکے ہیں ۔ ایک طرف بھارت کی ہوشمند بیوروکریسی انتہائی چالاکی کے ساتھ دنیا کو یہ غلط تاثر دے رہی ہے۔ مگر دوسری طرف پاکستان کی نالائق یا بددیانت اور بھارتی ایجنٹ بیوروکریسی اپنی کشمیر دشمن کارروائیوں سے دانستہ یا نادانستہ طور پر مقبوضہ ریاست پر بھارت کی گرفت مضبوط کر رہی ہے۔ ان کا آخری وار ''گنگا'' اغوا کیس کے سلسلہ میں ''این، ایل، ایف اور محاذ رائے شماری'' کے محبّ وطن اور حریت پسند کارکنوں اور عہدیداروں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں اور پاکستان اور آزاد کشمیر کے عقوبت خانوں میں ان کی تعذیب ہے۔ حالانکہ پاکستان کے سراغرسانی کے جملہ محکموں کو اس امر کا پوری طرح علم اور یقین حاصل تھا کہ محاذ رائے شماری اور این ایل ایف کے عہدیدار اور کارکن بھارت کے بدترین دشمن اور اپنے وطن کے استخلاص کے بارے میں انتہا پسند

بھی ہو مگر اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس میں حقائق کو الفاظ کی پُر کاری کا سہارا لئے بغیر پوری دیانت داری اور صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی معصوم سعی کی گئی ہے۔ اور ہماری آنے والی نسلوں کے لئے راہِ عمل کی نشاندہی۔"

(حدیثِ وفا، صفحہ 12)

راہِ آزادی کے اس بے لوث مسافر پر کیا کیا قیامتیں ڈھائی گئیں اس کے روئیداد اُنہی کی زبانی ان کے عدالتی بیان کے ذیل میں دیئے گئے اقتباس میں ملاحظہ فرمائیں۔

خطۂ گُل پوش تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ ہم
تیرے دامن سے مٹائیں گے غلامی کے نشاں
تجھ کو آزادی کی نعمت سے کریں گے سرفراز
تُو ہمارا پاسباں ہے، ہم ہیں تیرے پاسباں

(ڈاکٹر زاہدہ قاسم)

سلسلہ میں ایک گھناؤنا کردار ادا کیا اور محض پاکستان کی اندرونی پارٹی پالیٹکس کے پیش نظر مقدمہ کی سماعت کے دوران بھی تصویر کا صرف ایک رخ جو کہ استغاثہ کی من گھڑت کہانی اور سکھائے ہوئے فرضی گواہوں پر مبنی تھا، پیش کر کے صحافتی بددیانتی کا بدترین ثبوت پیش کیا اور بیانات کا وہ حصہ جو بے گناہ ملزمان کے حق میں ہوتا تھا اس کو عمداً تشہیر سے حذف کیا۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صورتِ حال بہت حد تک بدل گئی ہے۔ گواہانِ صفائی جو اعلیٰ سوشل مقام کے حامل پڑھے لکھے اور صاحب حیثیت لوگ ہیں، نے یکے بعد دیگرے سامنے آکر استغاثہ کی من گھڑت اور انسانیت دشمن کہانی پر یکے بعد دیگرے کاری ضربیں لگائی ہیں اور اس کا تاروپود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ جس کی حیثیت پہلے بھی کچھ نہیں تھی اور استغاثہ ملزمان کے خلاف کوئی بھی الزام ثابت کرنے میں یکسر ناکام رہا تھا۔

گواہانِ استغاثہ میں بیشتر لوگوں کے بیانات دفعہ 164 کے تحت قلم بند کئے گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ سات ملزمان میں سے ایک کو سلطانی گواہ Approver بنایا گیا اور چار سے زیر دفعہ 164 اقبالی بیان قلم بند کئے گئے۔ باقی ماندہ دو ملزمان میں سے مسٹر جی ایم لون اور مجھے صرف اس لیے چھوڑ دیا گیا کیونکہ شدید تعذیب کے باوجود مسٹر جی ایم لون نے جھوٹا بیان دینے سے انکار کر دیا اور ملٹری افسران کی ان پر تعیناتی کی وجہ سے بھی انہیں مدد ملی اور میں ابتدائی چند دنوں یعنی 18 جون تا اواخر جون 1971ء شاہی قلعہ لاہور میں روا رکھے جانے والے اس خوفناک عذاب کا مقابلہ نہ کر سکنے کے باعث دم توڑ کر بیمار ہو گیا۔ میرے جسم پر لگائے گئے زخم خراب ہو گئے اور میں کم و بیش اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھا اور اس طرح انسانیت سوز مظالم سے تو نہ بچ سکا۔ مگر دفعہ 164 کے تحت جھوٹے بیان کی ذلت سے ضرور بچ گیا۔ مظالم کی روح فرسا داستان بیان کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ اس کے لیے میرے ساتھیوں کے بیانات پر اکتفا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مزید تحقیقات کے لیے سروسز ہاسپٹل کے ریکارڈ سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔ اگر انہوں نے اس کا کوئی ریکارڈ تیار کیا ہو۔ جہاں جون کے آخری ہفتہ میں غالباً 22، 23 یا 24، جون 1971ء کو رات کے وقت جب سن سٹروک کی وجہ سے میری حالت خراب ہو گئی تو چوہدری تاج لائنز آفیسر قلعہ شاہی لاہور پولیس وین میں ڈال کر مجھے اپنے دو اور ساتھیوں کے ساتھ لے گیا۔ میں نے ڈیوٹی پر موجود ایک Plump ٹائپ کی لیڈی ڈاکٹر کو

واقع ہوئے ہیں اور اس بارے میں کسی کے ساتھ بھی کسی قسم کا سمجھوتہ یا Compromise کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ ستمبر 1966 میں این۔ ایل۔ ایف کا راز کھل جانے کے بعد نہ صرف اس تنظیم سے متعلق سبھی کارکنوں کی انٹیروگیشن کر کے مطمئن ہو چکے تھے بلکہ میجر امان اللہ اور محمد مقبول بٹ کی یکے بعد دیگرے اکتوبر 1966ء اور دسمبر 1968ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر سے واپسی کے بعد پورے حالات سے واقف تھے۔ اور نہ صرف یہ کہ اُن کے دلوں میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہا تھا۔ بلکہ محاذ اور این۔ ایل۔ ایف کے ذمہ دار عہدیداران کے ساتھ باہمی تعاون کی بات چیت بھی کر چکے تھے۔ اس سلسلہ میں کم از کم دو نام یعنی مسٹر ظفر اقبال راٹھور سابق ڈپٹی ڈائریکٹر کشمیر انٹیلی جنس اور چوہدری عبدالعزیز اے آئی جی آزاد کشمیر محلِ نظر ہیں۔ مگر اس ساری واضح صورتِ حال کے باوجود چونکہ ہمارا براہِ راست تصادم پاکستان کی ''پولیس منسٹری'' یعنی وزارتِ امورِ کشمیر و داخلہ اور خود یحییٰ خان کی آمریت سے تھا۔ اس لیے بھارتی جہاز 'گنگا'' کے اغوا کو محض ایک ''بہانہ'' بنا کر پرانے حساب چکانے کا فیصلہ کیا گیا اور طول وعرض مغربی پاکستان اور آزاد کشمیر میں واقع محاذ کے سبھی دفاتر اور دو سو سے زائد کارکنان، عہدیداران اور اراکینِ مجلسِ عاملہ کو 28,27 اپریل 1971ء کی درمیانی شب کو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈی آئی جی اطہر کی زیرِ ہدایت گرفتار کر کے پورے ملک میں خوف وہراس کی فضا پیدا کر دی گئی۔ حتیٰ کہ ہمارے اعزہ واقربا کو بلکہ حقیقی بھائیوں کو جو ہماری دیکھ بھال کے لیے آتے تھے، خوفزدہ کر کے ہمارا پیچھا کرنے سے روک دیا گیا۔ میرے تین حقیقی بھائیوں کو جن کا سیاساتِ کشمیر سے کبھی دور کا واسطہ بھی نہیں رہا تھا اور نہ ہی انہیں اس بارے میں کبھی دلچسپی رہی تھی اور نہ اب ہے انٹیروگیشن سنٹرز میں بلوا کر ڈرایا دھمکایا گیا۔ حتیٰ کہ وہ بھی خوفزدہ ہو کر الگ تھلگ ہو گئے اور ان کے چہرے بھی ہمیں رفتہ رفتہ اس وقت نظر آنے لگے جب غاصب اور غدار یحییٰ خان کی بدکردار رجیم، مُلک کو برباد کرنے کے بعد اپنے ناقابلِ رشک انجام کو پہنچ گئی۔ بلکہ بعض لوگ تو ابھی تک اپنی تمام تر ہمدردیوں اور ہمارے بارے میں نیک خیالات کے باوجود سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یحییٰ خان کی حکومت کی ہدایات کے تحت ہمارے خلاف اس قدر وسیع پیمانے پر مخالفانہ پروپیگنڈہ کر دیا گیا کہ جھوٹ سچ نظر آنے لگا۔ بیشتر اخبارات نے بھی اس

کم ''بی'' کلاس کا مستحق تھا۔ مگر مارشل لاء کی موجودگی میں انہوں نے بغیر واضح احکام کے اجراء کے ازخود یہ کارروائی کرنے سے انکار کر دیا اور مجھے ہدایت کی کہ میں اس سلسلہ میں درخواست لکھ کر دوں۔ جسمانی کمزوری اور زخمی ہاتھوں کی وجہ سے میں جب دس پندرہ روز تک درخواست لکھ کر نہ دے سکا تو انہوں نے اپنے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ عبدالمجید چوہدری کو میری بارک کے دورہ کے موقع پر ہدایت کی کہ میری درخواست ٹائپ کر دی جائے۔ چنانچہ میں نے اس روز موصوف کے دفتر میں جا کر درخواست ٹائپ کرا کے اس پر مشکل سے دستخط کیے۔ اس درخواست میں میں نے اپنی جملہ بیماریوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ سن سٹروک، ٹائیفائیڈ، پیچش، بواسیر وغیرہ تھیں۔ غالباً اس درخواست کی ایک نقل میرے جیل میں موجود کیس فائل میں بھی موجود ہونی چاہیے۔ جو طلب کی جا سکتی ہے۔ میں کراچی جیل کے ڈاکٹر سے بھی علاج کراتا رہا اور اپنے جسم کے جملہ زخم اور عام کیفیت اُن کی نظروں سے گزارے ہیں اور وہ کئی ماہ تک میرا علاج کرتے رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر دوائیاں اور ٹانک میں اپنے خرچ پر گھر سے منگواتا رہا۔ مسٹر منظور حسین پنور بعد ازاں میری داستان درد سن کر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ بڑے بڑے آنسوؤں کی آنکھوں سے نیچے ڈھلکے اور رومال سے انہوں نے اپنے چہرے اور آنکھوں کو صاف کیا۔

قلعہ لاہور کے چند انتہائی افسوناک واقعات:

18، جون 1971ء بروز جمعہ قبل دوپہر سب انسپکٹر نیازی ایک ہیڈ کانسٹیبل اور مسلح کانسٹیبلوں کی معیت میں جب میں دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے قلعہ شاہی لاہور انٹیروگیشن سینٹر میں جسے ''سب جیل'' کا مصنوعی نام دیا گیا تھا، پہنچا تو وہاں ایک گھمبیر اور ہیبت ناک فضا پائی۔ گیٹ پر متعین مسلح گارڈ نے سب انسپکٹر نیازی کو ایک کرسی فراہم کی۔ میں جب کھڑے کھڑے تھک گیا تو پاس ہی پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اندر سے آنے والی دلدوز چیخیں دل و جگر کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں کہ تھوڑی دیر بعد ایک پست قد دوہرے وجود کے آدمی کو جو مادر زاد برہنہ تھا اور اس کے چہرے پر ایک چادر بندھی ہوئی تھی، لا کر میرے سامنے سے گزرا گیا اور کچھ فاصلے پر لے جا کر اوٹ میں ایک درخت کے ساتھ الٹا لٹکا دیا گیا۔

اپنی روداد سنا دی کہ مجھ پر انتہائی ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ مجھے مادر زاد برہنہ کر کے جون کی گرم ترین اور طویل ترین دوپہر کو تپتی ہوئی زمین پر ننگے پاؤں چلایا جاتا ہے جس سے نہ صرف میرے پاؤں میں بڑے بڑے آبلے اُبھر آئے ہیں اور مجھ سے چلنا دوبھر ہو گیا ہے بلکہ ہائی ٹمپریچر کی وجہ سے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا ہے مگر ایک تو پولیس گارڈ اور افسران کی موجودگی کے باعث اور دوسرے لائنز آفیسر کے بتانے پر کہ یہ شخص بھارتی ہوائی جہاز اغوا کرنے والوں کا ساتھی ہے، ''ڈگری لیتے وقت انسانی ہمدردی کا حلف اٹھانے والی'' جوان سال مسلمان لیڈی ڈاکٹر کے انسانی ہمدردی کے سوتے گویا خشک ہو گئے اور اس نے انتہائی رُکھائی سے مجھے کہا ''تو پھر ایسا کام کیوں کیا تھا''۔ گویا سیاسی وجوہ اور وہ بھی پولیس کی زبان سے ایک لیڈی ڈاکٹر کے لیے انسانی ہمدردی سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ بالکل اس طرح جیسے مقدمے کی کارروائی کے دوران پاکستانی اخبارات بلکہ خود ٹریبونل کی ہمدردیوں سے ہم یکسر محروم رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ہم مسلسل طعن و تشنیع اور طنز و تضحیک کا نشانہ بنائے گئے ہیں۔ اور جس کے خلاف ہم نے بار بار مقدمے کے دوران اُٹھ اُٹھ کر پروٹیسٹ کیا ہے۔ اس مقدمے کے دوران جیسا کہ نام نہاد نورالعارفین کمیشن کی کارروائیوں سے قبل اور اس کے دوران افواہوں اور تحریری طور پر ہمیں بدنام کرنے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ بالکل انہی لائنز پر اب کی بار بھی سردار عبدالقیوم خان کی طرف سے تحریری اور تقریری طور پر اور اخبارات کے ذریعہ ہمیں بدنام کرنے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ جس کے خلاف ہم نے عدالت ہذا میں ''توہینِ عدالت'' کی درخواست دائر کی جس پر میری معلومات کے مطابق ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اب کی بار فرق صرف اتنا رہا کہ حکومت پاکستان نے بحیثیت مجموعی اس Villification Campaign میں بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے حصہ نہیں لیا جیسا کہ گزشتہ سال ہوا تھا۔

اواخر اگست 1971ء میں تقریباً ستر یا اس سے زائد دن تک قلعہ شاہی لاہور میں قیام کے بعد جب میں ایک لاش کی صورت میں کراچی پہنچا تو سپرنٹنڈنٹ کراچی جیل مسٹر منظور حسین پنور کو مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی اور میں انہیں انسانیت اور نیکی کا فرشتہ سمجھنے لگا۔ انہوں نے اگرچہ مجھے ''سی'' کلاس سے بہتر جگہ رکھنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ حالانکہ ایک نظر بند کی حیثیت سے میں کم از

کراچی ایک تجارتی شہر ہے مگر لاہور ابھی اتنا تجارتی شہر نہیں ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے کراچی پولیس کو رشوت دے کر اپنی گلو خلاصی کرائی ہے اور انہوں نے ہمارے اوپر تشدد نہیں کیا اور ہم سے ''نام نہاد راز'' نہیں اگلوا سکے۔ اس طرح کی طویل تمہیدی تقریر کے بعد انہوں نے مجھے سچ بیان دینے کے بارے میں کہا۔ جس کے بارے میں میں نے انہیں جواب دیا کہ میں ایک نہیں لاتعداد تحریری بیان کراچی میں پولیس کی تحویل میں گزشتہ پانچ ہفتوں کے دوران دے چکا ہوں۔ اس پر انہوں نے بڑے رعب کے ساتھ کہا کہ ان بیانات کو بھول جاؤ۔ میں نے اُنہیں کہا کہ اگر آپ کو اس میں سے کسی حصہ کی وضاحت طلب کرنی ہو تو آپ ایک سوالنامہ یا Questionnaire ترتیب دے لیں اور جو کچھ پوچھنا ہو مجھ سے پوچھ لیں۔ یہ کہنا تھا کہ وہ بجلی کے کڑکے کی طرح ایک دم جلال میں آ گئے اور مجھ پر غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مجھے سرتاپا مادرزاد برہنہ کر دیا گیا۔ میرے ہاتھوں کو کپڑے سے کلائیوں کے پاس کس کر باندھ دیا گیا اور ہاتھوں کو سر کے اوپر لے جا کر گردن اور بازوؤں کے درمیان ایک ڈانڈا گزار کر بازوؤں کو ہوا میں اوپر کی جانب معلق کر دیا گیا۔ میرے دونوں پاؤں کے درمیان ایک زنجیر ڈالنے کی بھی کوشش کی گئی جو ناکام رہی۔ اس حالت میں مجھے انٹیروگیشن سنٹر کے عقب میں واقع ''فیل خانہ'' کے صحن میں جہاں چاروں طرف سپاہیوں کے کمرے یا قیدیوں کی سنگین کوٹھڑیاں ہیں اور درمیان میں ایک درخت کے نیچے نماز کے لیے ایک تھڑا ہے، لے جا کر دھوپ سے تپتے ہوئے فرش پر جس پر خاص مقاصد کے تحت ریت بھی بچھائی گئی ہے، کوٹھڑیوں اور سیلز کے سامنے سے گردش کرنے کا حکم دیا گیا۔ تپتے ہوئے فرش پر ایک سیکنڈ کے لیے بھی قدم رکھنا مشکل تھا۔ میں تڑپنے لگا اور میرے منہ سے بے محابا چیخیں نکلنے لگیں۔ اور میں ''اللہ'' ''بلال'' اور ''حسین'' کے نام لے کر بلند آواز سے نعرے لگا کر اپنے پاؤں کے علاوہ دلی جلن کا اظہار کرنے لگا۔ کتنے عظیم تھے وہ انسان جو اپنے مقصد کی لگن کے تحت سالہا سال عرب کی تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے رہے۔ وہ ''اَحد، اَحد'' ورد کرتے رہے مگر اپنے مقصد سے نہ ہٹے۔ کتنا عظیم تھا وہ انسان جو سبطِ رسولؐ ہونے کے باوجود اپنے آہنی عزم کے تحت اپنے کنبے کے 72 افراد کے ساتھ جن میں 6 ماہ کے بچے اور عمر رسیدہ مستورات کے علاوہ بیمار بھی شامل تھے، صحرائے کربلا میں خیمہ انداز ہوا اور دنیا

آدھے پونے گھنٹے کے بعد ہماری طلبی ہوئی اور میں مسلح گارڈ کی معیت میں اس حالت میں کہ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، ایک ہاتھ میں لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں بیگ پکڑے ہوئے دفتر کے اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک تھڑے پر (جس کے بارے میں بعد ازاں معلوم ہوا کہ پنڈت نہرو پر مقدمہ کے سلسلہ میں خاص عدالت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا) بیٹھے ہوئے چند خوبصورت نوجوانوں کو دیکھا، یہ نوجوان پڑھے لکھے اور کالجوں کے طلباء معلوم ہوتے تھے۔ میں نے غیر شعوری طور پر بلند آواز میں سب کو "السلام علیکم" کہا اور سب انسپکٹر کی راہنمائی میں ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں بیٹھے ہوئے لائنز آفیسر چوہدری تاج محمد کی طبع نازک پر میرا اس طرح ملزمین کو سلام کرنا ناگوار گزرا اور اس نے مجھے کچھ بے معنی سوال کر کے اخلاقی طور پر مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں کامیاب نہ ہو کر ایک دم مجھے چند غلیظ گالیاں دے کر میری موٹے فریم والی دیکھنے کی عینک اس لیے اتروالی کیونکہ اس کے خیال سے اس عینک سے میں اس پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے پڑھنے کی عینک بھی جو میرے ہاتھ میں تھی مجھ سے چھین لی گئی۔ مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میرے ساتھ آنے والے گارڈ کے بھی ارکان نے بھی اس طرزِ عمل کا بُرا منایا اور چوہدری تاج محمد کے کمرے سے باہر نکل جانے کے بعد آپس میں اس بات پر اظہارِ خیال کیا۔ گارڈ کو فارغ کر کے میری قلعہ میں پہنچ جانے کی رسید جاری کر دی گئی اور میں شاہی قلعہ کا مہمان خاص بن گیا۔ مجھ سے دو روز پہلے غلام محمد لون اور ایک دن پہلے میرے بھائی میر عبدالقیوم بھی شاہی مہمان بن کر پہلے ہی یہاں آ چکے تھے۔ آج میری باری تھی۔ میرے منہ پر میرے بیگ سے ایک تولیہ نکال کر کس دیا گیا اور دوبارہ ہتھکڑی پہنا کر دفتر کے باہر لے جا کر ایک سنگین کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

دوسرا واقعہ:

اگلے روز مجھے انٹیروگیشن ٹیم کے انچارج سپرنٹنڈنٹ پولیس قمر العالم کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے پہلے تو مجھے کرسی پر بٹھایا اور قلعہ شاہی کی سابقہ روایات کے بارے میں لیکچر دیا کہ یہاں پر داخل ہو کر انسان دن اور رات ماہ و سال غرضیکہ آباد دنیا کی ہر چیز کو بھول جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ

کے علاوہ تیسرا شخص کوئی بھی اس کمرے میں موجود نہ تھا۔ میں بار بار مار کٹائی اور سوالات سے تنگ آچکا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ حکام محض ہمیں تنگ کرنے کے لیے یہ مار پیٹ اور سوالات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے قمر العالم سے یہ بات جو رہ رہ کر میرے دل و دماغ میں ابھر رہی تھی کہہ ڈالی۔ میں نے کہا کہ اگر حکومت محاذ رائے شماری اور این۔ ایل۔ ایف کی کارروائیوں کا جاری رہنا پسند نہیں کرتی تو آپ ہمارے سب عہدیداران اور دوسرے کارکنان کو اکٹھا ہونے کا موقع دیں تا کہ ہم یہ فیصلہ کرسکیں کہ آیا ہمیں آزاد کشمیر اور پاکستان میں اپنی کارروائیوں کو جاری رکھنا چاہیے یا نہیں۔ کیونکہ میں اس پوزیشن کو پسند نہیں کرتا کہ حکومت پاکستان پر بھی ''کشمیر دشمنی'' کا اس طرح الزام عائد ہو جس طرح بھارت پر واقعتاً عائد ہوتا ہے کیونکہ گزشتہ جنوری میں حکومت ہند نے محاذ رائے شماری کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اور اب آپ محاذ رائے شماری کے عہدیداران اور اراکین عاملہ کو گرفتار کر کے یہ سلوک کر رہے ہیں۔ ہم اپنی کارروائیاں ختم کرنا پسند کریں گے۔ بہ نسبت اس کے کہ حکومت پاکستان پر اس حد تک گر جانے کا الزام عائد ہو کہ وہ بھارتی حکومت کے لیول (Level) پر آگئی ہے۔ اس میں آپ اور ہم سب کا فائدہ ہے۔

یہ بات سن کر قمر العالم صاحب ایک دم بولے ''دو لاکھ روپے دیتے ہو؟ میں اس غیر متوقع جواب سے ایک دم بوکھلا گیا اور میری سمجھ میں یہ بات نہ آ رہی تھی کہ یہ دو لاکھ روپے والی بات کا جواز کیسے پیدا ہو گیا ہے؟ میں نے اپنی آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال کر اس امر کا جائزہ لینا چاہا کہ اُس کی اس بے محل بات کا کیا مطلب ہے اور یہ کہ آیا وہ مجھ سے کوئی سودا بازی کرنا چاہتا ہے۔ مگر بہر حال میں نے جواباً عرض کی کہ آپ دو لاکھ روپے کہتے ہیں۔ میرے بنک میں تو شائد دو ہزار روپے بھی مشکل سے ملیں گے۔ یہ بات ہو رہی تھی اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ اتنے میں ساتھ والے کمرے سے ایک آفیسر (جو غالباً انسپکٹر درّانی تھا) نکلا اور اس خیال کے تحت کہ شاید اس نے ہماری اس گفتگو کو سن نہ لیا ہو۔ قمر العالم نے بلند آواز سے اسے مخاطب کیا اور کہا سن رہے ہو یہ کہتا ہے کہ دو لاکھ روپے لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ میں نے جواباً کہا کہ میں نے یہ بات ہرگز نہیں کہی ہے۔ اس پر دونوں نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کیا۔ میری کنپٹیوں پر مکوں کی بارش کر دی گئی اور کبھی گرا کر اور کبھی

کی عزیز ترین متاع اپنے اصولوں کی پرورش کے لیے قربان کر دی اور کتنا کمزور تھا میں چند سیکنڈ کی عقوبت کے بعد ہمت ہار گیا۔ میں سائے کی تلاش میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح بھاگ رہا تھا۔ گندے پانی کی نالیوں کے پاس خنکی کی تلاش میں بھاگ رہا تھا۔ مگر میرے اوپر متعین دو درجن بھاری بھرکم وجود والے جلاد نما بھدے جسموں والے سپاہی ہاتھوں میں ڈنڈے لیے ان کی نوکوں سے مجھے تپتے ہوئے میدان میں دھکیل رہے تھے۔ میری تعذیب کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے قمر العالم سائے میں کھڑا تھا اور میں برہنگی کے عالم میں جبکہ میرے ہاتھ آسمان کی طرف ڈنڈے کی مدد سے ایستادہ تھے۔ اور گلے میں جوتوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ بھاگ کر اس کی جانب جانا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اس عذاب سے نجات دلائے مگر جلاد اس کی جانب کا رخ نہیں کرنے دیتے تھے۔ بالآخر اس نے بلند آواز سے مجھے سائے میں اپنی جانب آنے کی اجازت دے دی۔ اور سچ سچ سب کچھ بتا دینے کی ہدایت کی۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سامنے سابقہ الفاظ دہرائے اور کہا کہ میں نے اس سے قبل جو جو بیانات دیئے، سب کے سب حرف بحرف سچے ہیں۔ اس پر میرے اوپر مکوں اور جوتوں کی بارش کر دی گئی۔ پھر مجھے اسی حالت میں میرے بڑے بھائی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ میری اس حالت کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور اُنہوں نے کوئی بات قمر العالم کو کہی جو میں سُن نہ سکا۔ اور جس کے جواب میں قمر العالم نے اُس پر مکّوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔

اس کے بعد مجھے ایک بار پھر دفتر میں لے جایا گیا اور میرے جذبات کو انگیخت کرنے کے لیے قمر العالم نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک کشمیری لڑکی سے اپنے ''زنا'' کا حقیقی یا فرضی قصہ اپنے سامنے بیٹھے محمد خان کانسٹیبل کو مزے لے لے کر سنایا اور اس کے خاتمے پر مجھ سے سوال کیا کہ کیا ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس پر میں نے اسے جواباً کہا میں نے زندگی بھر کبھی زنا نہیں کیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے مزید تہذیب سے گرے ہوئے سوال کیے اور دھمکی دی کہ میرے اوپر سکھ چھوڑ کر خلاف فطرت فعل کیا جائے گا۔ یہ سن کر میں کانپ گیا اور اللہ تعالیٰ سے مدد کا طلبگار رہا۔

تیسرا واقعہ:

• قمر العالم ایک روز مجھے ایک علیحدہ کمرے میں انٹیروگیٹ کر رہا تھا۔ اتفاقاً اس وقت ہم دو

اٹھا کر مجھے ڈنڈوں سے پیٹا گیا۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں حکومتِ پاکستان کے بعض بڑے اہم اور ذمہ دار عہدوں پر فائز لوگ ایسے حالات سے بھی فائدہ اٹھانے سے اور مالی منفعت حاصل کرنے کا خیال دل میں لانے سے نہیں چوکتے جہاں کہ ملک کی سالمیت بھی معرضِ خطر میں پڑ چکی ہو۔ میرے اوپر ایک انتہائی گھناؤنا الزام تھا۔ اس کے دو ہی پہلو ہو سکتے تھے ایک یہ کہ میری بے گناہی کا متعلقہ افسر کو یقین تھا یا نہیں تھا۔ ایسی حالت میں اس کی جانب سے دو لاکھ روپے کا مطالبہ چہ معنی دارد؟

اس موضوع پر بہتر ہوا گر حکومت پاکستان تحقیقات کرے مگر یہ تحقیقات کرے گا کون؟ اس حمام میں تو سبھی مادرزاد ننگے ہیں۔ الا ماشاءاللہ۔

محاذِ رائے شماری کی بحیثیت جماعت اور اس سے متعلقہ اراکین کی انفرادی حیثیت میں جماعت بننے سے قبل اور بعد میں اتحاد کی کوششیں۔

آل پارٹیز کشمیر کمیٹی کراچی:

ا۔ دسمبر 1963 میں درگاہ حضرت بل سے موئے مبارک کی گمشدگی کے موقع پر اب محاذِ رائے شماری سے وابستہ ان تمام افراد نے جو کراچی میں مقیم ہیں، ایک آل پارٹیز کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اور کشمیری سیاسی کارکنوں کے لیے جو تمام سیاسی مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کیا۔ جس کے تحت انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسلسل 21 روز تک خاموش مظاہرے کئے۔ بلکہ کراچی میں دفعہ 144 کے نفاذ کے بعد بھی چار چار افراد کی ٹولیوں میں یو۔ این۔ او کے انفارمیشن سنٹر امریکن چانسری بلڈنگ اور روس کے سفارت خانہ کے باہر مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا۔

۲۔ ستمبر 1965 کی جنگ کے موقع پر اس مشترکہ پلیٹ فارم کے تحت جنگی مساعی کو جاری رکھا گیا۔ مہاجرین کے لیے کئی ویگن بھر کر پارچات اور جنگ میں شمولیت کے لیے مجاہد روانہ کئے گئے۔ سیز فائر کے موقع پر ایک اتنا بڑا جلوس کراچی شہر سے نکالا گیا کہ جس کی مثال کراچی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کراچی کا کوئی محلہ اور کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں سے جلوس نہ نکلا ہو۔

کر دیا۔ آزاد کشمیر کے صدر خان عبدالحمید خان اس وقت کراچی میں سرکاری مہمان خانے میں مقیم تھے اور محاذ رائے شماری کے مقامی کارکن اور عہدیداران ان سے ملاقات کر رہے تھے کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلیفون اٹھانے والے نے میرا نام پکار کر کہا کہ میرے لیے ٹیلیفون ہے۔ چنانچہ میں نے ٹیلیفون لیا۔ میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب ٹیلیفون کرنے والے نے مجھے بتایا کہ آج پچھلے پہر بھارتی افواج نے واہگہ کی سرحد پر حملہ کر دیا ہے اور چند لمحے پہلے ماڈل ٹاؤن پر Straffing کی گئی ہے میں نے فوراً ہی یہ خبر (فون کو ہولڈ کر کے) صدر آزاد کشمیر کو سنائی۔ مگر انہیں یقین نہ آیا اور انہوں نے خود فون پر بات کر کے اپنی تسلی کی۔ انہوں نے اپنے طور پر بھی کسی کو ٹیلیفون کر کے اس امر کی تصدیق کرائی۔

اب ہماری گفتگو کا سابقہ موضوع بدل کر جنگ پر مرکوز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہم نے ان سے اپنے لیے کارکردگی کا میدان متعین کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے ہمیں مجاہدین بھرتی کر کے ان کی ترسیل اور روزمرہ کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے کہا اور پھر اس سلسلہ میں عملی کارروائی شروع کرنے کے لیے ان سے جلدی جلدی اجازت چاہی۔ دفتر پہنچ کر میں نے اپنی جماعت کے عہدیداران اور کارکنوں کو ٹیلیفون کر کے تمام کشمیری جماعتوں کے نمائندوں کو اطلاع دے کر فوراً یکجا ہونے کی دعوت دی۔ تھوڑی دیر بعد تمام نمائندے پہنچ گئے اور باہمی مشورہ کے بعد طے کیا گیا کہ گزشتہ دو سال کی طرح اس قومی ایمرجنسی کے موقع پر بھی تمام جماعتوں کو متحد رہ کر آل پارٹیز کشمیر کمیٹی کی زیر سر کردگی اپنی جدوجہد کا آغاز کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے اخبارات کے ذریعے آل پارٹیز کشمیر کمیٹی کے زیر انتظام متعدد مراکز قائم کیے۔ جن میں رضائیاں گدے، کھانے پینے کا سامان، چادریں، بستر، کوٹ، جرسیاں اور دیگر تحائف اکٹھا کرنے شروع کیے۔ یہ مراکز غیر کشمیری حضرات کے یہاں بھی (جنہوں نے ایسا کرنے کی حامی بھری) قائم کیے گئے۔ ان میں ایک مرکز اہلِ میسور، (بھارت) کی کالونی بنگلور ٹاؤن میں ایک صاحب کے یہاں قائم کیا گیا۔ جن کا نام میں اس وقت بھول رہا ہوں۔ مگر ان کا مکان بنگلور ٹاؤن کی مسجد کے عین بالمقابل واقع ہے۔ جب ان کے ہاں خاصہ سامان جمع ہو گیا تو انہوں نے اس خواہش کا مجھ سے اظہار کیا کہ میں ان تحائف کی ترسیل

احترام کرتی ہو۔ چنانچہ راقم نے سیالکوٹ سے راولپنڈی، مظفرآباد، میرپور، جہلم وغیرہ کا دورہ کر کے مسٹر اے آر ساغر، شیخ عبدالحئی، محمد اکرم ایڈووکیٹ، ڈاکٹر مظفر حسین، پیر علی جان شاہ، شیخ محمد سلیم ریٹائرڈ آئی جی آزاد کشمیر اور متعدد دوسرے بزرگان سے مشورہ کیا اور سب کو اس مقصد کے لیے آمادہ اور خدمتِ اتحادِ قوم کے لیے تیار پایا۔

مگر بائیکاٹ کی مہم میں مصروفیت کے باعث اور اس وجہ سے بھی کہ ہمارے بیشتر بزرگ گوشہ نشین ہو چکے ہیں اور ان کو مختلف علاقوں سے یکجا کرنا بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے، اس کو عملی صورت نہ دی جا سکی۔ اگر راقم کو مزید وقت مل جاتا تو جس قدر بنیادی کام اس سلسلے میں کیا جا چکا تھا اس کا یقیناً کوئی اچھا نتیجہ نکلتا۔

1965ء کی گوریلا جنگ اور محاذ رائے شماری:

اپریل 1965ء میں محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کے قیام کے فوراً بعد یا کم و بیش اس زمانے میں ہندو پاکستان کی حکومتوں کے درمیان سیز فائر لائن کے دونوں طرف کشیدگی دن بدن بڑھ رہی تھی، اور دونوں ملکوں کی فوجوں کے درمیان جھڑپیں روزمرہ کا معمول بن گئی تھیں۔ وسط اگست 1965ء تک حالات انتہائی سنگین صورت اختیار کر گئے اور حکومتِ پاکستان نے ایک (Revolutionary Council) یعنی انقلابی کونسل کا اعلان کرایا۔ جس میں متعدد کشمیری لیڈروں جن میں چوہدری غلام عباس خان مرحوم اور میر واعظ کشمیر مولوی محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم کے علاوہ آزاد کشمیر کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے سربراہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ محاذ رائے شماری کے سربراہ کی حیثیت سے جناب عبدالخالق انصاری صاحب کو بھی اس کونسل کا رکن نامزد کیا گیا اور ڈیفنس سیکرٹری آزاد کشمیر کی جانب سے باقی مدعوئین کے علاوہ انہیں بھی مظفرآباد مشوروں کے لیے بلایا گیا۔

اس طرح اپنے قیام کے فوراً بعد ہی حکومتِ آزاد کشمیر اور محاذ کے درمیان باہمی امداد و تعاون کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مقبوضہ کشمیر میں گوریلا فورسز کے ہمراہ گائیڈز کی ترسیل اور مجاہدین کی بھرتی کے سلسلہ میں محاذ کی مرکزی جماعت اور حکومت کے درمیان مکمل ہم آہنگی رہی۔

6, ستمبر 1965ء کی صبح کو یعنی جس روز بھارت نے لاہور کی سرحد واہگہ پر اچانک حملہ

سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُس کا اپنا وطن ریاست جموں کشمیر ابھی تک پنجۂ اغیار میں پھنسا ہوا ہے۔

میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ پاکستانی سیاست میں اعلیٰ اقدار کا یکسر فقدان ہے۔ اور سیاست کو عبادت سمجھنے والے لوگوں کا اس ملک میں نہ صرف کوئی وجود نہیں بلکہ ان خطوط پر سوچنے والوں (میری اور میرے عظیم المرتبت ساتھیوں کی طرح) کو قابلِ گردن زدنی قرار دے کر ان کے قیام کے لیے مناسب جگہ وہی خیال کی جاتی ہے جہاں ہم اس وقت قیام پذیر ہیں۔ یعنی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری، شاہی قلعہ لاہور کا تاریک ''مہمان خانہ'' یا پھر پاگل خانہ۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے اس ملک اور اس کو جنم دینے والے نظریے اور اس کے مبلغوں کو اچھوت قرار دے کر ملک کی بربادی پر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی۔ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی ہیں مگر زبان اس مسئلہ پر گنگ ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس دور میں ''چرب زبانی'' اور ''کرسی'' کو سب سے بڑی خوبیاں اور راہنمائی کا سرچشمہ تصور کر لیا گیا ہے۔ اس جذبہ نے اس ملک اور اس کو جنم دینے والے نظریہ کی بنیادیں کھود کر رکھ دی ہیں۔

خود مختار کشمیر کا تصور:

جنگِ عظیم ثانی کے خاتمہ پر جب انگریز نے متحدہ ہندوستان سے اپنا بوریا بستر لپیٹنے کا ارادہ کیا اور کانگریس اور مسلم لیگ سے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ (سر اسٹیفورڈ) کرپس مشن کے بعد وزارتی مشن (جس کے سربراہ وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس تھے) یکے بعد دیگرے ہندوستان آئے اور اس امر کی واضح طور پر نشاندہی ہو گئی کہ برصغیر جلد ہی آزاد ہونے والا ہے۔ چنانچہ جملہ بڑی سیاسی جماعتوں کے علاوہ چیمبر آف پرنسز (جس کے سربراہ ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ تھے) بھی حرکت میں آ گیا اور انہوں نے اپنے لیے پالیسیاں مرتب کرنا شروع کر دیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اغلباً ''آزاد خود مختار'' رہنے کا نظریہ قائم کیا۔ اس سے قبل ریاستی تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ ایک

سے قبل رسماً وصولی کے لیے مسٹر آصف مجید (جو اس وقت ڈی آئی جی کراچی تھے۔ اور بعد میں ڈپٹی ہائی کمشنر ہو کر لنڈن چلے گئے)، کولاؤں، چنانچہ ان کی اس خواہش کے احترام کے لیے میں مسٹر آصف مجید کی کوٹھی ''پولیس ہاؤس'' واقع کلفٹن پہنچا۔ آصف مجید صاحب سے ملاقات کی۔ وہ اس وقت شدید بخار میں مبتلا تھے۔ مگر میری گزارش پر اس تقریب کی صدارت کرنے کے لیے میرے ساتھ گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی شام میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ایم۔ اے۔ ایچ روشن کی منگنی کی تقریب بھی تھی۔ مگر ہم نے اس میں شمولیت کرنے کی بجائے اس قومی فریضہ کی ادائیگی کو فوقیت دی اور جب اس سے فارغ ہو کر اپنے بھائی کے سسرال پہنچے تو یہ تقریب قریب الاختتام تھی۔ میں نے اور میرے طرزم بھائی میر عبدالقیوم نے معذرت خواہی کی جو ہمارے نئے قرابت داروں نے بہ طیب خاطر قبول ہی نہیں کی بلکہ قومی فرض کی ادیئگی پر ہماری حوصلہ افزائی کی اور مبارک دی۔

اس موقع پر ہم نے متعدد ویگن لوڈ پارچہ جات اور تحائف پونچھ ہاؤس راولپنڈی کے پتہ پر ارسال کر کے R.R بھی وہیں بھیجیں۔ اس طرح اپنے دفتر میں ملازم مجاہد فورس کے کارکنوں کو قومی خدمت کے لیے کرایہ دے کر مظفر آباد روانہ کر دیا اور اپنے پاس سے ہر ماہ انہیں تنخواہ دیتے رہے۔ اس کے علاوہ کئی مجاہدوں کو جتھوں کی صورت میں مظفر آباد بھیجتے رہے۔ ان کی اطلاعات اور تصاویر مقامی اخبارات میں چھپتیں رہیں۔

مرکزی محاذ رائے شماری نے عملی تعاون کے علاوہ ہزاروں روپے کے نقد چندے فراہم کر کے آزاد کشمیر کے ''پریذیڈنٹ فنڈ'' میں جمع کرائے اور مہاجرین کی آبادکاری میں بھی بھرپور تعاون کیا۔ اس بارے میں عدالت میں تحریری ثبوت پیش ہو چکے ہیں۔

نظریۂ پاکستان:

میں ذاتی طور پر نظریۂ پاکستان کے حامی اور فداکار اُس انتہا پسند گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جو قیامِ پاکستان کے بعد حکمرانانِ پاکستان کی ہمالیائی غلطیوں کے باوجود اس نظریہ پر روزِ اول کی طرح راسخ ایمان رکھتا ہے اور اس ملک میں ہونے والی چھوٹی بڑی غلطیوں پر پیچ و تاب کھانے کے

کی جانب توجہ نہیں دی جس سے ان غیرت مند لوگوں میں بے حد اشتعال پیدا ہوگیا۔ سی آئی ڈی کا انتظام غیر معمولی تھا۔ فوراً ہی اس امر کی اطلاع گورنر تک پہنچی اور اس نے فوراً مہاراجہ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی اور مشورہ دیا کہ مہاراجہ کو ان ریٹائرڈ افسران کی سلامی قبول کرنے کے لیے ان کے اجتماع کی جانب جانا چاہیے۔ چنانچہ باقاعدہ فوج سے سلامی لینے کے بعد مہاراجہ نے اپنی گاڑی کو اس جانب موڑنے کا حکم دیا اور سلامی قبول کی اور ان سابق افسران میں سے چیدہ چیدہ لوگوں سے ہاتھ ملائے اور فرداً فرداً اُن سے اُن کی خدمات کے بارے استفسار کیا۔ مگر نفرت کا جو بیج مہاراجہ نے اپنی پہلی بے رخی سے اس مردم خیز خطہ کے مجاہدین کے دلوں میں بو دیا تھا، اس کا نکلنا اب مشکل ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس خطہ سے کم وبیش اسی ہزار جوانوں نے اپنی خدمات برطانوی ہند فوج کے سپرد کی تھیں اور ہزاروں کی تعداد میں ہی بڑی (Ranks) سے ریٹائر ہو کر واپس وطن لوٹے تھے۔ ان کے ساتھ اسلحہ کی بھی بڑی مقدار تھی اور ہر گاؤں میں دو چار کرنل اور بریگیڈیئر کے عہدوں سے ریٹائر ہونے والے افسر بھی موجود تھے۔ دوسرے عہدوں کا تو حد وحساب نہیں۔

مہاراجہ کی بے رُخی نے ان کے ''نیستان'' میں جو ایک ''چنگاری'' ڈال دی تھی اس نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا اور مخالف لوگوں نے باہمی مشورے کر کے خود کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ ادھر مہاراجہ نے بھی واپسی سے قبل گورنر پونچھ کو صورت حال سے خبردار رہنے کی ہدایت کی اور اس کی امداد کے لیے مزید کمک بھیجنے کا وعدہ کیا کہ اس وافر تعداد میں مسلمان فوجیوں کی اس علاقے میں موجودگی خطرناک ہوسکتی ہے۔ مہاراجہ کی واپسی کے بعد گورنر نے سخت ترین انتظامی تدابیر کرنی شروع کر دیں جس کی وجہ سے دبی ہوئی آگ نے جوالہ مکھی کی صورت اختیار کر لی اور آزاد فوجیوں اور مہاراجہ کی فوج کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں۔ یہی صورت حال میرپور میں پیش آئی۔ گلگت بلتستان میں مقیم مہاراجہ کی فوج کے مسلمان افسروں نے باہمی مشورے سے ایک اسکیم کے تحت فوجی گورنر اور اپنے اعلیٰ افسران کو گرفتار کر کے طول وعرض ریاست میں ایک نازک صورتِ حال پیدا کر دی۔ ادھر کوہالہ کی جانب سے 21 اکتوبر کے لگ بھگ قبائلی پٹھان کوہالہ عبور کر کے چار دن کے اندر اندر سرینگر کے قریب پہنچ گئے۔ مہاراجہ اپنے گرمائی دارالحکومت سرینگر میں دوسہرے کا دربار لگائے ہوئے تھا کہ

ریاستی باشندے پنڈت رام چند کاک کو جو سرینگر کے کشمیری برہمن تھے اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ مسٹر کاک ایک ادنیٰ عہدے سے ترقی کر کے وزیر اعظم کے عہدہ جلیلہ پر پہنچے تھے۔ انہوں نے بھی مہاراجہ کو یہی مشورہ دیا کہ ریاست کو خود مختار رکھا جائے اور اپنے چیف سیکرٹری چوہدری نیاز احمد کے ذریعہ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر پر اثر انداز ہو کر مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ سے ایک قرارداد (اس کے سرینگر سیشن میں) پاس کرائی۔ جس کا مقصد ریاست کو آزاد خود مختار رکھنا تھا مگر اس قرارداد کی بحیثیت مجموعی بالخصوص صوبہ جموں اور کشمیر میں بھی مخالفت کی گئی۔ اور ہنزہ و نگر کے امیروں اور دوسرے جاگیرداروں نے بھی تاریں دے کر مہاراجہ کو پاکستان سے الحاق کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ 46، 1947ء کے زمانے میں میں ضلع کٹھوعہ میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھا۔ یہ علاقہ دور افتادہ ہونے کے علاوہ صرف ایک (Fair weather) روڈ کے ذریعہ جموں کی راجدھانی سے منسلک تھا اور اس جانب سوائے سواریوں کی ایک دو بسوں کے روزانہ کوئی بھی ٹریفک نہ تھی۔ مہاراجہ کے ادھر سے گزرنے کا کبھی سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا کیونکہ ہر میل میں ایک دو جگہ برساتی نالوں کا گزر تھا۔ جن کی گزرگاہ گول پتھروں سے اٹی پڑی ہوتی تھی۔ مگر اس ایک یا ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مہاراجہ کم از کم تین دفعہ اس علاقے میں آیا اور اعلیٰ افسران تو مسلسل آتے جاتے رہے۔ مہاراجہ نے خلافِ معمول پر پُرزے نکالنے شروع کیے اور بالخصوص صوبہ جموں کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اس زمانے میں وہ پونچھ کے علاقے میں بھی گیا جو ریاست کشمیر کی ایک ذیلی ریاست تھی اور مہاراجہ کا ایک تعلق دار اِس کا راجہ تھا۔ جس کی موت کے بعد اُس کا نابالغ ولی عہد گدی نشین ہوا۔ مہاراجہ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر وہاں پر ''ولی عہد'' کا ایک اتالیق (خان بہادر عبدالقیوم کو جو سابق وزیر اور جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے جج بھی رہ چکے تھے) مقرر کر دیا۔ دورہ کے دوران مہاراجہ نے پونچھ گیریزن کا معائنہ کیا اور سلامی بھی لی۔

اس موقعہ پر برطانوی فوج سے ریٹائر ہو کر آنے والے کثیر تعداد میں اعلیٰ فوجی افسران جو سب کے سب مسلمان تھے اور جنگ عظیم دوم میں شرکت کر کے دنیا بھر کا سفر کر کے انہی دنوں واپس وطن لوٹے تھے، نے بھی جمع ہو کر مہاراجہ بہادر کو وردی میں ملبوس ہو کر سلامی دی۔ مگر مہاراجہ نے ان

راقم الحروف اور اس کے ساتھی بھی ذاتی طور پر اس تجویز کے مخالف تھے، اور انہوں نے اس موقعہ پر اپنے اخبار اور اسٹیج سے بھی اس تجویز کی مخالفت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ چوہدری صاحب مرحوم نے ایک دفعہ اپریل، مئی 1950ء میں ریڈیو آزاد کشمیر سے اسی قسم کی تجویز شیخ صاحب کو پیش کی مگر اس موقعہ پر بھی راقم اور اس کے ساتھیوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔

بالآخر شیخ صاحب نے بھارت کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر باوجود وزیر اعظم ہونے کے حکومت سے ٹکر لینے کی ٹھان لی اور اس طرح 9, اگست 1953ء کو گرفتار ہو کر جیل نشین ہو گئے۔ ان پر بھارتی حکومت نے یہ الزام عائد کیا وہ حکومتِ امریکہ سے ساز باز کر کے ریاست کو ''خود مختار'' بنانے کی سازش کر رہے تھے۔

اِس دوران پاکستان اور آزاد کشمیر میں بسنے والے چند سیاسی کارکنوں نے اقوام متحدہ کی بے عملی، بھارت کی ہٹ دھرمی اور حکومتِ پاکستان کی مسلسل بھارت کی تجاویز کے سامنے سپر انداز ہونے کی پالیسی سے مایوس ہو کر ''آزاد خود مختار'' کشمیر کو ہی مسئلہ کے حل کے طور پر اپنا کر اس کا پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا۔ ان سب میں موثر ترین اور سب سے اونچی آواز خواجہ غلام نبی گلکار انور کی تھی۔ جنہوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے اپنا ایک ہفتہ وار اخبار ''ہمارا کشمیر'' کے نام سے جاری کرنے کے علاوہ دوسرے کشمیری اور پاکستانی اخبارات میں اس موضوع پر مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اُن کے اس مشن میں میر عبدالعزیز حال مدیر ''انصاف'' نے ان کا ساتھ دیا۔ اس طرح مسٹر ثناء اللہ بٹ (حال مدیر ''آفتاب'' سرینگر جنہیں سردار قیوم نے بہ نوک سنگین (C.F.L) حدِ متارکہ کے اس پار دھکیل دیا تھا) نے مظفر آباد سے اپنے ہفت روزہ اخبار کشمیر میں اس موضوع کو اپنا لیا تھا۔ گلکار صاحب نے 1961ء میں ہونے والے آزاد کشمیر کے پہلے صدارتی انتخاب میں ''خود مختار'' کی بنیاد پر الیکشن بھی لڑا۔ وہ اگرچہ انتخاب ہار گئے اور ان کے مقابلے میں مسٹر کے۔ ایچ خورشید جن کا انتخابی منشور (Election Manifesto) ''آزاد کشمیر کو پوری ریاست کی نمائندہ حکومت تسلیم کرانا'' تھا، جیت گئے۔ مگر ان کے ساتھ ہی سردار عبدالقیوم خان بھی جنہیں نہ صرف چوہدری غلام عباس مرحوم کی پوری پوری تائید و حمایت حاصل تھی اور وہ ''پوری ریاست کے

مہورہ کے بجلی گھر پر قبائلیوں نے قبضہ کر کے پاور ہاؤس کو بھک سے اُڑا دیا اور دربار میں برقی رو کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے اندھیرا چھا گیا۔ مہاراجہ اندھیرے ہی میں اپنے (اے ڈی سی) کی مدد سے دربار ہال سے نکل کر فرار ہو گیا اور اس طرح اس کے آزاد و خود مختار جموں کشمیر کا تار پود بکھر کر رہ گیا۔

شیخ محمد عبداللہ نے (جو انہی دنوں اپنی ایک ڈیڑھ سالہ گرفتاری کے بعد قبل از وقت رہا ہو کر آئے تھے) جب دیکھا کہ انتظامیہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے تو انہوں نے اپنے رضا کاروں کو حکم دیا کہ ملکی انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اپنی ایک آزاد انتظامیہ قائم کر کے (جس کو بعد میں جا کر ایمرجنسی ایڈمنسٹریشن کا نام دے کر انہیں سرکاری حیثیت دے دی گئی) پوری ریاست جموں کشمیر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مہاراجہ نے جموں پہنچ کر ایک طرف صوبہ جموں کے مسلمانوں کا قتل عام کرانے کا منصوبہ تیار کیا اور اس پر مکمل طور پر عملدرآمد بھی کرایا اور دوسری طرف بھارت سے امداد کا طلب گار بھی ہوا جو انہوں نے بغیر (Instrument of Accession) ''دستاویز الحاق'' داخل کرنے کے، کسی قسم کی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ مہاراجہ تیار ہو گیا۔

پنڈت نہرو نے شیخ عبداللہ کے مشورے کے بغیر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شیخ عبداللہ نے اس غیر مشروط دستاویز کو مشروط بنانے کی شرط کرائی اور امن وامان کی بحالی کے بعد ریاست میں استصواب رائے عامہ کرانے کا بھارت کو پابند بنا دیا۔ مگر مرور ایام کے ساتھ شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ بھارت کی نیت اس بارہ میں ٹھیک نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس مسئلہ کا ایک آسان حل تلاش کیا اور جموں جیل میں مرحوم چوہدری غلام عباس خان صاحب سے بات چیت کر کے بہ حالات موجودہ ریاست جموں وکشمیر کو ہر دو مملکتوں سے الگ تھلگ رکھنے کا پروگرام بنایا اور انہیں جموں جیل سے رہا کر کے یکم مارچ 1948ء کو اس غرض سے پاکستان روانہ کیا کہ وہ اس تجویز سے حکومت پاکستان کو آگاہ کر کے ان کی حمایت حاصل کر لیں تا کہ اس طرح بھارتی فوج کو ریاست سے فارغ کیا جا سکے۔ مگر یہاں اس تجویز کی پذیرائی نہ ہوئی اور چوہدری غلام عباس اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

چور چھپا بیٹھا ہے اور جیسے کہ ان کے سب سے بڑے موید سیالکوٹ کے ایک بدنام ہفت روزہ اخبار کے صحافی نے ایک بار بغیر کسی وجہ کے یہ کہا تھا کہ ہم نے بغیر کسی معاوضہ کے خودمختار کشمیر کا اس قدر پراپیگنڈا کر دیا ہے جو اس نظریے کے حامی لوگ لاکھوں روپے صرف کرنے سے نہیں کر سکتے۔ یہ صاحب اپنے آقائے ولی نعمت سردار عبدالقیوم کی ہدایات کے تحت ایسا کرتے رہے ہیں اور مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ سردار عبدالقیوم مخالفت کے بھیس میں نظریہ خودمختار کشمیر کے سب سے بڑے مبلغ اور حامی۔ ہیں اس طرح نہ انہیں پاکستان کے کسی گوشے سے مخالفت کا اندیشہ ہے نہ وزاراتِ امور کشمیر کی تائید و حمایت سے محرومی کا خوف اور اس پر طرفہ تماشا یہ کہ رنگ بھی چوکھا آئے کے مصداق پاکستان کے ''خوش فہم'' اور اپنی کوئی رائے نہ رکھنے والے سادہ لوح عوام کی جیبوں پر آسانی کے ساتھ ہاتھ صاف کرنے کے سو فیصدی یقینی مواقع بھی موجود۔

محاذ رائے شماری نے اپنی جانب سے مختلف نقطہ ہائے نظر کو یکجا کر کے کشمیری عوام کو

۱۔ خودمختار کشمیر کے حامی۔

۲۔ پاکستان کے ساتھ الحاق کے حامی۔

۳۔ بھارت کے ساتھ الحاق کے حامی۔

ہونے کی بجائے صرف ایک نقطہ اتحاد ''حق رائے دہی کے حامی'' بنا کر بھارت کی اس مستقل رٹ ''کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے'' پر ایک گہری ضرب لگانے کی جو کوشش کی تھی ''وزارتِ امورِ کشمیر کی'' ''بے مغز'' ''بھارتی ایجنٹ'' نوکر شاہی اپنی کشمیر دشمن پالیسی پر مبنی حکمت عملی سے نہ صرف ناکام بنا دی بلکہ مقبوضہ کشمیری مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں جس کے نتائج اب ظاہر ہونا بھی شروع ہو گئے ہیں۔

گزشتہ چھ ماہ سے اس باوقار عدالت کے ایوان میں اور گزشتہ سوا سال سے پورے پاکستان بلکہ پوری دنیا میں این ایل ایف کے مٹھی بھر محب وطن سرفروشوں کو جنہوں نے پاکستان کے استحکام کے نظریہ اور مقبوضہ جموں کشمیر کی آزادی کے لیے اپنے ''نہ ہونے کے برابر'' انتہائی محدود ذاتی ذرائع سے جس ہمالیائی مہم کا بوجھ اپنے سر لیا تھا صبح و شام طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

پاکستان کے ساتھ الحاق'' کے موضوع پر انتخابات لڑ رہے تھے۔ بھی شکست سے دوچار ہوئے۔

1963,62 میں بھٹو سورن سنگھ ملاقاتوں کے دوران تقسیم کشمیر پر بات چیت ہو رہی تھی۔ ایوب خان نے ''کچھ دو کچھ لو'' کے اصول کا اعلان کیا تھا۔ بھارت نے ''رائے شماری کا متبادل حل'' تلاش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ہر دو صورتوں میں کشمیر کی تقسیم سامنے نظر آ رہی تھی کہ کچھ محب وطن لوگوں نے متبادل حل کے طور پر ''خود مختار کشمیر'' کا نعرہ بلند کیا۔ کیونکہ ریاست کے عوام کو ریاست کی تقسیم ہرگز قبول نہیں اور پاکستان کو بھی تقسیم سے کوئی فائدہ پہنچنے کا امکان نہیں۔ بلکہ تقسیم میں پاکستان کا سراسر نقصان ہے جیسا کہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں نے پوری طرح یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ جب تک بھارت کی فوج کا ایک بھی سپاہی دریائے راوی کی مغربی جانب موجود ہے۔ پاکستان کا وجود خطرے میں رہے گا۔ مگر بھٹو سورن سنگھ ملاقاتوں کی ناکامی کے بعد اس گروپ نے ''کشمیر انڈی پنڈنس کمیٹی'' کے نام سے جو جماعت قائم کی تھی خود بخود ختم کر دی۔ 1965ء میں شیخ عبداللہ کی دعوت پر جب بالآخر آزاد کشمیر اور پاکستان میں وسیع پیمانے پر ''محاذ رائے شماری'' کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس چیز کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ اپنی صفوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لیے اختلافی امور کو ہوا دینے کی بجائے انہیں پس پشت ڈال دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہر نقطہ نظر کے لوگوں کے اطمینان اور تسلی کے لیے آئین میں ان کے نقطہ نظر کی نمائندگی بھی رکھی جائے مگر ''وزارتِ امورِ کشمیر'' جس کا کاروبار ہی انتشار پر چلتا ہے اسے یہ بات یکسر نہ بھائی اور اس نے اپنے گماشتوں کے ذریعہ کشمیری باڈی پالیٹک کو ٹکڑے ٹکڑے کیے رکھنے کے لیے اپنے گماشتوں اور ایجنٹوں کو مسلسل حرکت میں لائے رکھا۔ بعض ایک گماشتوں کا اپنا کاروبار بھی اسی قسم کے خالی خولی نعروں کے ذریعہ پاکستان کی رائے عامہ بیوقوف بنا کر اپنی جیبوں کو گرم رکھنے سے چلتا ہے اس لیے انہوں نے اس دو دھاری تلوار کو جان بوجھ کر بڑی شدت سے چلایا تا کہ ایک طرف وزارتِ امورِ کشمیر کی اس سب سے بڑی خدمت کے ذریعے تائید و تعاون حاصل رہے اور دوسرے پاکستان کی رائے عامہ کو اس سستی شہرت حاصل کرنے والے نسخے کے استعمال سے گمراہ کر کے اپنے مسلسل حلوے مانڈے کا انتظام رکھا جائے، تیسری صورت یہ ہے کہ ان کے اپنے دل میں ''خود مختار کشمیر'' کا

گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں کروں بیاں تو کہے صنم بھی ''ہری ہری''

کے مصداق وہ ساکت وسامت بت بن کر نہیں بیٹھ سکے وہ خود اپنی بگڑی بنانے کے ساتھ ساتھ نظریہ پاکستان اور اسلام کو بھی ایک حقیقتاً فعال قوت بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں جس پر اعتراض کا کسی کو بھی حق نہیں ہونا چاہیے۔

23, جون 1972ء

میر عبدالمنان
''ملزم''

قفس ہے اب بھی صلہ حریّت پسندی کا
حصارِ کربِ غلامی ابھی گِرا تو نہیں
یہ مُلک ٹھہرا ہے میرِ سپاہ کی جاگیر
مگر یہ کاتبِ تقدیر کا لکھا تو نہیں
(پروفیسر نذیر انجم)

استغاثہ پاکستان کی آنجہانی آمریت اور غاصب یحییٰ خان اور اس کے جرنیلوں کے ٹولہ کی ہدایت کے تحت اس بدلے ہوئے دور میں بھی ان پر بھارتی ایجنٹ اور سمگلر ہونے کے الزامات عائد کر رہا ہے اور اس باوقار عدالت کے عالی قدر چیئرمین بھی ان کے لئے لیتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اُن کے جوشِ جنون اور حُبِ وطن کی داد دینی چاہیے تھی جس نے انہیں بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے کی ہمت عطا کی اور عقلِ بے مایہ کی طرح صرف محوِ تماشا نہ رہنے دیا۔

کیا میں سوال کر سکتا ہوں کہ پورا عالم اسلام اپنی بے پناہ افرادی قوت، فوجوں، بحریہ اور فضائیہ کے باوجود مٹھی بھر اسرائیلیوں کو اپنے قبلہ اوّل سے آج تک کیوں نکال باہر نہ کر سکا۔ پاکستان اپنی تمام تر مادی ترقی اور گیارہ سال تک سینٹو اور سیٹو سے وابستگی کے تحت حاصل کردہ اسلحہ کے باوجود کیوں صرف سترہ روز میں دم توڑ بیٹھا اور 1971ء میں آدھے پاکستان کو کھو بیٹھا۔ کیا زندگی میں صرف کامیابی ہی قابل تعریف وستائش ہے۔ کیا کوشش ناتمام کا انسانی ترقی اور کامیابی میں کوئی حصہ نہیں؟ کیا کسی نئے نظریہ اور نئی جہت میں آغاز سفر بلند حوصلگی ہونے کے باعث قابلِ صد ستائش نہیں۔ کیا ناکامی کی صورت میں باحوصلہ انسانوں کا صلہ صرف لعنت وملامت ہی ہونا چاہیے۔ اگر اس بلند مرتبہ عدالت کے خیال میں کوشش ناتمام کا کوئی صلہ نہیں ہونا چاہیے تو ترقی کے تمام سُوتے بند ہو کر رہ جائیں گے۔ اور ایک جمود کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ جو انسانی ترقی کے لیے زہر قاتل کا عمل رکھے گی۔ ہمارے ملک اور قوم پر پہلے ہی مدت سے سکوتِ مرگ طاری تھا۔ منافقت اور خوشامد روز افزوں ہے۔ ان کی حد یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ معرضِ وجود میں آیا تھا اس کے ساتھ منافقت اور دھوکہ کیا گیا ہے۔ اس ملک کے تین سب سے بڑے مظلوم، خود اسلام، تصورِ پاکستان اور کشمیری ہیں جن کے چرچے گزشتہ ربع صدی میں اس قدر زیادہ ہیں کہ شاید مجموعی طور پر گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال کی اسلامی تاریخ میں نہیں ہوئے ہوں گے۔ لیکن کشمیری اس صورتِ حال سے ہرگز مطمئن نہیں۔ کیونکہ ان کی اکثریت ترقی پسند اور تخلیق پسند ہے وہ اپنے ملک کو پنجہء اغیار میں سسکتے نہیں دیکھ سکتے۔ پاکستان کی لیڈر شپ اور نوکر شاہی نے اپنے عوام، نظریہ پاکستان اور اس ملک کے خالق اسلام کے ساتھ ساتھ لفظ ''کشمیر'' کا بھی بے حد استحصال کر کے اپنی تجوریاں بھر لی ہیں۔

عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ

جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے بزرگ راہنما عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ 31, اکتوبر 1926ء کو موڑھا کنیال ڈڈیال کے ایک عالم دین میاں محمد سواریؒ کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش دینی و مذہبی ماحول میں ہوئی۔ آپ نے مڈل کا امتحان ڈڈیال سے اور میٹرک کا امتحان ہائی سکول میرپور سے پاس کیا۔ سکول کے زمانے میں آپ نے اپنے اردگرد ڈوگرہ دورِ حکومت کے خلاف غم و غصے کا اٹھتا ہوا طوفان دیکھا۔ میرپور سے اٹھنے والی عدمِ ادائیگی مالیہ کی تحریک میں آپ نے اپنے بزرگوں کو متحرک پایا۔ احراریوں کی ''کشمیر چلو تحریک'' سے لے کر ''کشمیر چھوڑ دو تحریک'' تک آپ نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں جلسے جلوس اور مظاہروں میں شرکت شروع کر دی۔ میرپور ہائی سکول میں وہ جموں کشمیر سٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ بعدازاں آپ نے اعلیٰ تعلیم کے لئے پرنس آف ویلز کالج جموں میں داخلہ لے لیا۔ پرنس آف ویلز کالج کی چار سالہ زندگی میں وہ ایک سرگرم سیاسی کارکن کی حیثیت سے جدوجہد کرتے رہے۔ آپ نے ہندوستان میں ابھرنے والی سیاسی بیداری کی تحریکوں سے اثر لیتے ہوئے اپنے کالج کے طلبہ کو اکٹھا کر کے مظاہرے کئے، چنانچہ انہیں گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ انہوں نے کشمیر چھوڑ دو تحریک میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔ ایک دفعہ مہاراجہ کشمیر کی بیگم مہارانی تارا دیوی تقسیمِ اسناد کی تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی کالج تشریف لائیں تو درباری آداب کے تحت انعام وصول کرنے والے طلبہ کو تین بار جھک کر اُسے سلام کرنا تھا اور جاتے وقت مہارانی کی طرف پشت کئے بغیر اپنی نشست تک جانا ہوتا تھا لیکن جب عبدالخالق انصاری سند وصول کرنے گئے تو انہوں نے مذکورہ بالا آداب کی خلاف ورزی کا

قولِ فیصل

خالد حمیدی

کوئی پکارے فدایانِ حُسنِ ہستی کو
کہ پیش کرتا ہے شاعر وفا کے نذرانے
وہ جن کی بات سے برہم مزاجِ اہلِ حَشم
وہ جن کی ذات سے تازہ جنوں کے افسانے
وہ جن کا نام علامت شعور و حرکت کی
چلے جو قوتِ دار و رسن سے ٹکرانے

مری زمیں کے خداؤ یہ فیصلہ ہے سنو!
جہاں سے رسمِ محبت اٹھا نہیں سکتے
جنوں کو پابہ سلاسل تو کر دیا تم نے!
جنوں کا نقش دلوں سے مٹا نہیں سکتے
تمہارے بس میں سہی تیرہ ضابطوں کی سیاہ
قلم کی نوک پہ پہرے بٹھا نہیں سکتے

جس میں ''کشمیر انڈی پنڈنس کمیٹی'' کے قیام کا فیصلہ ہوا جس کے بانیوں میں عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ بھی پیش پیش تھے۔ دو برس بعد 4, اپریل 1965ء کو سیالکوٹ میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری کا ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا جس میں عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ کو جماعت کا مرکزی صدر منتخب کیا گیا۔ محاذ کے عہدیداران نے سوچیت گڑھ کے محاذ پر جا کر مادرِ وطن کی مٹی ہاتھ میں تھام کر آزادی کی جدوجہد سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ محاذ کا مرکزی صدر منتخب ہونے کے بعد عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ نے اپنی سیاسی جدوجہد تیز کر دی اور آزاد کشمیر و پاکستان کے طوفانی دورے کر کے جگہ جگہ محاذ کی شاخیں قائم کیں اور جماعتی نصب العین کی تشہیر کی۔ عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ کو سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں میرپور، ڈڈیال، مظفرآباد، گلگت، راولپنڈی اور ایبٹ آباد کی جیلوں میں لگ بھگ پانچ برس تک قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ حکومتِ وقت نے آپ کو خریدنے اور جھکانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر آپ اپنے نظریات پر ڈٹے رہے۔ آپ کو آزاد کشمیر میں حکومت بنانے اور عدلیہ و انتظامیہ میں من پسند کلیدی عہدے دیئے جانے کی کئی بار پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ کیونکہ بقول ان کے ''میں نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک ملک آزاد نہیں ہوتا آزاد کشمیر کی کرسیِ اقتدار کو قبول نہیں کروں گا۔''

30, جنوری 1972ء کو اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے بھارتی طیارہ گنگا اغوا کیا تو صدرِ جماعت عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ کو بھی جبر و تشدد اور قید و بند سے گزرنا پڑا۔ آپ کو دیگر تنظیمی ساتھیوں کے ہمراہ مظفرآباد دلائی کیمپ اور جیل میں قید بامشقت میں رکھا گیا۔ آپ نے عدالت العالیہ آزاد کشمیر میں ایک تاریخی بیان دیا جو بعد ازاں ''قولِ فیصل'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ تاریخی بیان من وعن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ گنگا کیس سے رہائی کے بعد محاذ میں اختلافات و انتشار کی فضا پیدا ہو گئی لیکن اس کے باوجود انہوں نے محاذ کو مضبوط اور فعال بنانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ محمد مقبول بٹ کو انہی کی تحریک پر بلا مقابلہ محاذ رائے شماری کا صدر بنایا گیا۔

1975ء میں انصاری صاحب برطانیہ چلے گئے۔ انہوں نے برطانیہ میں رہتے ہوئے تحریک آزادی کشمیر کو منظم کرنے کا پروگرام بنایا چنانچہ انہوں نے محاذ کے ایک مرکزی راہنما امان اللہ

مظاہرہ کیا۔ چنانچہ کالج انتظامیہ نے ان کی جواب طلبی کی تو انہوں نے جواب دیا کہ ایک مسلمان کے لئے جھکنا اور آداب بجالانا صرف اللہ کی خاطر ہے۔ انصاری صاحب کے زمانہ طالب علمی کے ساتھی شری بلراج پوری اور وید بھسین جیسے لوگ آج بھی پوری ریاست میں پہچانے جاتے ہیں۔

جموں میں زمانہ طالب علمی کے دوران آپ نیشنل کانفرنس کے انقلابی راہنماؤں کی جدوجہد سے متاثر ہوئے لیکن جماعت میں شمولیت اختیار نہ کی۔ 1947ء میں ریاست جموں کشمیر کی جبری تقسیم کے وقت آپ کو نیشنل کانفرنس سے متاثر ہونے اور قومی آزادی کا نظریہ رکھنے کی پاداش میں موت کے گھاٹ اُتارنے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن وہ معجزانہ طور پر قبائیلیوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئے۔ تقسیمِ وطن کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لے لیا اور 52-1951ء میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے سرگودھا میں شیخ محمد ظہیر الدین ایڈووکیٹ صدر آل انڈیا مومن کانفرنس کے ہمراہ پریکٹس شروع کی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ اپنے شہر میرپور آ گئے اور یہاں پریکٹس کرنے لگے۔ اسی عرصے میں آپ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو منظم انداز میں آگے بڑھانے کے لئے 1953ء میں ایک سیاسی جماعت ''عوامی کانفرنس'' کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس قائم تھی لیکن یہ جماعت اور اس کے قائدین الحاقِ پاکستان کے نام پر وزارتِ امورِ کشمیر کی نوکری چاکری میں لگے ہوئے تھے۔ ان حالات میں عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ اور ان کے ساتھیوں نے آزاد، متحدہ، جمہوری اور مکمل طور پر خودمختار کشمیر کا نظریہ پیش کیا۔ اس جماعت نے آزاد کشمیر میں وزارتِ امورِ کشمیر کے اثر و رسوخ سے پاک مکمل جمہوری نظام حکومت کا قیام، لینٹ آفیسران کی واپسی، جاگیرداری نظام کا خاتمہ، بنیادی انسانی حقوق کی بحالی اور گلگت بلتستان و آزاد کشمیر کو ایک انتظامی یونٹ میں لانے کے مطالبات پیش کئے۔ عوامی کانفرنس کا منشور سامنے آنے کے بعد حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر کی کٹھ پتلی مسلم کانفرنسی حکومت نے آپ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ آپ کا وکالتی لائسنس منسوخ کرنے کی کوشش کی گئی اور جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات بنا کر ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی گئی لیکن آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

1963ء میں راولپنڈی کے مقام پر آزادی پسند سیاسی راہنماؤں کا ایک اجلاس منعقد ہوا

عدالتی بیان

(قولِ فیصل)

وان ایمکربک الذین کفرو ایشتبوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔

ترجمہ۔ اور وہ وقت یاد کرو جب کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے۔ تاکہ تجھے گرفتار کر رکھیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے۔ اور اللہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ حق کی آواز اٹھانے والوں کے خلاف ہمیشہ سچائی کے منکروں نے سازشیں کیں اور انہیں جلاوطنی، قتل اور قید کی دھمکیاں دی جاتی رہیں۔ ہم ساتھیوں نے جب اس راہ پر قدم رکھا تھا تو ہم نے پوری طرح اس کی تیاری کر لی تھی۔ ہمیں علم تھا کہ دنیا پرست لوگ ہمارے خلاف ہر طرح کی سازشیں کریں گے۔ حکومت کے نزدیک جیل کی کال کوٹھڑیاں تعذیب کا مؤثر ترین حربہ ہے۔ لیکن ایک مسلمان جس نے اپنی متاع حیات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کر دی ہو اُسے کوئی پرواہ نہیں ہو سکتی کہ اُسے کس حال میں موت آتی ہے۔ قوم کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ہمارا دینی فرض ہے اور اس فرض منصبی کی ادائیگی کی راہ میں ہمیں ہر مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

ہمیں جیل میں رہنے کی کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن وہ حکومت جو اپنے آپ کو اسلامی حکومت کہلواتی ہو اُسے شرم محسوس کرنی چاہیے کہ اُس کی جیلوں میں بغیر مقدمہ چلائے انسانوں کو قید کر رکھا گیا ہے۔ کسی شخص کو عدالت کے فیصلے کے بغیر جیل میں محبوس رکھنا اسلام کے عادلانہ اصولوں کے

خان کو سپانسر بھجوا کر برطانیہ بلالیا۔ان قائدین نے 1977ء میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے نام سے برطانیہ میں ایک نئی تنظیم قائم کی جسے سفارتی محاذ پر فرائض سرانجام دینے کے لئے مختص کیا اڑھائی سال بعد انصاری صاحب برطانیہ سے واپس آ گئے اور محاذ رائے شماری کے مرکزی صدر منتخب ہوئے۔4, جولائی 2002ء وہ بغرض علاج معالجہ امریکہ چلے گئے۔امریکہ میں دس سالہ قیام کے دوران انہوں نے تحریکِ آزادئ کشمیر کے لئے اقوام متحدہ کے ایوانوں کے سامنے کئی مظاہروں کا اہتمام کیا اور امریکی اراکین کانگرس اور پالیسی ساز اداروں کو یادداشتیں ارسال کیں۔امریکہ میں دس سالہ قیام کے بعد اب وہ مستقلاً وطن واپس آ گئے ہیں۔

آپ اس وقت عمرِ عزیز کی 86 بہاریں دیکھ چکے ہیں۔پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود معمولاتِ زندگی سرانجام دے رہے ہیں۔جدوجہد آزادی کشمیر کا یہ مردِ آہن ساری زندگی اپنے نظریات اور اصولوں پر ڈٹا رہا ہے۔سیاسی اور تحریکی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آپ نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔آپ کی چھوٹی بڑی کتابیں جواب تک شائع ہوئی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ قولِ فیصل

۲۔ آزادی کا مجرم

۳۔ جموں کشمیر کے متنازعہ علاقے منگلا میں ڈیم کی تعمیر اور رائے عامہ

۴۔ شمالی علاقے عدالتی کٹہرے میں

۵۔ سچ کہہ دوں اے برہمن

۶۔ گر تو برا نہ مانے

۷۔ قانون آزادی ہند اور مسئلہ کشمیر

۸۔ تقسیم کشمیر کی سازشیں

۹۔ التابعون (حصہ اوّل، دوم، سوم)

آپ آج کل اپنی سوانح عمری لکھنے میں مصروف ہیں۔

کشمیری اسی طرح مصائب کا شکار رہیں گے۔ اور اسی طرح جاسوسی اور غداری کے الزامات کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ چنانچہ میں نے جواباً کہا کہ ''ہاں میں بھارت سے پیسے لینے کا اقبالِ جرم کرلوں گا''۔ جب میرے اس جواب کی اطلاع اس وقت کے اے۔ آئی۔ جی کو پہنچی تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور اس کی موجودگی میں میرے سامنے کشمیریوں کی ایک فہرست پیش کی گئی۔ اور کہا کہ یہ سب لوگ بھارتی ایجنٹ ہیں اور آپ کے علاوہ ان سب لوگوں کو بھارت سے پیسے ملتے ہیں۔ اور یہ سب لوگ بھمبر سے لیکر کیرن تک اشتہارات تقسیم کرتے اور دشمن کو خبریں پہنچاتے ہیں۔ اس پر میں نے ''اقبالِ جرم'' کرتے ہوئے کہا کہ واقعی مجھے بھارت سے پیسے ملتے ہیں۔ جب اس نے بھارت سے رقم ملنے کا ذریعہ دریافت کیا تو میں نے جواب دیا کہ منی آرڈر سے پیسے آئیں تو آپ ضبط کرلیں۔ بارڈرز آپ نے ''سیل'' کر رکھے ہیں۔ ایک ہی ذریعہ باقی رہ جاتا ہے کہ جواہر لعل نہرو ہیلی کاپٹر پر سوار رات کو میرے مکان کی چھت پر آکر اترتے ہیں۔ اور مجھے رقم تھما کر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ سن کر اے۔ آئی جی سیخ پا ہو گیا اور اس نے تفتیشی ٹیم کے متذکرہ افسر کو بے تحاشا گالیاں دینا شروع کر دیں کہ اس نے اپنی بے وقوفی سے ساری اسکیم کو طشت از بام کر دیا ہے۔

تشدد کرنے والی ٹیم کے کپتان کو میرے ساتھ اس وجہ سے ہمدردی ہو گئی تھی کہ اُسے یہ کہا گیا تھا کہ اُسے بھارت میں طبع شدہ پاکستان کے خلاف اشتہارات مختلف مقامات پر رکھ کر مجھ سے جھوٹی برآمدگیاں کرانی ہوں گی۔ اسے جب یہ علم ہوا کہ میرے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے جانے کی سازش ہو رہی ہے تو وہ اس میں شریک نہ ہوا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

1964ء میں وزارتِ امورِ کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر نے میرپور کی انتظامیہ کو حکم دیا کہ میرے کمرہ میں کسی بازاری عورت کو داخل کرا کر مجھ پر زنا بالجبر کا مقدمہ بنا دیا جائے۔ میرپور کی انتظامیہ کے افسران چونکہ سب مقامی تھے۔ اس لیے اس بڑی جسارت کی انہیں ہمت نہ ہوئی اور انہوں نے انکار کر دیا۔ اسکے بعد میرے خلاف دھوکہ دہی اور خیانت مجرمانہ کا جھوٹا مقدمہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ ایک شخص سے یہ درخواست دلائی گئی کہ میں نے اُسے پاسپورٹ بنوا کر دینے کے لیے پانچ ہزار روپے وصول کئے تھے۔ لیکن بعد میں نہ تو پاسپورٹ بنوا کر دیا اور نہ اُسے روپے واپس

منافی ہے۔ اسلام شلوار اور قمیض پہن لینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ ننگوں کو کپڑا مہیا کرے۔ خود روزہ رکھنا ہی ضروری نہیں بلکہ بھوکوں کو روٹی مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ جو لوگ دہلی کے لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ وہ صرف ایک غیر معروف ٹیلے پر اپنی ذاتی نمود و نمائش کے لیے ایک نیا پھریرا لہرا کر تاریخی حقائق کو مسخ کر رہے ہیں۔ ایک ایسا جھنڈا جس کے سائے تلے نہ ہی کشمیری محبانِ وطن نے جنگِ آزادی لڑی ہو، نہ قومی اسمبلی نے اس کی منظوری دی ہو، ایسے ہی نامعلوم مقام پر لہرایا جانا چاہیے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ایسے مقام پر وہ جھنڈا نہیں لہرایا گیا جس کے نیچے میرے وطن کے لاکھوں سپوت شہید ہو چکے ہیں۔ اگر وہ جھنڈا لہرایا جاتا تو شہدا کے مقدس خون کی توہین ہوتی۔

آج تک جب کبھی میری گرفتاری عمل میں آتی رہی۔ مجھے جس بات نے سب سے زیادہ قلبی اور روحانی تکلیف پہنچائی وہ یہ تھی کہ میری گرفتاری کے مقاصد اور مجھ پر لگائے گئے الزامات بڑے ہی گھناؤنے تھے۔ ہر بار مجھے اس بات پر مجبور کرنے کی کوشش کی جاتی رہی کہ میں کشمیریوں کے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے بارے میں یہ شہادت دوں کہ وہ بھارت کے ایجنٹ ہیں اور بھارت سے پیسے لیتے ہیں۔ ان افراد میں سیاسی کارکن اور راہنما، اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری ملازمین، عدالتوں کے جج صاحبان، وکلاء اور تاجر بھی شامل تھے۔

سال 1960ء کی گرفتاری اور جسمانی تشدد مجھے آج تک نہیں بھولتا جب کہ مجھے کئی کئی دن تک بھوکا پیاسا رکھا جاتا تھا۔ سونا تو درکنار بیٹھنے اور لیٹنے تک کی اجازت نہ تھی۔ جلاد تازہ دم ہو ہو کر تشدد کے حربے استعمال کرتے رہتے تھے۔ جب میں بے ہوش ہو کر گر پڑتا تو مجھے چھوڑ دیا جاتا۔ جب ذرا ہوش میں آتا تو پھر ہاتھ اوپر کر کے کھڑے رہنے کا حکم ملتا اور کئی کئی گھنٹے اسی حالت میں رکھا جاتا۔ حتیٰ کہ بے جان ہو کر گر پڑتا۔ اس سراسر ظالمانہ اور انسانیت سوز تشدد سے تنگ آ کر جب میں نے تشدد کرنے والی ٹیم کے کپتان سے پوچھا کہ بتاؤ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو۔ میں دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس تشدد کا مقصد کیا ہے۔ سی آئی اے کے ایجنٹ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں اس کی بتائی ہوئی کہانی سے یہ بات میرے دل میں نقش ہو گئی کہ جب تک جنگ بندی کی منحوس لکیر موجود ہے

جس کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمیشن نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو نئے اور موثر انداز سے دنیا کو روشناس کرانے والی تنظیم قومی محاذ آزادی کے سرفروشوں جناب ہاشم قریشی اور جناب اشرف قریشی کے ایک عظیم کارنامے پر پانی پھر دینے کا فریضہ سرانجام دیا اور حکومت کے ایماء پر سیاسی اور مصلحت پسندانہ رپورٹ مرتب کی۔ جناب شیر کشمیر کے جے پرکاش نارائن کے نام ایک خط کو اس رپورٹ کی بنیاد بنایا گیا اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کی عمارت اس خط پر استوار کی گئی۔

حکومتِ آزاد کشمیر نے متذکرہ مکتوب کو محاذ رائے شماری کو (جس کا عسکری باز و قومی محاذِ آزادی کہلاتا ہے) سیاسی اور عوامی سطح پر بدنام کرنے اور عوام کی ہمدردیوں سے محروم کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر تشہیر کرائی لیکن ہماری جماعت کے معزز ساتھیوں کے خطوط کے جواب میں قائدِ انقلاب جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے مورخہ 14، جون 1971ء کو جو وضاحتی مکتوب لکھا ہے اور جسے روزنامہ ''مساوات'' اور روزنامہ ''تعمیر'' نے قدرے قطع و برید کے ساتھ شائع کیا ہے اس نے اس کمیشن کی رپورٹ کی پوری عمارت کو دھڑام سے نیچے گرا دیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جناب مقبول احمد صاحب خاور اور جناب بابو عبدالرحیم صاحب اس وقت بھی برطانیہ میں مقیم ہیں۔ ورنہ وہ بھی اس وقت ہمارے قابلِ احترام ساتھی جناب جی ایم میر (جن کے نام شیرِ کشمیر کا خط یہاں موصول ہوا ہے) کے ساتھ 23/24 سول ڈیفنس رولز کے تحت ''دلائی'' کے عقوبت خانوں میں دن گزار رہے ہوتے۔

میرے وطن کے اس حصہ '' آزاد کشمیر'' میں گزشتہ چوبیس برس کے عرصہ میں خانقاہوں کے مجاوروں سے لے کر مسجدوں کے خطیب تک، محکمہ مال کے گرداور سے لے کر فنانشل کمشنر تک، سرکاری وکیل سے لے کر چیف جسٹس، حوالدار کلرک سے لیکر کیپٹن جنرل تک، بھٹے کے ٹھیکیدار سے لے کر جنگلات کے رینج افسر تک، ریکروٹنگ افسر سے لے کر بریگیڈیئر تک، ان پڑھ سے لے کر پروفیسر تک، جھاڑ پھونک کرنے والے سے لے کر ڈاکٹر تک، مزارع سے لے کر جاگیردار تک، رند بادہ خوار سے لے کر زاہد پارسا تک .... وزارت و صدارت کی کرسیوں پر متمکن ہوتے رہے۔ لیکن میرے ملک میں غربت بڑھتی رہی۔ جہالت اپنے پنجے گاڑتی گئی اور بیماریوں میں اضافہ ہی ہوتا

کیئے۔ اس سازش کا انکشاف مجھ سے خود متذکرہ مستغیث نے کیا۔ یہ سازش اس وقت ناکام ہوگئی جب مستغیث نے عدالت میں حاضر ہو کر پولیس کے ہاتھوں اپنی مجبوری اور میری بے گناہی کا ثبوت فراہم کر دیا۔ جب یہ سازش مجھ پر منکشف ہوئی تو میں کانپ اٹھا اور حیران رہ گیا کہ نوکر شاہی کشمیر کی جدوجہد آزادی کے کارکنوں کے کردار کو داغدار کرنے اور انہیں بدنام کرنے میں ذلالت اور گھٹیا پن میں کس حد تک جا سکتی ہے۔

میں عدالت کی وساطت سے اپنی قوم کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اپنی نسلوں کی عزت اور اس کے وقار کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے تو اُسے بھارتی افواج کو اپنے ملک سے نکالنے کے لیے ہتھیار سنبھال لینے چاہئیں۔ اگر وہ جہاد سے جی چرائے گی تو حدِ متارکہ جنگ مستقل صورت اختیار کر لے گی۔ اور سرحد کے دونوں طرف بسنے والے کشمیری عوام پر جاسوس ہونے کا الزام لگتا رہے گا۔ آزاد کشمیر میں جو سیاسی کارکن، کالج، ہسپتال، صنعتی اداروں کے قیام اور بنیادی حقوق کی بحالی کا مطالبہ کریں گے، نوکر شاہی اُن پر بھارتی جاسوس ہونے کا الزام لگاتی رہے گی۔ اسی طرح اگر سرحد کے اُس پار لوگ عوامی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کریں گے تو انہیں پاکستانی جاسوس قرار دیا جاتا رہے گا۔ اگر قوم پاکستان یا بھارت کا جاسوس ہونے کے الزامات سے اپنی نجات چاہتی ہے تو قومی محاذِ آزادی کے پروگرام کو اپنانا ضروری ہے۔

یہ قول ایک تاریخی حقیقت رکھتا ہے کہ ''دنیا کی بڑی بڑی بے انصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں۔'' دور جانے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان آج جس بحران سے گذر رہا ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو اس کی بنیادی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کا قتل کر کے دستور ساز اسمبلی کو خلافِ قانون طریقے سے توڑنے کے اقدام پر مہر تصدیق پاکستان کی سب سے بڑی عدالت نے ہی ثبت کی تھی۔

ابھی کل کی بات ہے کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں عدالت العالیہ ہی کے ایک نامور جج نے حکومتِ ہند کی طرف سے محاذ رائے شماری پر لگائے گئے تمام الزامات کو غلط تسلیم کرنے کے باوجود ''محاذ'' پر پابندی کے اقدام کو جائز قرار دیا۔ اور دوسری طرف وہ بھی عدالت العالیہ کا ایک جج ہی تھا،

بنیادی حقوق دلا کر اس علاقے کو آزاد کشمیر میں شامل کرانا۔ بھارتی مقبوضہ علاقے کو مسلح عوامی جدوجہد کے ذریعے آزاد کرا کر پوری ریاست کے مستقبل کا فیصلہ حق خود ارادیت کی بنیاد پر کرانا۔ اور کشمیری قوم کو اقوامِ عالم میں ایک باعزت اور باوقار مقام دلانا محاذ کے مقاصد میں شامل ہے۔

جموں کشمیر محاذ رائے شماری کی عوامی جدوجہد اور قومی مسائل کے بارے میں حریت پسندانہ انداز فکر و عمل ابتدا ہی سے افسر شاہی کی نظروں میں کھٹکتا رہا ہے اور ''محاذ'' کے خلاف اس کا رویہ شروع سے ہی معاندانہ چلا آتا ہے۔ ہمارے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں جن سے ہم کلی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ افسر شاہی نے ہماری جدوجہد کا رخ موڑنے اور ہماری سیاسی و اقتصادی آزادی کے لیے سرگرمیوں کو محدود کرنے اور بے اثر بنانے کے لیے مختلف اقدامات کئے۔ ہم نے ان کوششوں کا ہر مرحلے پر مقابلہ کیا۔ اور افسر شاہی کی سازشوں کو ہر مقام پر بے نقاب کیا۔ ذرائع ابلاغ پر حکومت اور مفاد پرست عناصر کا کنٹرول ہونے کی وجہ سے ایک طرف ''محاذ'' کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے رہے۔ اور دوسری طرف تحریکِ آزادئ کشمیر کے حقیقی دشمن عناصر کو پاکستان دوست ثابت کیا جاتا رہا۔ نوکر شاہی کے قائم کردہ معیار کے مطابق پاکستان کے دوست اور وفادار وہ لوگ ٹھہرے جو:

(ا) وظیفوں، کوٹھیوں، کاروں، پرمٹوں، امپورٹ لائسنسوں، جعلی کلیمز اور دیگر مراعات کی خاطر شہزادہ کوٹھی کے طواف شب و روز کرتے رہیں۔

(ب) دین ہمارا پاکستان، ایمان ہمارا پاکستان، قبلہ ہمارا پاکستان اور قرآن ہمارا پاکستان کے جھوٹے نعرے لگا کر مفادات حاصل کرتے رہیں۔

(ج) پاکستان میں غیر ملکی راہنماؤں کے دورے کے وقت وزارتِ امورِ کشمیر کی تیار کردہ یادداشتیں ہرکاروں کی طرح تقسیم کرتے رہیں۔

(د) سرکاری اخراجات پر نیویارک، واشنگٹن، لندن وغیرہ کی سیر کریں۔ قومی خزانے سے حج اور عمرہ کے فرائض ادا کریں۔ اور وزارتِ امورِ کشمیر کے لکھے ہوئے کتابچے تقسیم کریں۔

رہا۔ بیکاری و بے روزگاری میں کوئی کمی نہ آئی۔ اسی عرصے میں کھیتیاں زیرِ آب آگئیں، جنگل ویران ہو گئے، آبادیاں اُجڑ گئیں اور شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ قومی آزادی اور ارتقاء کی بجائے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی انحطاط کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ عوامی حقوق پامال ہوتے رہے۔ اور محلاتی سازشیں سیاسی پہلوانوں کا اکھاڑ پچھاڑ کرتی رہیں۔ ملکی اور قومی مسائل بڑھتے گئے اور حق کی آواز بلند کرنے والوں کو پابندِ سلاسل کیا جاتا رہا۔ یہ بات اسلامی حکومت کے مدعیوں کے لیے کس قدر باعثِ شرم ہے کہ ان کے دارالخلافے میں آج بھی ایوانِ صدر سے صرف آدھ میل کے فاصلے پر مظفر آباد کے پر رونق شہر کی جبیں کو غاروں میں زندگی گزارنے والے بے شمار مفلوک الحال کنبے داغدار بنائے ہوئے ہیں۔ لاکھوں انسان نان شبینہ کو ترستے ہیں اور ملک کے پیداواری وسائل پر استحصالی عناصر کا قبضہ ہے اور حکمران طبقہ اپنی ذاتی نمود و نمائش اور پروپیگنڈے پر لاکھوں روپے خرچ کر رہا ہے۔

جہاں تک سیاسی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔ ان کا محور وزارتِ امورِ کشمیر بن چکی ہے۔ سیاسی جماعتیں اپنا سارا وقت وزارتِ امورِ کشمیر کے افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے میں صرف کرتی ہیں۔ اور اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ سیاسی جلسے جلوس اور دیگر سرگرمیاں نوکر شاہی کے اشاروں پر ہوتی ہیں۔ نوکر شاہی نے گاؤں کے کارکنوں سے لے کر بڑے بڑے نام نہاد سیاسی لیڈروں تک کو وظیفوں، الاٹمنٹوں اور دیگر مراعات کے ذریعے زرخرید غلام بنا رکھا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ زبان سے تو شب و روز زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے تھے۔ لیکن در حقیقت نہ انہیں مادرِ وطن کی آزادی سے کوئی دلچسپی تھی نہ آزاد کشمیر کی ترقی و خوشحالی سے۔ نوکر شاہی کی کاسہ لیسی، ہوسِ اقتدار اور ذاتی اغراض نے ان لوگوں کے ضمیر کو گہری نیند سلا دیا تھا۔

اِن حالات میں وطن کے کچھ دیرینہ آزموں کار سیاسی کارکنوں اور نوجوانوں نے محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت کے قیام کے مقاصد میں عوامی سطح پر سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے عوام الناس کو تعلیم دینا اوّلین اہمیت رکھتا ہے۔ آزاد کشمیر میں عوامی اقتدارِ اعلیٰ کے اصول پر مکمل جمہوری نظام کا قیام، گلگت وبلتستان کے عوام کو

نو محاذِ آزادی کے خلاف سازشوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ شکوک وشبہات پیدا کیے جانے لگے۔ آخر کار نور العارفین کمیشن کی ایک بے بنیاد اور یکطرفہ رپورٹ کا اعلان ہوا تو یہ طبقہ خوشی سے پھولا نہ سمایا حالانکہ ان مفاد کوش عناصر کے نزدیک ''گنگا'' اغوا کرنے والے حریت پسند واقعی بھارتی ایجنٹ ہوتے تو ان کشمیریوں کے سر ندامت سے جھک جاتے۔ حالانکہ وہ بھی سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ لوگ کسی غیر ملک کے ایجنٹ نہیں ہیں بلکہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بجا طور پر جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر جہاز اغوا کرنے والے دونوں نوجوان محاذ آزادی کے جانباز نہ ہوتے تو ہم انہیں کبھی نہ اپناتے۔ اسی لیے ہم آج بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر جناب مقبول بٹ، جناب ہاشم قریشی، جناب اشرف قریشی، ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب، جناب میر عبدالقیوم صاحب و جناب میر عبدالمنان صاحب، جناب امان اللہ خان صاحب، جناب جی ایم لون صاحب، جناب محمد سعید شاہ صاحب نازکی، جناب جاوید ساغر صاحب، جناب اکرام اللہ خان جسوال صاحب، جناب محمد صدیق بابا صاحب جو کہ پشاور سے لے کر کراچی تک اور میر پور سے گلگت تک قید خانوں میں پڑے ہیں اور ان کے دیگر رفقاء کے خلاف حکومت کے پاس اپنے ذرائع سے کوئی ثبوت موجود ہے تو عام مروجہ قانون کے تحت کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور ہمیں موقعہ دیا جائے کہ ہم وہ تمام ریکارڈ، شہادتیں اور راز ہائے درون پردہ پیش کر سکیں جن سے ہمارا موقف عدالت کے سامنے آئے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔ اگر اس کے بعد عدالت ہمارے ان جانبازوں اور حریت پسندوں کے خلاف فیصلہ دے دے یا کوئی آدمی بھارت کا ایجنٹ ثابت ہو جائے تو اسے سنگین ترین سزا دی جائے۔ لیکن مارشل لاء کے زمانے میں بند کمرے میں سماعت کر کے بدوں شہادت غیر حقیقت پسندانہ رپورٹ دے کر حریت پسندوں کی زندگیوں کے ساتھ کھیلنا انسانیت عظمیٰ کی توہین ہے۔ جہاں دنیا کے تمام حریت پسند اس اقدام کی مذمت کریں گے وہاں کشمیری عوام اسے اپنی آزادی کی راہ کے لیے سدِ راہ باور کریں گے۔

قومی محاذِ آزادی نے 1966ء سے بھارتی ظلم واستبداد کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔ محاذ رائے شماری نے اس وقت اس خفیہ تنظیم کے سلسلے میں عوامی سطح پر راز افشا نہیں کیا۔

(س) محکمہ سراغ رسانی سے معاوضے وصول کر کے محبانِ وطن کے خلاف جھوٹی رپورٹیں فراہم کرتے رہیں۔

(ع) جو غیر جریدہ ملازمین کے حقوق طلب کرنے پر اسے غیر ملکی سازش کا نام دیتے رہیں۔ اور تمام کلیدی آسامیوں پر پاکستانی افسروں کی تعیناتی کا خیر مقدم کرتے رہیں۔

(غ) عوام کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر حکومت کی سرد مہری کو ہدف تنقید بنانے اور جمہوری حقوق کی بحالی کا مطالبہ کرنے والوں کو وطن دشمن اور غیر ملکی ایجنٹ قرار دلاتے رہیں۔

اس معیار کے مطابق عمل درآمد سے گزشتہ چوبیس برس کے دوران سیکڑوں محبانِ وطن کو غیر ملکی ایجنٹ، پاکستان دشمن اور تخریب کار قرار دے کر طرح طرح کی اذیتوں اور قید و بند کی صعوبتوں کا شکار بنایا گیا۔ ہمارے نقطۂ نظر سے نوکرشاہی سے وفاداری پاکستان وفاداری نہیں ہے۔ اور اپنے سیاسی و اقتصادی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد پاکستان دشمنی نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک پاکستان دوست وہ ہے جو پاکستان کو مضبوط متحد اور مستحکم دیکھنا چاہتا ہو۔ کیونکہ بقول شیخ محمد عبداللہ ایک ایسا مستحکم پاکستان ہی کشمیریوں کی آزادی اور بقا کا ضامن ہوسکتا ہے۔

حکومتِ پاکستان نے گزشتہ چوبیس برس میں مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے طور پر کروڑوں روپے خرچ کئے لیکن اس رقم سے ایک مخصوص طبقہ کی پرورش ہوتی رہی۔ آزادئ کشمیر کا مسئلہ رفتہ رفتہ سرد خانے کی نذر ہوتا چلا گیا۔ مفاد پرست عناصر حکومتِ پاکستان کے علاوہ پاکستانی عوام سے بھی کشمیر کی آزادی کے لیے لاکھوں روپے کے چندے وصول کرتے رہے لیکن سوائے نعرہ بازی کے کوئی عملی اقدام سامنے نہیں آیا۔

30, جنوری 1971ء کو محاذ رائے شماری کے عسکری بازو قومی محاذ آزادی کے دو حریت پسند ہاشم قریشی اور اشرف قریشی نے بھارتی طیارہ ''گنگا'' کے اغوا کا قابلِ فخر کارنامہ سرانجام دیا تو ان عناصر کو اپنا کھیل ختم ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس کارنامے نے عوام میں ایک نیا ولولہ اور جوش و خروش پیدا کردیا۔ پاکستان میں نعرے بازوں سے چندے کا حساب مانگا جانے لگا۔ چنانچہ ان عناصر نے از سرِ

الاقوامی سطح پر گوریلا سرگرمیوں کا حصہ سمجھا جاتا ہو۔

1969ء میں اریٹریا کے نوجوانوں نے کراچی کے بین الاقوامی ہوائی مستقر پر حبشہ کے مسافر بردار جہاز پر حملہ کر کے اسے آگ لگا کر تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان نوجوانوں نے بعد میں پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے اس اقدام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے پاکستانی بھائیوں سمیت دنیا کے دیگر ممالک کی رائے عامہ کی توجہ اریٹریا کی جدوجہد آزادی کی طرف مبذول کروا سکیں۔ جو وہاں کے قوم پرستوں نے حبشہ کے جبر و تسلط کے خلاف شروع کر رکھی ہے۔ اس واقعہ کے بعد پاکستانی لیڈر کشمیری لیڈروں سے کہا کرتے تھے "تم نے پاکستان سے لاکھوں روپیہ وصول کر کے ہضم کر لیا۔ لیکن آج تک اریٹریا کے تین بے یار و مددگار نوجوانوں جتنا کام بھی نہ کر سکے۔ "بھارتی طیارہ "گنگا" کا اغوا بھی اسی طرح قومی محاذِ آزادی کے مقصد کے حصول کے لیے کی جانے والی مسلح جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔

ہماری گوریلا سرگرمیوں کے نتیجے میں اعلیٰ سطح پر یہ کوششیں بھی کی جاتی رہیں کہ اس سلسلہ میں حکومت اور محاذِ آزادی کے درمیان تعاون کی راہ نکالی جائے اور کئی بار سلسلہ جنبانی کی گئی۔ آزاد کشمیر کے موجودہ اے۔ آئی۔ جی کرامنر جو گزشتہ گیارہ سال سے وزارتِ امورِ کشمیر کے یہاں مستقل نمائندے کی حیثیت سے تعینات ہیں، میرے خیالات اور ہماری گوریلا سرگرمیوں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی ایک دفعہ ٹٹولا تھا کہ قومی محاذِ آزادی کا پروگرام ان کے پروگرام سے "ملتا جلتا" ہے اس لیے ان کے ساتھ مل کر کام کیا جائے تو کیا مناسب نہ ہوگا، میں نے انہیں یہ کہا تھا کہ اس بارے میں محاذ آزادی کی ہائی کمان کے ممبر جناب مقبول احمد بٹ سے رابطہ قائم کیا جائے۔ کیونکہ میں "محاذ" کے سیاسی بازو سے تعلق رکھتا ہوں اور عسکری بازو کے متعلق میری معلومات واجبی سی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کے ساتھ ہمارا رابطہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "محاذ" کے جانباز اللہ کی رضا کے لیے اپنے وطن کی آزادی کی راہ میں جانیں قربان کرتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ کے محکمے کے بھیجے ہوئے لوگ کرائے کے ایجنٹ ہوتے ہیں جن میں جذبہ حب الوطنی نہیں ہوتا۔ اس لیے دشمن کا ایجنٹ بننے میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے

جب تک جناب مقبول احمد بٹ اور ان کے جانباز ساتھیوں کو سزائے موت کی خبر شائع نہ ہوئی۔ بھارتی پریس ٹیلی ویژن، ریڈیو اور دیگر ذرائع نشر واشاعت نے جب ہماری اس خفیہ تنظیم کی آڑ میں حکومت پاکستان کو بدنام کرنا شروع کیا تو ہمیں کھل کر اعلان کرنا پڑا۔ بھارت انہیں پاکستان کا ایجنٹ کہہ کر ہماری قومی تحریک آزادی کو پس منظر میں لے جانا چاہتا تھا۔

جناب مقبول احمد بٹ دار و رسن کی آزمائشوں سے گزر کر بھارتی پہریداروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سری نگر سنٹرل جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور مظفر آباد، پہنچ گئے۔ یہ خطہ آزاد کشمیر کے نام سے موسوم ہے۔ جسے آزادی کا بیس کیمپ کہا جاتا ہے۔ لیکن کشمیری حریت پسندوں کے لیے یہ بھی ایک وسیع قید خانہ ہے۔

جناب مقبول احمد بٹ کو تقریباً چار ماہ مظفر آباد کے مشہور عقوبت خانے قلعہ گوجرہ میں زیر تفتیش رکھا گیا اور فوج، پولیس اور محکمہ سراغرسانی کے اعلیٰ افسروں نے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد انہیں محبِ وطن قرار دے کر رہا کیا۔ اس وقت کی باتیں ہمیں آج بھی یاد آتی ہیں کہ ایک گروہ منافقین ایسا بھی تھا جو کشمیر کی آزادی کے بہی خواہوں کے روپ میں یہ چاہتا تھا کہ جناب مقبول احمد بٹ کو جنگ بندی لائن کے اس پار دھکیل دیا جائے تا کہ انہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور اس کے ردعمل کے طور پر پوری وادی میں بھارت کے خلاف آگ بھڑک اٹھے وہ اپنی جگہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ ایک پاکباز انسان کی قربانی ہوگئی اور اس سے وطن بہت جلد آزاد ہو جائے گا۔

گزشتہ سالوں میں ہمارے گوریلا مجاہدوں نے بہت سے معرکے سر کیئے لیکن بین الاقوامی مصلحتوں اور ''دوست ممالک'' کے دباؤ کے پیش نظر پاکستان کا قومی پریس ان کی مناسب تشہیر نہ کرسکا۔ ہم چاہتے تھے کہ بین الاقوامی سطح پر بھارت کے اس غلط پروپیگنڈے کا جواب دیا جائے جو اُس نے اُس پار کشمیر کے بارے میں پھیلا رکھا تھا کہ لوگوں نے اپنی رائے سے بھارت کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہوا ہے۔ نیز معاہدہ تاشقند کے نتیجہ میں جو بے حسی اور بددلی پھیل چکی تھی۔ اس کے دور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا، کہ عالمی رائے عامہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اور دنیا کے آزادی پسند عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیا جائے جسے بین

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ جو لوگ آج قومی محاذ آزادی کے جانبازوں کو بھارت کا ایجنٹ قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں وہ گزشتہ پانچ سال کے دوران آزاد کشمیر یا پاکستان میں ثبوت کے طور پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ پیش نہیں کر سکتے جو تخریبی سرگرمیوں کی تعریف میں آتا ہو۔ نوکر شاہی کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام کے لیے بنیادی انسانی حقوق کا مطالبہ گلگت و بلتستان کو آزاد کشمیر میں شامل کرنے کی قرار دادیں، آزاد کشمیر کے باشندوں کا کمایا ہوا کروڑوں روپے کا زرِ مبادلہ آزاد کشمیر میں خرچ کرنے کا مطالبہ کرنے اور آزاد کشمیر میں کلیدی اسامیوں پر مقامی اہل افسروں کی تعیناتی کے حق میں تقریروں کو تخریبی سرگرمیاں سمجھا جاتا ہو لیکن یہ مطالبات پوری قوم کے ہیں اس لیے قوم کے کسی ایک عنصر کو تخریب پسند کہنا بے معنی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ گلگت بلتستان کے معاملہ میں نوکر شاہی بہت حساس ہے مجھے ایک دفعہ چیف ایڈوائزر نے کہا تھا کہ حکومت پاکستان سارے کشمیر کو چھوڑ سکتی ہے لیکن گلگت بلتستان کو کسی صورت میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کیونکہ اسکے بغیر مغربی پاکستان دوسرے ممالک سے کٹ جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ہمیں گلگت بلتستان کا نام نہیں لینا چاہیے۔ میں اس موقعہ پر اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

نور العارفین کمیشن رپورٹ شائع ہوتے ہی ''محاذ'' کے راہنماؤں کے خلاف دارو گیر کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ چھاپے ڈالے گئے۔ محاذ کے اراکین اور ان کے لواحقین کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بھاری تعداد میں مسلح پولیس کے ذریعے خانہ تلاشیاں لی گئیں۔ خوف و ہراس کی فضا پیدا کی گئی۔ محاذ کے اراکین کے لیے اپنے راہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تنظیمی خلاء پُر کرنے کے لیے نئے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا۔ لیکن آزاد کشمیر حکومت جس نے گزشتہ چھ ماہ سے متشددانہ، منتقمانہ اور غیر جمہوری کارروائیوں کا آغاز کر رکھا ہے، ان نو منتخب عہدیداروں کو بھی گرفتار کر کے نظر بند کرنے سے باز نہ آئی۔ اس دوران بھی ''محاذ'' کے مرکزی دفتر واقع علامہ اقبال روڈ میر پور آزاد کشمیر پر ڈرامائی انداز میں چھاپہ ڈالا گیا اور سارا ریکارڈ قبضہ میں کر لیا گیا۔ اب میں ان وجوہات

کہ جو لوگ یہاں سے فوج کے کارندے بن کر حدِ متارکہ جنگ کے اس پار کام کرنے کے لیے جاتے رہے جب انہیں وہاں زیادہ معاوضے کا لالچ دیا گیا تو انہوں نے ڈبل ایجنٹ بننے میں کوئی عار محسوس نہ کی اس کے علاوہ پولیس کے بھیجے ہوئے تنخواہ دار افراد سے وہاں اکثر اس قسم کی کارروائیاں عمل میں آتی رہیں جن کی وجہ سے وہاں کی فرقہ پرست تنظیموں کے ہاتھ مضبوط ہوتے رہے۔ ''محاذ'' کے نقطہ نظر سے یہ بات قومی تحریک آزادی کی روح کے منافی ہے۔ میں نے آئی جی صاحب کو یہ بھی بتایا کہ ''محاذ'' کی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ حد متارکہ جنگ کے اس پار یعنی بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مقامی کشمیریوں کو گوریلا جنگ کے لیے تیار کیا جائے کیونکہ گوریلہ جنگ کے بنیادی فلسفہ کی رو سے فرزند سرزمین (Son of The Soil) ہی کامیابی سے گوریلا جنگ لڑ سکتا ہے۔

تفتیش کے دوران مجھے اس امر کا پتہ چلا کہ ہمارے کارکنوں اور ساتھیوں پر تشدد کر کے اس قسم کے اقبالی بیان حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس سے بھارتی طیارہ ''گنگا'' کے اغوا کا تعلق مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی صورت حال سے ثابت کیا جائے۔ میں اس معزز عدالت کی وساطت سے پاکستان اور کشمیر کے عوام کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کارنامے کا تعلق نہ پاکستان سے ہے نہ بھارت سے بلکہ خالصتاً کشمیری حریت پسندوں کا کارنامہ ہے۔ کشمیری حریت پسندوں نے ''گنگا'' کو لاہور کے بین الاقوامی ہوائی مستقر پر اتار کر ثابت کیا ہے کہ پاکستان کے عوام کشمیر کی تحریکِ آزادی میں ایک معاون قوم کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ جو حکومت ہمارے حریت پسندوں کو سیاسی پناہ دے چکی ہو اور جس حکومت کے سربراہ نے اقوام عالم کے سربراہوں کو بھارت کے خلاف اس اقدام سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری حریت پسندوں نے بھارت کے مظالم سے تنگ آ کر ہتھیار اُٹھا لیے ہیں، وہ یکایک 25 مارچ کو سیاسی سرگرمیوں پر مارشل لاء کے تحت پابندیاں لگانے کے بعد اپنے سابقہ اعلانات سے کیسے منحرف ہو سکتی ہے۔ کیا پاکستان کے کروڑوں عوام اپنی حکومت سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ اگر محاذِ آزادی کے ارکان بھارتی ایجنٹ تھے تو محکمہ ہائے سراغرسانی آج تک کیا کرتے رہے اور گزشتہ چھ سال کے دوران اس سے بے خبر کیوں رہے۔

حکومت میری تقاریر کا موضوع رہے۔ ان تقاریر میں، میں نے صدرِ حکومت کے متضاد اور غیر حقیقت پسندانہ بیانات پر کڑی نکتہ چینی کی۔

۳۔ میر پور کالج میں طلباء کی آپس میں کشمکش کے نتیجے میں ایک وزیر کے لڑکے کے ہاتھوں سرِ عام طلباء پر فائرنگ کے خلاف میں نے زبردست تقریر کی اور فائرنگ کرنے والوں کو المجاہد فورس کے پہلے گوریلے قرار دیا اور اس معاملے کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا اور میر پور بار ایسوسی ایشن کی طرف سے احتجاجی قرارداد کا مسودہ تیار کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

۴۔ صدرِ حکومت نے پہلے دورۂ میر پور کے دوران میر پور بار کو خطاب کرنا چاہا تو میں نے اِس بنا پر مخالفت کی کہ انہوں نے سکریننگ کمیٹی کی رپورٹ کو پس پشت ڈالنے، ریٹائر ہونے والے ملازمین کو توسیع ملازمت دینے وغیرہ کے سلسلہ میں بار کی قراردادوں پر عمل درآمد نہ کر کے بار کے وقار کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ پھر ڈاک بنگلے پر صدرِ حکومت کے ساتھ بار کے ارکان کو صدر کی طرف سے چائے کے لئے بلایا گیا۔ لیکن میں اور میرے ساتھی اس میں شامل نہ ہوئے۔

۵۔ صدرِ حکومت نے میر پور بار کے پرانے اور تجربہ کار وکلاء کو نظر انداز کر کے اپنی جماعت کے رکن اور اسپیکر آزاد کشمیر اسمبلی کے داماد کو میر پور میں بطور سرکاری وکیل تعینات کرا کر خویش پروری کی مثال قائم کی۔ جس کے خلاف میر پور بار ایسوسی ایشن کی احتجاجی قرارداد میں، میں نے نمایاں حصہ لیتے ہوئے قرارداد کا مسودہ تیار کیا۔

صدرِ حکومت نے جو میری اس جمہوری تنقید سے سخت پریشان تھے، میرے جمہوری حقوق کی مٹی پلید کرتے ہوئے ذاتی انتقام کے تحت مجھے گرفتار کر کے مجھے اور میرے دیگر ساتھیوں کو گذشتہ کئی ماہ سے نظر بند کر رکھا ہے۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ گذشتہ پانچ ماہ کے حبسِ بے جا کے دوران دلائی کیمپ میں میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا معزز عدالت کے نوٹس میں لاؤں تا کہ یہ عدالت اندازہ کر سکے کہ موجودہ حکومت اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف انتقامی کارروائیوں میں انسانیت، اخلاق اور قانون کے تمام تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر پستی کی کس حد تک جا سکتی ہے۔

سال 1960ء میں جب مجھے تشدد کر کے بیہوش کر دیا گیا تھا اور ہوش آنے کے بعد اس

پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جوان منتقمانہ کارروائیوں اور خصوصاً میری گرفتاری کا فوری سبب بنیں۔

(ا) آزاد کشمیر کے گزشتہ انتخابات سے قبل تین سیاسی جماعتوں نے جن میں موجودہ حکمران جماعت بھی شامل تھی، ایک مشترکہ چار نکاتی پروگرام حکومت پاکستان کو پیش کیا تھا۔ اور اعلان کیا تھا کہ جب تک یہ چار نکات منظور نہیں ہوں گے وہ انتخاب میں حصہ نہیں لیں گے۔ لیکن بعد میں باوجود اس کے کہ یہ چاروں نکات منظور نہیں ہوئے تھے۔ حکمران جماعت اپنے موقف سے پھر گئی اور انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ محاذ رائے شماری نے سختی سے اس کا نوٹس لیا اور تحریروں اور تقریروں کے ذریعے اس انحراف پر سخت نقطہ چینی کی۔ ''محاذ'' نے خاص طور پر گلگت بلتستان کے بارے میں مسلم کانفرنس کی پالیسیوں کو ہدف تنقید بنایا۔ برسر اقتدار آنے کے بعد مسلم کانفرنس نے آزاد کشمیر میں جمہوری روایات کو کچلنا شروع کر دیا اور یہاں صحت مند حزبِ اختلاف کے لیے کام کرنے کے مواقع بالکل ختم کر دیئے چونکہ محاذ رائے شماری ریاست کی منظم ترین جماعت ہے اور یہ جماعت حکمران ٹولے کی جمہوریت کش پالیسیوں کی سب سے بڑی نقاد تھی۔ اس لیے یہی جماعت سب سے زیادہ منتقمانہ کارروائیوں کا شکار ہوئی۔ میری گرفتاری انہی کارروائیوں کا شاخسانہ ہے۔

۲۔ جنوری 1971ء میں ''گنگا'' کے اغواء کے بعد پاکستان میں صدرِ آزاد کشمیر کے خلاف فضا خاصی خراب ہو گئی تھی۔ پاکستانی عوام جن سے المجاہد کے نام پر لاکھوں روپے کے چندے انہوں نے وصول کر رکھے تھے۔ سوال کرنے لگے کہ آخر وہ المجاہد فورس کہاں ہے۔ اسی دوران لاہور میں ایک پریس کانفرنس میں سردار عبدالقیوم خان کے کھوکھلے نعروں اور مصنوعی امیج (IMAGE) کو پاکستان اور کشمیر کے عوام کے سامنے حقیقی رنگ میں پیش کیا گیا۔ پریس کانفرنس میں جناب مقبول احمد بٹ کے ہمراہ مظہر بھی موجود تھا۔

اس پریس کانفرنس کے نتیجے میں اخبارات میں کافی لے دے شروع ہو گئی۔ اخبارات نے اداریے لکھے اور سردار صاحب کے فرضی دعوؤں کا مضحکہ اُڑایا گیا۔ بعد ازاں جب جناب اشرف قریشی اور جناب ہاشم قریشی کا میرپور اور ڈڈیال میں فقید المثال استقبال کیا گیا اور اس کے اعزاز میں جلسے کئے گیے تو ان جلسوں میں، میں نے نمایاں حصہ لیا۔ اور حکمران جماعت خاص طور پر صدرِ

پھن پھیلائے دیکھتے تھے۔ ڈوگرہ زمانے میں ان سیاسی قیدیوں کو جن سے ڈوگرہ حکمرانوں کو ذاتی انتقام لینا ہوتا تھا انہیں کٹھوعہ اور مظفر آباد بھیجا کرتے تھے۔

میرے احباب شکایت کرتے تھے کہ ''دلائی'' میں سانپ بہت ہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہمارے کمروں میں سانپ نہیں تھے بلکہ سانپوں کے مسکن میں ہمیں لایا گیا تھا۔ ایک روز میں اپنے کمرے کے برآمدے میں بیٹھا قرآن مجید پڑھ رہا تھا کہ میرے بالکل قریب دو سانپ چھت سے گرے جنہیں مارنے کی سنتری نے کوشش کی لیکن وہ کسی بل میں گھس گئے اور پھر وقتاً فوقتاً رونمائی کرتے رہے۔ سڑک کے کنارے واقع مسجد میں سنتریوں نے نماز پڑھنے کے لیے جانا اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ انہوں نے وہاں بہت بڑا اژدھا دیکھا تھا۔ پانی کے گھاٹ پر ایک سانپ مارا گیا۔ ایک اور سانپ ہمارے کمروں کے عقب میں مارا گیا۔ اسی طرح لنگر خانے کے متصل کمرے میں ایک سانپ مارا گیا۔ ایک اور سانپ وہاں بار بار دیکھا جاتا رہا۔ علوی صاحب کے کمرے، غسل خانے اور برآمدے میں کئی سانپ اکثر دیکھے گئے۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف اس روز ہوئی جب میرے دو ساتھی کال کوٹھری میں بند تھے۔ وہ دونوں ساتھی اپنی جوتیاں دروازے سے باہر رکھنے پر پابند تھے۔ اندر کوئی لاٹھی یا چھڑی نہیں رکھ سکتے تھے۔ عزیزم محمد رفیق ہائی سکول کا طالبعلم تھا۔ اور اپنے والد چوہدری محمد صادق کے ساتھ کمرے میں محبوس تھا، جسے مقفل کیا جاتا تھا۔ ایک روز دن دہاڑے کمرے میں سانپ آ گیا تو وہ دروازے کی سلاخوں سے چمٹ گئے سانپ کو جو بستر میں گھس گیا تھا۔ مارنے کے لیے سنتری کو چابیاں منگوانے میں کافی وقت لگا۔ اس پر میں نے کہا انہیں چارپائی دی جائے لیکن بعد میں مجھے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ اے۔ آئی۔ جی کی اجازت مل جانے پر بھی انہیں چارپائی نہیں دی گئی۔ میرے دیگر تمام ساتھی بھی جو کال کوٹھڑیوں میں بند رہے ہیں۔ انہیں چارپائیاں دینا تو درکنار، متعفن بوسیدہ اور کھٹملوں سے بھرے ہوئے کمبل دیئے جاتے رہے۔ ہم سات قیدیوں کے لیے ''دلائی'' کیمپ میں کل پندرہ پھٹے پرانے کمبل تھے۔

خوراک:

مجھے حبسِ بیجا کی درخواست کا علم درخواست دائر ہونے کے بعد ہوا۔ 26 اگست کو عدالت

وقت کے اے آئی جی نے کہا تھا کہ اب تم ''دلائی'' آنے کی جرأت نہیں کرو گے۔ تو میں نے جواباً کہا تھا کہ میں حق گوئی کی پاداش میں ہر وقت ''دلائی'' آنے کے لیے تیار رہوں گا۔ سال 1969ء میں ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں مظفر آباد آیا تو میرے ساتھ جناب ممتاز احمد ہاشمی تھے جو اب بھی میرے ساتھ جیل میں ہیں۔ انہوں نے ''دلائی'' میں رکنے کو کہا تا کہ اس قدیم اذیت گاہ کو دیکھ سکیں۔ ہم کار سے اترے اور گھوم پھر کر یہ جگہ دیکھی اس وقت یہ مقام تفتیشی مرکز نہ رہا تھا۔ میں نے اس وقت کہا تھا کہ میں نے تو یہاں آنے کا عہد کیا تھا۔ اب یہ مرکز ختم کر دیا گیا ہے۔ تو مجھے کہاں رکھیں گے لیکن 1971ء میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے کارکنوں اور راہنماؤں کے لیے یہ مرکز دوبارہ قائم کر دیا گیا۔ اور وحشت و بربریت کی تمام روایات از سرِ نو تازہ کی گئیں۔ یہ وہ جگہ ہے جس میں کشمیر کے بیشتر محبان وطن کو اذیت کا شکار بنایا گیا ہے۔

نازی جرمنی کے تعذیبی مراکز، پاکستان میں لاہور کا شاہی قلعہ، مقبوضہ کشمیر میں ستواری کیمپ اور مہتاب باغ کی طرح یہ بھی دنیا بھر میں بدنام ہو گیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ''دلائی'' میں کافی درخت موجود ہیں لیکن پنجاب کنسٹیبلری کے زمانے میں تمام پرندے وہاں سے چلے گئے تھے کیونکہ رات کو مظلوموں کے ساتھ تشدد ہوتا تھا۔ اور ان کی چیخیں سن کر پرندوں نے اپنے گھونسلے خالی کر دیئے تھے۔ جب ہم اسیروں کے لیے درِ زنداں کھلا تو اس وقت بھی وہاں کوئی پرندہ نہ تھا۔ بہت مدت ہم نے دعائیں مانگیں اور ریزرو پولیس کے جوانوں سے بھی دعائیں کرائیں۔ ہمارے آخری دور میں اب وہاں پرندے پھر آنے لگے تھے۔ ''دلائی'' کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہاں اے۔ آئی۔ جی کے حکم کے بغیر پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ ہم حیران ہیں کہ آج کل وہاں کوئل اور بلبل کی نغمہ سرائیوں پر اے۔ آئی۔ جی کا حکم کیوں نہیں چلتا۔

سانپوں کا مسکن

وطن عزیز کے اُس حصے کے رہنے والے جسے وادیٔ کشمیر کہتے ہیں، جب یہ سنا کرتے تھے کہ مظفر آباد میں مکان کی چھتوں میں سانپ پھرتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا تھا۔ اس تعجب کا اظہار میرے سامنے علوی صاحب نے اُس وقت کیا جب وہ روزانہ اپنے کمرے کی چھت میں سانپوں کو

طبی سہولتیں:

جناب غلام مصطفیٰ علوی کو دردِ دندان کی شکایت ہوئی، وہ دو ہفتے تک اس درد کے مارے تڑپتے رہے۔ حکام کو اطلاع دی گئی۔ ڈی سی اور ایس پی نے انہیں سی ایم ایچ لانے کی اجازت دے دی۔ لیکن اے آئی جی نے کوئی پرواہ نہ کی۔ جناب صوفی محمد زمان پیٹ کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ چار پانچ گھنٹے تک اس کرب میں مبتلا رہنے کے بعد انہیں چند روز کے لیے سی ایم ایچ لایا گیا۔ اور ماہر ڈاکٹروں کی ہدایات کے برعکس انہیں پھر ''دلائی'' پہنچا دیا گیا۔ جہاں وہ پھر بیمار رہے۔ جناب جی۔ ایم۔ میر اور جناب ممتاز احمد ہاشمی مسلسل کئی دنوں کی تکلیف دہ اور موذی مرض کے شکار رہے لیکن باوجود بار بار مطالبہ کرنے کے نہ تو انہیں ہسپتال لایا گیا اور نہ ہی کبھی کسی ڈاکٹر کو وہاں لایا گیا۔

گرفتاری کے تقریباً دو ماہ بعد اے۔ آئی۔ جی نے مجھے اپنے خرچ پر دودھ منگوانے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن چند دنوں بعد ایک سب انسپکٹر نے جو اپنے آپ کو بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کا وفادار سمجھتا تھا۔ مظفر آباد سے پیغام بھیجا کہ آئی۔ جی نے دودھ پر پابندی لگا دی ہے۔ میں حیران تھا کہ ڈاکوں، قاتلوں اور راہزنوں کو تو جیلوں میں بی کلاس دی جاتی ہے لیکن مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے اخراجات پر بھی دودھ منگوانے کی اجازت نہیں مل رہی۔ جیلوں میں قیدیوں کی عموماً تین کلاسیں ہوتی ہیں۔ جن میں سی کلاس سب سے ادنیٰ ہوتی ہے۔ لیکن ہم جس حالت میں تھے وہ سی کلاس کے قیدیوں سے بھی کئی درجے گری ہوئی تھی۔ عدالت عالیہ میں درخواست زیرِ سماعت آنے کے بعد ذاتی اخراجات پر کھانے پینے کی پابندیوں میں ہلکی سی کمی کر دی گئی تھی۔ لیکن ''دلائی'' جیسی غیر آباد جگہ پر ضرورت کی اشیاء کا حصول سہل نہ تھا۔ مجھے اور میرے ایک ساتھی کو اے۔ آئی۔ جی نے بکمالِ عنایت خسروانہ اپنے گھروں سے چارپائی منگوا کر استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر باقی سب ساتھی سانپوں اور بچھوؤں کے ساتھ اندھیری راتیں فرش پر لیٹ کر قیدِ تنہائی میں گزارتے تھے۔

اخبار:

گرفتاری کے بعد ایک ماہ تک مجھے کوئی چیز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کے بعد

العالیہ سے 2, اکتوبر کے لیے میری طلبی کا حکم ہوا اور وہاں کے انچارج کو بھی اطلاع مل گئی۔ اس سے قبل چار مہینے تک ہمیں دال کا بدمزہ شوربہ کھانے کو دیا جاتا رہا۔ افسر انچارج اسے دال کا نام دیتا تھا لیکن حقیقت میں یہ جلے ہوئے موبل آئیل کے رنگ کی ایک بے ذائقہ سیال شے ہوتی تھی۔ جس میں نمک، مرچ، گھی، مصالحہ جات اور دال کا دانہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہماری خوراک سے بہتر خوراک سپاہیوں کی تھی۔ وہ دو وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ دو بار چائے پیتے تھے اور ان کا خرچہ تقریباً بائیس روپے فی کس ماہانہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تناسب سے ہم پر کل پندرہ روپے فی کس ماہانہ سے زیادہ خرچ نہیں کیا جاتا تھا۔ آج تک سرکاری طور پر نہ ہمیں نہانے کے لئے اور نہ ہی کپڑے دھونے کے لیے صابن دیا گیا۔ پانچ مہینوں میں صرف دو مرتبہ ہمارے پیہم اصرار کے بعد ہمارے ہی خرچہ پر حجام کی خدمات حاصل کی گئیں۔

پانی:

ہم بارش کے انتظار میں رہتے تھے اور بارش کے وقت چھت کے پانی سے کپڑے دھونے کا کام لیتے تھے۔ میرے ملک کا فرات (دریائے جہلم) میرے قدموں کے نیچے بہہ رہا تھا۔ لیکن مجھے اس کے پانی کا قطرہ تک نصیب نہ ہوتا تھا۔ ہم دونوں کو صرف ایک گھڑا اور ایک بالٹی مہیا کی گئی تھی جس کا پانی ہمارے پینے اور وضو کرنے کے لیے ناکافی ہوتا تھا۔ اور پینے کا پانی بچا بچا کر وضو کے لیے استعمال کرتے تھے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ مکمل طور پر منقطع کر دیا گیا تھا۔ متاع لوح وقلم ہم سے چھین لی گئی تھی۔ اس پورے عرصے میں مجھے گھر سے آئے ہوئے خطوط میں سے ایک بھی نہیں دیا گیا۔ اور نہ ہی مجھے خط لکھنے کی اجازت دی گئی۔ ملاقات پر مجھے معلوم ہوا کہ بے شمار خطوط لکھے گئے ہیں جو مجھے نہیں ملے۔ میں نے اے آئی جی کو پیغام بھجوایا تھا کہ میں کچھ یادداشتیں لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن آئی جی نے یہ سہولت بہم پہنچانے سے انکار کر دیا۔ اس پورے عرصے میں صرف دو بار میرے عزیزوں کو مجھ سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اور وہ بھی ہفتوں کی تگ و دو کے بعد صدر حکومت کے حکم سے عمل میں آئی۔

تک بیت الخلا کی صفائی کا کوئی انتظام نہ کیا گیا اور شدید گرمی کی وجہ سے سڑاند پورے ماحول میں پھیل گئی تھی۔ ہمارے کمروں کے آگے صحن میں ایک درخت جواب بھی موجود ہے۔ جہاں اے آئی جی کی ہدایت کے مطابق سنتری کو کھڑا رہنا تھا۔ لیکن بیت الخلاء کے تعفن کی وجہ سے وہ وہاں کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ تقریباً دو ہفتوں بعد تفتیش کے لیے ایک ٹیم پہنچ گئی۔ انہوں نے ہمیں اس حال میں دیکھا کہ حجامت بڑھی ہوئی ہے جسم اور کپڑوں سے تعفن آرہا ہے تو انہوں نے پانی منگوا کر ہمیں غسل کرایا اور کپڑے تبدیل کرائے۔

تفتیش شروع ہوتے ہی میرے ساتھی جناب پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی پر جسمانی تشدد کا آغاز کر دیا۔ رات دن انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ جس وقت ان پر تشدد کیا جارہا ہوتا میرے کمرے کا دروازہ مقفل رکھا جاتا تا کہ میں انہیں آتا جاتا نہ دیکھ سکوں۔ لیکن میرے دروازے میں ایک سوراخ تھا جس میں سے اپنے ساتھی کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ لیتا تھا۔ واپسی پر ان کی چیخیں میرے کانوں میں پڑتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب میں بیت الخلاء جانے کے لیے ان کے کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو انہوں نے مجھے وصیّت کی کہ میری لاش میرپور دفنا دینا۔ اس وقت وہ بالکل نیم مردہ حالت میں تھے۔ علوی صاحب کو اپنے محبوب القدر راہنما جناب محمد مقبول بٹ، ہمارے جانباز اور سرفروش ساتھیوں جناب ہاشم قریشی اور جناب اشرف قریشی کے خلاف وعدہ معاف گواہ بنانے کے لیے وحشت اور بربریّت کے تمام حربے آزمائے گئے۔ اس نظر بندی کے دوران ہمارے قومی محاذ آزادی سے تعلق رکھنے والے بہت سے کارکنوں کو ''دلائی'' لایا جاتا رہا اور دن رات ان کی پٹائی ہوتی رہی۔ مجھے جب کمرے کے سامنے والے برآمدے میں اپنا بیان لکھنے کی اجازت ملی تو ساتھ والے کمرے میں پولیس کے 24 نمبر جوتوں، بیدزنی، مکہ زنی، ستم رسیدگان کی آہ وبکا اور دلدوز چیخوں کی آوازیں مسلسل آتی رہتی تھیں۔ اس عالم میں مجھے کھانا بھیجا جاتا تھا جو میں کھا نہیں سکتا تھا۔ ''دلائی'' سے پانچ مہینوں کے بعد مظفرآباد جیل منتقل کرتے وقت ہمیں یہ بتایا گیا کہ اس عرصے میں ہمیں آپس میں اس لیے بات چیت نہیں کرنے دی گئی تھی کہ اس سلسلے میں اے آئی جی صاحب نے خصوصی طور پر منع کر رکھا تھا ہم سب ساتھیوں کو 26 ستمبر کو ''دلائی'' سے مظفرآباد جیل منتقل کر دیا

میرے پیہم اصرار پر مجھے ذاتی اخراجات پر اخبار پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ اس کی تفصیل اس مرحلہ پر غیر ضروری سمجھتا ہوں لیکن میرے سوا میرا کوئی ساتھی اخبار نہیں پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی مجھے اخبار کسی کو دینے کی اجازت تھی۔ دلائی جیل سے مظفر آباد جیل لاتے وقت مجھ سے نہ صرف اخبارات واپس لے لیے گئے بلکہ ادویات تک چھین لی گئیں۔ میری جامہ تلاشی از سرِ نو لی گئی اور ایک ایک کپڑے کو دوبارہ ٹٹولا گیا۔

ریز رو پولیس:

سال 1960ء میں پنجاب کنسٹیبلری کو خصوصی طور پر ہماری نگرانی کے لیے بلایا گیا تھا۔ لیکن اس دفعہ آزاد کشمیر ریز رو پولیس کے جوان تعینات کیے گئے۔ تشدد انہوں نے بھی کیا فرق صرف اتنا ہے کہ یہ جوان تشدد کرنیکے بعد نادم و پشیمان ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی اور روزگار ملے تو اس ذلالت سے جان چھڑا لیں مجھے پہلی دفعہ یہاں پتہ چلا کہ ہماری ریز رو پولیس ایک عارضی محکمہ ہے اور ریٹائر ہونے پر انہیں پنشن نہیں دی جاتی۔

تشدد کی تفصیلات:

''دلائی'' پہنچانے کے بعد ہمیں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ چوبیس گھنٹے کمرے میں مقفل رہتے۔ جس کمرے میں مجھے رکھا گیا اس کے متعلق مشہور ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے افیون کھانے کے لیے یہ تاریک کمرہ خاص طور پر تعمیر کرایا تھا۔ دروازے کے مقفل ہونے کے بعد اس کمرہ میں دن کو بھی رات کا سماں ہوتا تھا۔ پہریداروں کے لیے ہدایات لکھی ہوئی تھیں کہ یہ قید مشتبہ گان ہے۔ یہ آپس میں اشارے کنائے یا کسی اور طریقے سے بات چیت نہ کر سکیں۔ دو دن بعد ہم سے تولیہ ٹوتھ پیسٹ۔ صابن وغیرہ تمام اشیا لے لی گئیں۔ اور متعلقہ افسران نے ہمیں یہ بتایا کہ اے۔ آئی جی کی خصوصی ہدایات یہ ہیں کہ ہم صرف ایک قمیض ایک پاجامہ پہنے رکھ سکتے ہیں۔ دو ہفتوں تک نہ پانی دیا گیا۔ نہ حجامت کرنے کی اجازت دی گئی اور نہ ہی کپڑے تبدیل کرنے دیئے گئے۔ شدید گرمی کے موسم میں پانی اتنا دیا جاتا تھا کہ ہم پانچ نمازیں بھی باوضو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے تھے۔ پندرہ دن

خواہ ہمیں ساری عمر جیل میں ہی کیوں نہ گزارنی پڑے۔ میں معزز عدالت کی وساطت سے حکومت اور اس کے حواریوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر ان کی یہ کارروائیاں غیر جمہوری اور متشددانہ نہیں ہیں، اور اگر ان کے پاس ہمارے خلاف کوئی رائی کے دانہ کے برابر مواد موجود ہے تو ہمارے خلاف عام قانون کے تحت کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ثابت کر دکھائیں گے کہ ہم آزادی پسند ہیں اور ہمارے مخالفین آزادی کے بدترین دشمن ہیں۔ اب آخر میں اپنے بیان کو اس آیت کریمہ پر ختم کرتا ہوں۔

يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ۔

(سورہ یونس، آیت 71)

"اے میری قوم اگر تم پر یہ بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لیے) کھڑا ہو کر اللہ کی نشانیوں کے ساتھ پند و نصیحت کرتا ہوں تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اُسے کر گزرو۔ تم اور تمہارے شریک کر گزرو۔ پھر مجھے ذرا بھر بھی مہلت نہ دو۔"

میرے صیّاد کو ہے حلقۂ زنجیر کی فکر
میں نے زِنداں سے رہائی کو ہے منشور کیا
(افضل ضیائی)

گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ "پھر یہاں آنا پڑے گا" اس لیے ہم آج بھی جو کچھ کہنا چاہتے ہیں زبان پر نہیں لا سکتے۔

میری حبسِ بے جا کی درخواست مجھ سے پوچھے بغیر دی گئی۔ میں خود حبسِ بے جا کی درخواست دینے کے حق میں کبھی نہیں رہا ہوں۔ میں ہمیشہ اس کا قائل رہا ہوں کہ جب حکومت کے انتقام کی آگ بجھ جائے گی وہ مجھے خود ہی چھوڑ دے گی۔ ورنہ عدالت عالیہ کے فیصلے کے بعد کسی دوسرے الزام میں گرفتار کرے گی۔ ایسا ہوتا رہا ہے اور مجھے اب بھی یاد ہے کہ جیل میں ایک ایسا قیدی موجود ہے جس کی میں نے بحیثیت وکیل پیروی کی تھی۔ عدالت عالیہ نے اسے چھوڑ دیا تھا لیکن وہ ابھی تک جیل میں مقید ہے۔ حبسِ بے جا کی درخواست کے مرحلوں پر نوکر شاہی یہ کرتی رہی ہے کہ سائل کو گرفتار کر کے پاکستان پولیس کے حوالے کر دینے کے بعد عدالتِ عالیہ یہ جواب دیتی رہی ہے کہ سائل کو حکومت نے آزاد کر دیا ہے۔ اور جب پاکستان پولیس کے خلاف پاکستان میں درخواستیں دی گئیں تو وہ گرفتار شدگان کو کوہالہ کے اس طرف آزاد کشمیر پولیس کے حوالے کرتی رہی۔ اور اس طرح قانون کے محافظ قانون کی دھجیاں اڑاتے رہے ہیں۔ اور یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی کہ جس نے حبس بے جا کی درخواست دی اسے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے جب عزیزی محمد صابر نے بتایا تھا کہ اس نے درخواست حبس بے جا دائر کر دی ہے تو میں نے اُسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اب اپنے آپ کو دیگر ساتھیوں کے ہمراہ گرفتاری کے لیے تیار رکھے۔ مجھے بھی تیار رہنا ہوگا۔ کہ اب یہ لوگ مجھے پاکستان پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ میرا کہنا درست ثابت ہوا اور عزیزی محمد صابر بھی معہ اپنے دیگر تین ساتھیوں کے جو متوقع گواہان تھے آج میرے ساتھ جیل میں عام قیدیوں کی طرح سزا کاٹ رہا ہے۔

اپنے ذاتی اور جماعتی نظریات، سیاسی سرگرمیوں، گرفتاریوں کا پس منظر اور نظربندی کے دوران ہم سے کئے گئے غیر انسانی سلوک کے اس اجمالی بیان کے بعد اپنا بیان ختم کرنے سے قبل میں حکومت پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جس جرم حق گوئی اور جذبۂ آزادی کی پاداش میں ہمیں گزشتہ کئی ماہ سے پابندِ سلاسل رکھا گیا ہے۔ ہم آئندہ بھی اس جرمِ آزادی کا برملا ارتکاب کرتے رہیں گے۔

اب بھی انسان کو انسان سزا دیتے ہیں

قیدِ تنہائی کے ماروں کا یہ محبوس جہاں
حال کے چہرے پہ ماضی کی جہالت کا نشاں
یہ لہو رنگ قبائیں، یہ ستم دیدہ اسیر
یہ صلیبیں، یہ سلاسل، یہ حصارِ زنداں
آئنے ہیں کہ جنہیں دیکھ کے ہر شخص کہے
آج بھی نیند میں ہے حضرتِ انساں کا ضمیر
آدمی اب بھی ہے ماضی کی لکیروں کا فقیر

ارضِ کشمیر کی محکوم فضاؤ! سن لو
خلدِ کشمیر کی مغموم ہواؤ! سن لو
اِک نئے دور کے خالق ہیں یہ بے جرم اسیر
تم بھی دولائی کے مغرور خداؤ! سن لو
اِک نئی صبح انہیں مل کے رہے گی آخر
ٹوٹ جائے گی ہر اِک پاؤں کی بوجھل زنجیر
جسم پر جبر نہ گفتار پہ ہو گی تعزیر

دلائی کیمپ

نذیر انجم

یہ وہ زِنداں ہے جہاں سچ کے پرستاروں کو
منزلِ شوق کے بے باک طلب گاروں کو
کلفتیں سہنے پہ مجبور کیا جاتا ہے
یہ وہ زِنداں ہے جہاں قوم کے غم خواروں کو
آمرِ وقت کی تائید و حمایت کا سبق
طوق و زنجیر کی صورت میں دیا جاتا ہے
یہیں انسان کے ہونٹوں کو سِیا جاتا ہے

صورتِ غار یہ بوسیدہ و تاریک مکاں
جس میں محصور یہ پابندِ سلاسل انساں
رودِ جہلم کی زبانی یہ صدا دیتے ہیں
آدمیت کا لہو آج بھی بہتا ہے یہاں
آج بھی سطوتِ شاہی کی بقا کی خاطر
حکمراں اپنی رعایا کو مِٹا دیتے ہیں

آپ نے دورانِ سماعت عدالت العالیہ آزاد کشمیر میں جو تاریخی بیان دیا۔ اُسے 3 اکتوبر 1971ء کو محاذ رائے شماری نے سخن فیصل کے عنوان سے میر پور سے شائع کیا۔ کیس سے رہائی پانے کے بعد آپ محکمہ پی ڈبلیو ڈی میں بحیثیت کنٹریکٹر کام کرتے رہے۔ وہ محاذ اور این ایل ایف کے پلیٹ فارم سے مقدور بھر سعی کرتے رہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے والد کے تبلیغی مشن کو علاقہ گلگت بلتستان میں جاری رکھا۔ آپ 2005ء کو روٹ پرمٹ کے ذریعے چکوٹھی جنگ بندی لائن کراس کر کے بھارتی مقبوضہ کشمیر گئے جہاں اب سری نگری میں انہوں نے مستقل رہائش اختیار کر لی ہے۔

پیرزادہ غلام مصطفےٰ علوی صاحب کے سیاسی نظریات کی عکاسی ان کے اِس بیان سے ہوتی ہے:

''کشمیر کشمیریوں کا ہے اور وہی کشمیر کے مستقبل کا آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ماحول میں فیصلہ کریں گے۔ ہندوستان کے لیڈر مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی یا راہنما اور اس طرح پاکستان کے لیڈر آزاد کشمیر کی اسمبلی یا راہنما کشمیریوں کو اعتماد میں لئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے اور اگر ایسا کیا گیا تو محاذ رائے شماری اس اقدام کی سخت مزاحمت کرے گا۔ میری آرزو ہے کہ پاکستان قائم رہے اور مضبوط و مستحکم بھی ہو۔ کشمیریوں کی آزادی کا راز مضبوط پاکستان میں مضمر ہے۔ میں پاکستان کے عوام اور لیڈروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آپس کے تنازعات ختم کر کے پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنانے کی جدوجہد کریں۔''

(بحوالہ ہفت روزہ ''جہاں نما'' لاہور
شمارہ نمبر 21 مطبوعہ 15 مئی 1975ء)

پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی

پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی سری نگر کے ایک روحانی و علمی خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے والد محترم پیر غلام احمد علوی مریدین کا وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ علاقہ استور اور گلگت بلتستان میں وہ کئی پشتوں سے تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کیلئے خدمات سرانجام دیتے چلے آ رہے ہیں، علاقہ گریز میں عیسائی مشنریوں کے مذموم عزائم کو انہوں نے خاک میں ملا دیا تھا۔

پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی کی ابتدائی تعلیم و تربیت سری نگر میں ہی ہوئی۔ انہوں نے سنِ شعور میں قدم رکھا تو اپنے آس پاس سیاسی کشمکش اور افراتفری کا ماحول پایا۔ چنانچہ ماحول سے اثر لیتے ہوئے وہ بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ تقسیم کشمیر سے قبل وہ نیشنل کانفرنس سے وابستہ تھے۔ 1953ء میں شیخ عبداللہ کی معزولی کے سبب آپ کو بھی کئی دفعہ انوسٹی گیشن سنٹرز میں نظر بند رہنا پڑا۔ 1965ء کی جنگ کے دوران وادی کشمیر کے جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر پاکستان کی حمایت کی ان میں پیرزادہ صاحب بھی شامل تھے۔ چنانچہ حکومت نے پاکستان کی حمایت کے جرم میں جب آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے تو آپ سرحد پار کر کے آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ آپ چونکہ حریت پسندانہ ذہن اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے لہٰذا یہاں آ کر آپ نے تمام سیاسی جماعتوں کے منشور اور پروگرام کا بغور جائزہ لیا چنانچہ محاذ رائے شماری کا منشور پسند آنے پر آپ محاذ رائے شماری میں شامل ہو گئے۔ آپ محاذ کے عسکری ونگ این ایل ایف کے ساتھ بھی کام کرنے لگے۔ 30, جنوری 1971ء کو جب اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے سری نگر سے بھارتی طیارہ گنگا اغوا کیا اور اسے لاہور ایئر پورٹ پر نذرِ آتش کیا تو بدبخت یحییٰ خان کے ایماء پر جب ہائی جیکروں اور محاذ کے راہنماؤں کو گرفتار کیا گیا تو آپ کو بھی گرفتار کر کے دلائی کیمپ مظفر آباد میں جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

کرنا پڑا۔ 1965ء کے دوران مقبوضہ کشمیر میں بھارتی قابض حکومت کے خلاف جو مسلح اور منظم جدوجہد شروع ہوگئی تھی اس میں ابتدا سے لے کر آخر تک میں نے کیا کیا خدمات سرانجام دیں۔ ان کی کچھ تفاصیل میں یہاں پر اپنی Interogation کے دوران متعلقہ افسران کو قلمبند کرا چکا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ ساری تفصیل بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں اس عدالت کے سامنے بیان نہیں کرسکوں گا کیونکہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں گوریلا سرگرمیوں اوران کی تیاریوں کا باقاعدہ آغاز اگرچہ اگست کے اوائل میں ہوا۔ لیکن تحریک کا آغاز اس سے دو تین ماہ قبل ہو چکا تھا۔ ریاست کے اندر اس تحریک کے سرکردہ ذمہ دار افراد سے مجھے قریب ترین رابطے اور اعتماد کا فخر حاصل تھا۔ کشمیر کی دونوں سیاسی تنظیموں، محاذ رائے شماری اور عوامی مجلسِ عمل میں مجھے سرگرم رکن کی حیثیت سے دونوں تنظیموں کے سربراہان جناب محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد فاروق صاحب کے قریبی ساتھی ہونے کا افتخار حاصل رہا۔ پروگرام کے تحت جولائی کے مہینے میں حکومت کے خلاف راست اقدام کی تحریک شروع ہوئی۔ 13 جولائی کو مزار شہدا پر وزیر اعلیٰ جی۔ ایم صادق اور صدر کانگرس میر قاسم کے خلاف موثر مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ وادی میں خفیہ طور پر فریڈم فائٹرز کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس تنظیم کے اراکین کو قرآن خوانی کے بہانے وقت سے پہلے ہی مزار شہدا پر پہنچایا گیا۔ وزیر اعلیٰ جی ایم صادق اور میر قاسم مزار پر آئے تو انہیں کسی طرح وہاں پہنچنے سے پہلے ہی متوقع مظاہرہ کی اطلاع مل گئی اور وہ اپنی کار کو چھوڑ کر بھاگ گئے جسے مظاہرین نے بعد میں تباہ کردیا۔

13, جولائی سے راست اقدام کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ پروگرام کے تحت پانچ پانچ، دس دس افراد نے دفعہ 144 کو توڑ کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنا شروع کردیا۔ اس تحریک کا مقصد ریاست کے اندر حکومت کے خلاف عام بے چینی پیدا کرنا تھا کہ 9, اگست کو جو کہ مسلح اقدام کے لیے یوم آغاز طے پایا تاکہ بغاوت ہوتے ہی ساری ریاست میں نظم ونسق درہم برہم ہوجائے۔ اور اس طرح کمانڈوز کے لیے فضا سازگار ہوجائے۔ اس دوران فریڈم فائٹرز کی طرف سے قدِ آدم پوسٹروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان پوسٹروں نے ریاست میں آگ بھڑکا دی۔ دو پوسٹر جن میں سے

عدالتی بیان

(سخنِ فیصل)

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔

ترجمہ۔ مسلمانو۔ ایماندارو! خدا کے خوف سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھی بنو!۔

مرا زیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
وگر دم را کشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

قبل ازیں اس کے کہ میں اس مقدمہ کے بارے میں اپنی صفائی میں ان وجوہات کا بیان کروں جن کی وجہ سے حکومتِ وقت نے مجھے انتقامی جذبے کے تحت گزشتہ پانچ ماہ کے عرصہ سے رسوائے زمانہ دلائی کیمپ جیل میں محبوس کر رکھا ہے۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے وہ پسِ منظر عدالت کے نوٹس میں لاؤں جس کی بناء پر مجھے 1965ء میں اپنے آبائی گھر کو خیر باد کہہ کر آزاد کشمیر میں پناہ لینی پڑی تھی۔

میرا تعلق سری نگر کے ایک معزز علوی خاندان سے ہے۔ میں اپنے خاندان کی کشمیر میں تبلیغی اور دینی خدمات کا تفصیلی ذکر اور سیاسی خدمات کی روئیداد بتاؤں جو میں نے اور میرے خاندان نے 1931ء سے اب تک اپنے وطن کی آزادی کے لیے سرانجام دیں تو ایک لمبی داستان بن جائے گی۔ میں اس عدالت کا وقتِ عزیز ان تفاصیل میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے اپنے بیان کے اس حصہ کو اپنی 1965ء کی سرگرمیوں تک محدود رکھوں گا۔ جن کی بناء پر مجھے وہاں سے ترکِ وطن

آسودہ حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ والدین کا سایہ سر پر قائم تھا۔ بھائی اور بہنیں اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر آباد ہو چکے ہیں۔ میرے بھائی ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کے لیے لندن جا چکے تھے۔ میری دو بہنیں ایم۔ اے کر چکی تھیں۔ سب سے چھوٹی بہن ایم بی بی ایس میں داخل ہو چکی تھی۔ میرے اپنے بچے تسلی بخش طور پر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس لیے میرا گھر سے ہجرت کر کے یہاں آنا کسی ذاتی طمع یا لالچ کی بنا پر نہ تھا۔ مجھے اپنے معمر والدین اپنے بہن بھائیوں اپنے بچوں اور اپنے آسودہ حال گھرانے کو محض اس لیے چھوڑ دینا پڑا تھا کہ ساری عمر بھارتی سامراج کی مخالفت میں گذری تھی اور 1965ء کی سرگرمیوں کی بناء پر میرا وہاں رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔ مجھے محض رضا الٰہی کی خاطر اور اپنے وطن عزیز کی محبت میں یہ سب کچھ کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ میری یہ حقیر سی قربانی ان عظیم قربانیوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو اب تک کشمیر کے ہزاروں محبانِ وطن گزشتہ چالیس سال سے پیش کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے وطن کی آزادی کی راہ میں جانی و مالی قربانیاں پیش کر کے آنے والوں کے لیے ایک راستہ کا تعین کیا۔ اس راہ پر چلنا اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرنا عین سعادت ہے۔

آزاد نے کہا ہے۔

گلشنس پیٹھ راج کرنک حق چھوتمنی بلبلن
یم گٹن منز گاش ہاوان آس پنہٕ نی زال زال

میں نے یہ تکالیف اس لیے برداشت نہ کی تھیں کہ مجھے کسی انعام کی طمع تھی۔ میرا انعام تو وہ طمانیت قلبی تھی جو ان خدمات کو سرانجام دینے سے حاصل ہوئی تھی۔

یاقوم لا اسئلکم علیہ مالاً ط ان اجری الا علی اللہ

(سورہ ہود، آیت 11)

لیکن مجھے یہ توقع بھی نہ تھی کہ جب میں غیروں کے چنگل سے نکل کر اپنوں میں آؤں گا تو مجھے ''بھارتی ایجنٹ'' جیسے مذموم الزام سے نوازا جائے گا۔ افسوس ہے کہ:

ایک کا عنوان ''مجلسِ عمل یا افیون سازی کا کارخانہ'' عوام کے لیے لمحہ فکریہ اور دوسرے کا '' مجھے بھی پڑھیے'' تھا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی چھپائی اور تقسیم وغیرہ کا سارا اہتمام میری نگرانی میں ہوا تھا۔ ان کے نیچے ''فریڈم فائٹرز'' کا نام درج تھا چنانچہ ''فریڈم فائٹرز'' کی تلاش ساری وادی میں زور و شور سے شروع ہو گئی۔ اسی دوران وہاں کے ایک بزرگ راہنما کی ہدایت پر مجھے کمانڈو تحریک کے ایک مرکزی سیاسی لیڈر کو اپنے گھر میں پناہ دینا پڑی۔ وہ میرے گھر میں اس وقت تک روپوش رہے جب تک کہ ان کا وہاں رہنا بھی مخدوش نہیں ہو گیا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ کمانڈو سرگرمیوں کے آغاز کے لیے 9 اگست کا دن (جو کہ جناب شیر کشمیر کی 1953ء میں برطرفی اور گرفتاری کی وجہ سے ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے) مقرر تھا۔ چنانچہ 9 اگست کو سری نگر سے ''فریڈم فائٹرز'' کی طرف سے پچاس کے قریب موٹر گاڑیوں کا بندوبست اس غرض سے کیا گیا کہ انہیں 8 اگست کو ان میں ڈال کر گلمرگ، گاندربل اور بانڈی پور وغیرہ علاقوں میں خفیہ طور پر بھیج دیا جائے تاکہ اگر ''کمانڈوز'' کو ان گاڑیوں کی ضرورت پڑے تو انہیں دقت نہ ہو۔

لیکن اتفاق سے گوریلا کمانڈوز کی ساری اسکیم قبل از وقت فاش ہو گئی۔ اور بھارتی افواج نے فوراً ہی ساری آبادی کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ ہمارے ساتھیوں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ 9 اگست کو مجھے ساتھیوں کے مشورہ پر ''انڈر گراؤنڈ'' ہونا پڑا۔ ''انڈر گراؤنڈ'' ہو کر بھی میں نے تحریک کا کام برابر جاری رکھا۔ ساتھیوں کی گرفتاریاں جاری تھیں۔ میرے اپنے لڑکے وجیہہ احمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اکتوبر کے آخر تک میں وادی کے اندر ہی مختلف مقامات پر خفیہ کام کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد چند ایسے ساتھیوں کی گرفتاری کی وجہ سے جو میرے اتا پتہ (Whereabouts) سے باخبر تھے اور ان پر میری وجہ سے تشدد بھی کیا جاتا تھا۔ مجھے آخر کار اپنے گھر کو چھوڑ کر آزاد کشمیر میں پناہ لینا پڑی۔ میرا وہاں سے نکل جانا یوں بھی ضروری ہو گیا تھا۔ کیونکہ اگر میں گرفتار ہو جاتا تو ریاست کے بہت سے معزز اور مقتدر راہنماؤں کے علاوہ سیکڑوں مخلص کارکنوں کی گرفتاری لازمی تھی۔ یہاں ایک بات کا تذکرہ کروں گا کہ میں اپنے گھر میں خدا کے فضل و کرم سے

بڑھتی رہے اور یہاں ان لیڈران کرام کو حلوے مانڈے میسر آتے رہیں۔ ایک واقعہ کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ پنڈی پہنچنے کے چند دنوں بعد میں حضرت قبلہ میر واعظ کشمیر جناب محمد یوسف شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں سلام کرنے حاضر ہوا۔ ان سے اپنا تعارف کرایا۔ تعارف اس لیے کرانا پڑا کہ 1965ء کی ''کمانڈوز'' سرگرمیوں کی وجہ سے جب میں نے سرینگر سے بھاگنے کا قصد کیا تو حلیہ تبدیل کرنے کے لیے مجھے اپنی داڑھی منڈوانی پڑی تھی۔ حالانکہ میں نے ابتداء ہی سے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے مجھے اسی حال میں دیکھا تھا۔ لیکن پھر دوبارہ گلے ملے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا:

> ''آپ لوگوں کی مثال اُن افیونیوں کی ہے، جوڈل کی سیر کو گئے تھے۔ ایک چرسی چاولوں کی دیگ نچوڑنے کے لیے کشتی کے کنارے پر گیا۔ دیگ ہاتھ سے چھوٹ گئی اور جھیل میں ڈوب گئی۔ چرسی نے اوپر سے چھلانگ لگا دی تیرنا جانتا نہیں تھا ڈوب گیا۔ دوسرا چرسی آ گیا۔ اس نے خیال کیا کہ پہلا پانی کے نیچے چاول کھانے لگا اور ہم کو فاقے رکھا۔ اس نے بھی چھلانگ لگا دی اور ڈوب گیا۔ تیسرا آیا اور خیال کیا کہ انہوں نے اتفاق کر لیا اور پانی کے نیچے ہی کھانے لگے۔ اس نے بھی چھلانگ لگا دی اور ڈوب گیا۔''

قبلہ میر واعظ کی یہ تمثیل کسی وضاحت کی محتاج نہ تھی۔ اس تمثیل نے میری سوچ کا انداز بدل دیا تھا۔ میرے ذہن کے دریچے وا کر دیئے تھے۔ اور غالباً اسی معمولی واقعہ نے اس طرف کی سیاست کا گہرا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔

نہایت دکھ کے ساتھ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہاں کے بیشتر سیاستدان خود غرض، مفاد پرست اور اقتدار کے بھوکے تھے۔ ان کی منزل مقصود آزادیٔ کشمیر نہ تھی بلکہ آزاد کشمیر کے ڈیڑھ ضلعوں کی صدارت تھی۔ چوبیس سال کا عرصہ ایک مصروفِ جدوجہد قوم کے لیے کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ریاست کا چونتیس ہزار مربع میل علاقہ بھارتی سامراج سے آزاد کرایا جا چکا تھا۔ قدرت کی طرف سے ہر قسم کے مواقع موجود تھے۔ جغرافیائی حالات نہایت سازگار تھے۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

(اقبال)

سرینگر سے روانہ ہوتے وقت وہاں کے ایک معزز راہنما نے، جن کو پاکستانی حکمران حلقوں میں خاصا اعتماد حاصل تھا۔ مجھے جناب اے۔ بی اعوان کے نام ایک تعارفی رقعہ دیا تھا۔ چنانچہ آزاد کشمیر پہنچتے ہی جب میں نے متعلقہ فوجی حکام کو وہ رقعہ دکھایا اور اپنا مختصر تعارف کرادیا تو انہوں نے فوراً وائرلیس پر حکام بالا کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ جہاں سے انہیں ہدایت ہوئی کہ مجھے باعزت طریقے سے راولپنڈی پہنچایا جائے۔ راولپنڈی پہنچ کر میری ملاقات محکمہ انٹیلی جینس کے اعلیٰ حکام سے کرائی گئی۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد مجھے پھر مظفر آباد بھیجا گیا۔ راولپنڈی قیام کے دنوں میں انٹیلی جینس کے اعلیٰ حکام نے مجھے وزارتِ امورِ کشمیر کے اعلیٰ حکام سے ملاقات کرائی۔ اور بریگیڈیئر حبیب الرحمان صاحب ڈپٹی سیکرٹری نے مجھے ایک سفارشی اور تعارفی خط بھی صدر آزاد کشمیر کے نام لکھ کر دیا۔ جنہوں نے یہاں پہنچ کر میری ابتدائی امداد کے علاوہ کرائے پر لے کر مکان کا بھی انتظام کرایا۔ لیکن چونکہ میں مفت خور بننا نہیں چاہتا تھا میں نے ساتھ ہی سینئر سیکرٹری صاحب سے ملاقات کر کے محکمہ تعمیراتِ عامہ میں بحیثیت ٹھیکیدار کے نام درج کرا کے اپنا کام کاج شروع کر دیا۔

یہاں کے سیاسی حالات اور یہاں کی سیاسی جماعتوں کی اصلیت سے وادی کے لوگ عام طور پر بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ریڈیو پروپیگنڈا، سیاسی راہنماؤں کے بلند بانگ دعوؤں اور اخباری بیانات سے بڑی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی آزاد کشمیر اور پاکستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں جو تصور تھا وہ عام طور پر سنی سنائی باتوں اور ریڈیو پروپیگنڈا وغیرہ کے نتیجے میں تشکیل پایا تھا۔ یہاں آ کر تھوڑے ہی عرصہ میں مجھ پر حقیقت حال واضح ہونی شروع ہوگئی۔ یہاں کی سیاست کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان نام نہاد راہنماؤں کے کھوکھلے نعروں اور بلند بانگ دعوؤں کا مقصد صرف اور صرف یہی ہوتا ہے کہ وادی میں عوام الناس دھوکہ کھاتے رہیں۔ بھارت کے خلاف نہتے عوام اپنے سر کٹواتے رہیں۔ وہاں بے چینی

میرے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ اکثر و بیشتر جیل جانے کا اتفاق ہوا۔ غلام قادر گاندر بلی اور اس کا عملہ اپنی سفاکی کے لیے خاصا بدنام تھا۔ لیکن ''دلائی'' میں جو کچھ میرے ساتھ گزری ہے اسکے بیان کرنے کا مجھے یارا نہیں۔ اپنے ہی ملک کے ایک حصے میں جرم بے گناہی میں مجھ پر جو ظلم وستم روا رکھا گیا اس کی توقع تو کسی بدترین دشمن سے بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ تشدد کی ابتدا تو 28, اپریل کو ہی ہوئی جبکہ میری گرفتاری سے قبل میرے مکان پر چھاپہ ڈال کر خانہ تلاشی لی گئی۔ پولیس کی بھاری جمعیت کے ذریعے سارے محلے کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ سارے شہر میں خوف وہراس کی فضا قائم کی گئی۔ تیس کے قریب پولیس کے نوجوانوں اور درجن بھر افراد کے ساتھ اے آئی جی صاحب کی فوج اس طرح میرے گھر پر حملہ آور ہوئی تھی جیسے یہ میرا گھر نہیں بلکہ دشمن کا کوئی خطرناک مورچہ ہے۔ تلاشی صبح کے چار بجے سے شروع ہو کر رات کے آٹھ بجے تک جاری رہی۔ مکان کا کونہ کونہ چھان مارا گیا۔ میرے تمام نجی کاغذات وغیرہ قبضہ میں لے لیے گئے۔ اس روز مجھے اپنی قوم کی بدنصیبی پر رونا آیا۔ حدِ متارکہ جنگ کے اس طرف کوئی حق کی بات کرے تو پاکستان کا ایجنٹ قرار پائے۔ اور حدِ متارکہ جنگ کے اس طرف کوئی حق مانگے تو بھارت کا ایجنٹ کہلائے۔ مرحوم سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ ''ٹیٹوال کا کتا'' عرصہ ہوا کہیں پڑھا تھا۔ اس افسانے کا مفہوم ایک تصویر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ابھی پانچ سال قبل ہی کی بات ہے کہ مجھے اپنے آبائی گھر سے صرف اس لیے ہجرت کرنا پڑی تھی کہ وہاں پر حریت پسندانہ سرگرمیوں کی وجہ سے بھارتی حکومت مجھے پاکستانی ایجنٹ قرار دے رہی تھی اور میری گرفتاری کے درپے تھی۔ اب پانچ سال بعد وطن عزیز کے اس حصے میں پاکستانی نوکر شاہی کے گماشتے مجھے بھارتی ایجنٹ اور جاسوس ظاہر کر کے میرے لیے دار ورسن کا سامان کر رہے تھے۔

''دلائی'' لے جا کر مجھے ایک کمرے کے اندر مقفل کر دیا گیا۔ مسلسل پندرہ یوم تک اسی طرح قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ میرے برابر والے کمرے میں رفیقِ محترم جناب عبدالخالق صاحب انصاری میری ہی طرح مقید تھے۔ خوف ودہشت کی فضا جو ہماری گرفتاریوں کے وقت بڑے اہتمام سے قائم کی گئی تھی۔ ہمارے ساتھ ساتھ جیل میں بھی قائم رہی۔ ''دلائی کیمپ'' کے اسٹاف کو سختی سے

عوام کے قلوب جذبۂ حریت سے لبریز تھے۔ پاکستان جیسا ہمدرد ملک امداد پر ہر وقت آمادہ تھا۔ آزاد کشمیر کو ایک ''بیس کیمپ'' بنایا جا سکتا تھا اور اس بیس کیمپ سے بھارتی سامراج پر کاری ضرب لگا کر کشمیر سے نکلنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا لیکن لیڈروں میں خلوصِ نیت کا فقدان تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ قوم کو ایک مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی کشمیر پالیسی میں خامیاں موجود تھیں لیکن اصل خرابی یہاں کے کشمیری سیاسی راہنماؤں میں تھیں۔ وہ آپس میں متحد نہ تھے۔ اگر ان میں اتفاق ہوتا تو پاکستان کی پالیسی میں صحت مند تبدیلی لائی جا سکتی تھی۔ آزاد کشمیر کی اقتصادی بدحالی اور گلگت و بلتستان کے عوام کی زبوں حالی نے بھی مجھے بڑا متاثر کیا۔ ان چوبیس برسوں میں تو اس علاقہ کی قسمت بدل جانی چاہیے تھی۔ لیکن کسی پارٹی اور کسی لیڈر نے دردمندی کے ساتھ ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس دوران میری ملاقات یہاں پر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کے راہنماؤں سے ہوئی۔ میں نے اس جماعت کا آئین اور دیگر لٹریچر دیکھا، ان سے طویل بحثیں ہوئیں اور دوسری جماعتوں کے جغادری لیڈروں کے کردار کے مشاہدہ پر مبنی تاثرات ختم ہو گئے اور ''محاذ'' کے کارکنوں کی بے لوث جدوجہد کا اعتراف کرنا پڑا۔ اس جماعت کے پروگرام نے مجھے متاثر کیا اور میں 1967ء میں محاذ رائے شماری میں شامل ہو گیا۔ 1969ء میں محاذ رائے شماری کے عسکری بازو قومی محاذ آزادی میں عملاً حصہ لینا شروع کیا۔ اور گرفتاری کے وقت تک میں محاذ رائے شماری کے سیاسی اور عسکری دونوں بازوؤں کے سرگرم رکن کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتا رہا۔

اب میں اس معزز عدالت کے سامنے اپنی اسیری کی روح فرسا داستان کا کچھ حصہ اور اپنی گرفتاری کا پس منظر بیان کروں گا۔ میری گرفتاری 28 اپریل 1971ء کو عمل میں آئی۔ گرفتاری کے فوراً بعد مجھے ''دلائی کیمپ'' میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں تقریباً پانچ ماہ تک قید تنہائی کاٹنے کے بعد 26 ستمبر کو مظفر آباد ڈسٹرکٹ جیل میں لایا گیا۔ ان پانچ مہینوں کی اسیری کی روئیداد نہایت ہی دلدوز، جگر سوز اور روح فرسا ہے۔ میں نے رسالوں اور کتابوں میں نازی جرمنی، اسرائیل اور بعض دیگر ممالک میں قیدیوں پر کئے جانے والے مظالم کی داستانیں پڑھی تھیں۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مجھے

پروانہ کی گئی۔

میری گرفتاری کے دو ہفتے بعد تفتیش کا آغاز ہوا۔ شروع شروع میں تمام استفسارات کا دیانتداری سے جواب دیتا رہا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ تفتیش کا مقصد حقائق معلوم کرنا نہ تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ قومی محاذِ آزادی کے راہنماؤں کے خلاف سلطانی گواہ تیار کئے جائیں۔ مجھ سے یہ کہا گیا کہ میں جناب محمد مقبول بٹ کے خلاف سلطانی گواہ بن جاؤں۔ میرے انکار پر مجھ پر تشدد کا آغاز ہوگیا۔ جو کہ ڈیڑھ ماہ تک جاری رہا۔ مختلف طریقوں سے مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی گی۔ بات بات پر مجھے انتہائی فحش گالیاں دی جاتیں۔ میری داڑھی کو کھینچا جاتا۔ مجھے طرح طرح کی دھمکیاں دی جاتیں۔ ان حربوں سے جب اُن کی تسلی نہ ہوئی تو جسمانی تشدد پر اُتر آئے۔ کبھی مجھے تھپڑ، لاتیں اور گھونسے مارے جاتے۔ کبھی ڈنڈوں سے زدوکوب کیا جاتا۔ کبھی فرش پر لٹا کر زدوکوب کیا جاتا۔ کبھی ٹھوکریں ماری جاتیں۔ اور یہ سلسلہ رات کے دو بجے تک جاری رہتا۔ بارہا اس مار پیٹ سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ میری صحت اس تشدد سے بالکل جواب دیتی جارہی تھی۔ اور مجھے اپنی موت بالکل قریب نظر آرہی تھی۔ باہر کی دنیا سے تعلق بالکل منقطع تھا اور میں سمجھتا تھا کہ اس تشدد کے نتیجہ میں میری موت واقع ہوگئی تو کسی کو خبر بھی نہ ہوسکے گی۔ بہرحال میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اپنی جان دے دوں گا لیکن جھوٹا بیان دے کر اپنے محبوب ساتھیوں کے خلاف سلطانی گواہ بننا کبھی گوارا نہ کروں گا۔

اسی دوران میں نے ایک بار اپنے محترم ساتھی جناب انصاری صاحب سے کہہ دیا تھا کہ میری موت کے بعد میری میت کو میرپور لے جاکر سپردِ خاک کریں۔ میری گرفتاری سے قبل ایک واقعہ پیش آیا۔ جواب تک ایک معمہ ہے۔ ہمارے قومی محاذِ آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے مختلف اعلیٰ حکومتی سیاسی حلقوں کے اشتراک سے تیار کردہ گہری سازش نظر آتی ہے مجھے ایک شخص علی شیر نے جس کا نام مجھے ''دلائی'' میں جاکر معلوم ہوا۔ مبینہ طور پر وادی کشمیر کے ایک آدمی کا خط لاکر دیا۔ اس شخص (علی شیر) کے اتا پتہ کا مجھے علم نہیں ہے۔ کون ہے کہاں سے آیا تھا۔ میں اس مرحلے پر اس شخص کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگرچہ میں نے پولیس کو دورانِ تفتیش وہ نام بتا دیا ہے، مجھے علم نہیں

تاکید کی گئی کہ ہم سے کوئی بات نہ کرے۔ ہمیں آپس میں بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کمرے کے باہر ایک گتے پر ایک نوٹس لکھ کر سنتریوں کی ہدایت کے لیے لگایا گیا تھا جس پر لکھا گیا تھا کہ محبوسین مشتبہ افراد (Suspects) ہیں۔ چنانچہ وہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتے رہے جو ہدایت نامے کے تحت ان سے متوقع تھا۔ پندرہ دنوں کی اس قید تنہائی کے دوران حجامت بنانے، کپڑے دھونے یا غسل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مئی کا مہینہ تھا اور وہاں شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ پینے کے پانی تک کا وہاں کال تھا۔ اگر کسی چیز کی وہاں ریل پیل تھی تو وہ سانپ اور بچھو تھے کمروں اور چھتوں میں سانپ اس طرح دندناتے پھرتے تھے، جیسے گھر کے مالک تو وہی ہوں۔ اور ہم اسیران بن بلائے مہمان سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ یہ تو اللہ کا ہم پر کرم تھا کہ اندھیرے کمروں میں ان زہریلے ہم جلیسوں کے ساتھ ہم نے پانچ ماہ گزارے اور زندہ رہے۔

غذا کے نام پر ان پانچ مہینوں کے دوران جو کچھ ہمیں دیا جاتا رہا اس کے لیے میں کوئی اصطلاح استعمال کرنے سے قاصر ہوں۔ سالن کے نام سے جو چیز دی جاتی تھی افسر انچارج اُسے دال کہتا تھا۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک بے مزہ شوربہ سا ہوتا تھا جس میں نمک مرچ مصالحہ اور گھی نام تک کو نہ ہوتا تھا۔

بسا اوقات مجھے جو چاول کھانے کو ملتے ان پر بھی شوربہ نما سیال ڈال دی جاتی تھی۔ پھر میں چاولوں پر ہاتھ رکھ کر پلیٹ میں سے پانی نچوڑ دیتا اور پھر چاول کھاتا تھا۔ آخری دنوں میں اپنے خرچ پر کچھ خوردنی اشیاء باہر سے منگوانے کی اجازت مل گئی تھی لیکن حالت یہ تھی کہ اگر کوئی چیز منگوائی بھی گئی تو تین چوتھائی راستے ہی میں غائب ہو گئی اور مشکل سے ایک چوتھائی ہم تک پہنچی۔ ایک مثال ثبوت کے طور پر کافی ہو گی۔ شہر سے میر ہدایت اللہ صاحب کے فرزند ہمارے لیے کلچے لے کر آئے جن کی تعداد چونسٹھ تھی۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا لیکن ہم تک صرف پندرہ کلچے پہنچے باقی خورد برد ہو گئے۔ طبی سہولتوں کا یہ عالم تھا کہ پانچ ماہ کے دوران وہاں کسی ڈاکٹر کا گزر نہیں ہوا۔ ایک بار میں دانت کے درد میں پورے دو ہفتے تک تڑپتا رہا لیکن کسی کو میرے حال پر رحم نہ آیا۔ باوجود اس کے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب اور ایس پی صاحب نے مجھے ہسپتال لے جانے کا حکم دیا تھا، اس حکم کی بھی کوئی

ہو۔ میری حالیہ گرفتاری اور نظر بندی موجودہ حکومت اور حکمران پارٹی کی منتقمانہ کارروائیوں کا ایک حصہ ہے۔ جس کی فوری وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ میرے ''محاذ'' میں شامل ہونے سے قبل مظفر آباد کے ضلع میں ''محاذ'' کی تنظیم بہت کمزور تھی۔ میں نے بڑی تگ و دو کے بعد سارے ضلع کے مختلف مقامات پر تنظیم کو مضبوط بنایا۔ اس ضلع میں میری کوشش سے کئی دیرینہ سیاسی کارکن مسلم کانفرنس سے کٹ کر ''محاذ'' میں شامل ہو گئے جن میں سردار محمد زمان خان صاحب عباسی، محمد یوسف زرگر اور نذیر احمد گھڑی ساز وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ 1969ء میں مظفر آباد میں پہلی بار ''محاذ'' کا سالانہ کنونشن ہوا جو انتہائی کامیاب رہا۔ اس کنونشن کا سارا انتظام میرے ہی ہاتھوں ہوا تھا۔ موجودہ حکمران جماعت ان سرگرمیوں کی وجہ سے میرے خلاف ہو گئی۔

۲۔ گزشتہ سال کے انتخابات کا چونکہ ''محاذ'' نے بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ میں ان دنوں گریز کے علاقہ میں تھا۔ میں نے وہاں بائیکاٹ کی مہم موثر انداز میں چلائی۔ جس کے نتیجہ میں وہاں اسی فیصد سے بھی کم ووٹ ڈالے گئے۔ سردار عبدالقیوم خان صاحب کو وہاں سے کل 65 ووٹ ملے۔ جب کہ وہاں رائے دہندگان کی تعداد ہزاروں تک تھی۔ یہ بات بھی حکمران جماعت کو بہت ناگوار گزری۔

۳۔ اس سال جب آزاد کشمیر اسمبلی کا پہلا اجلاس مظفر آباد میں شروع ہوا تو اس موقعہ پر ''محاذ'' کی طرف سے میں نے اسمبلی ہال کے باہر مظاہرہ کرایا۔ جس میں گلگت بلتستان کے سلسلہ میں حکمران جماعت اور صدر آزاد کشمیر کی وعدہ خلافیوں اور دھاندلیوں پر سخت تنقید کی گئی تھی۔

۴۔ قومی محاذِ آزادی کے جانبازوں جناب محمد مقبول بٹ، جناب ہاشم قریشی اور جناب اشرف قریشی کا پاکستان کے علاوہ آزاد کشمیر میں والہانہ استقبال، جلسوں اور اس سلسلے میں جملہ انتظامات میں میں پیش پیش تھا۔ یہ بات حکمران جماعت کے لیے وجہ ناگواری بنی اور میں ان کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

آخر میں میں قابل احترام عدالت سے گزارش کروں گا کہ میرا جرم صرف حق پرستی اور جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لینا ہے اور اس حق سے میں قطعاً دست بردار نہیں ہوں گا۔ اگر حکومت

لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ محبِ وطن ہو۔ اور نام ظاہر کرنے سے وہ اور اس کے ساتھی بھارتی بربریت کا شکار بن جائیں۔ اس خط کا مفہوم صرف اس قدر تھا کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سلسلے میں حکومت پاکستان ہماری کہاں تک مدد کرسکتی ہے۔ بعد میں وادی کا متذکرہ شخص میرے پاس لایا گیا جو کشمیری زبان بولتا تھا۔ اور لب ولہجہ سے وہ اسلام آباد کشمیر کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ سردار عبدالقیوم خان صاحب صدر آزاد کشمیر کی دعوت پر یہاں لایا گیا اور اس نے سردار صاحب سے ملاقات کی تھی اور ان کا مہمان بھی رہا تھا۔ سردار صاحب کے علاوہ متذکرہ شخص ڈاکٹر سلام الدین نیاز سے بھی ملا تھا اور وہ شخص بعد میں جب ملا تو سردار صاحب کا لکھا ہوا خط اس نے مجھے دکھایا۔ جس پر مجھے یقین ہوگیا اس شخص نے قبل ازیں خط لکھ کر معلومات حاصل کرنا چاہیں تھیں۔ اور یہ اس اصل آدمی سے تقریباً ملتا جلتا تھا جو مجھے ایک دفعہ مولوی فاروق صاحب کے ہاں ملا تھا۔ البتہ پانچ چھ سال کے بعد اس کا قد ملاقات کے وقت سے کچھ بڑا دکھائی دیا تھا لیکن اس واقعہ کو اس طرح بنانے اور مجھے اس کی شہادت دینے کے لیے تشدد کیا جاتا رہا اور مجھ سے یہ کہلوانے کی کوشش کی جاتی رہی کہ متذکرہ صدر شخص کے بارے میں یہ اقبال کرلوں کہ وہ شخص ایک ہندو تھا۔ بلکہ اُن کی خواہش تھی کہ میں اُسے دوار کا ناتھ کہوں (جو مبینہ طور پر جناب ہاشم قریشی کو سرینگر ائیر پورٹ پر ملا تھا۔ اور یہ کہ وہ ہندو اس لیے آیا تھا کہ وہ جناب ہاشم قریشی اور جناب اشرف قریشی کو کامیاب اپریشن کے بعد واپس لے جائے اور میں مظفر آباد میں اسی مقصد کے لیے مقیم رہا تھا۔ قبل ازیں یہ افواہ بھی آزادی کے دشمنوں نے منظم طور پر پھیلائی تھی کہ ہم میر پور اور ڈڈیال میں استقبال کے دوران ہاشم واشرف کو کھوئی رٹہ سے حدِ متارکہ پار کرانا چاہتے تھے۔ یہاں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے پاس خط اور پھر متذکرہ شخص کو لانے والے علی شیر کو کئی ماہ تک ''دلائی'' میں ظلم و ستم اور تشدد اور مار پیٹ کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ شخص تشدد کے باوجود پولیس کی بتائی ہوئی کہانی نہیں مانتا تھا ہوسکتا ہے کہ حکومت نے اسے اصل واقعات سے بے خبر رکھ کر اس سے یہ کام لیا ہو۔ میرے ''دلائی'' سے مظفر آباد جیل آنے تک وہ وہیں تھا، معلوم نہیں کہ اسے باضابطہ طور پر گرفتار کیا گیا تھا یا ویسے ہی زیر تفتیش رکھا ہوا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اب اس سے اپنے مطلب کی بات کہلوائی گئی

سرزمینِ جموں کشمیر کے عظیم حریت پسند راہنماؤں پر لاہور کے شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں روا رکھے گئے وحشیانہ سلوک کے اذیت ناک مناظر۔

گنگا ہائی جیکنگ کیس کے دوران لاہور کے شاہی قلعے اور پاکستان کے دیگر عقوبت خانوں میں وطنِ عزیز جموں کشمیر کے عظیم آزادی پسند راہنماؤں محمد مقبول بٹ، جی ایم لون، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، اشرف قریشی، ہاشم قریشی، عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ اور پیرزادہ غلام مصطفےٰ علوی پر ظلم و تشدد، انسانیت سوز سلوک اور وحشیانہ مظالم کے جو گھناؤنے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے ان کی تفصیلات آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ میر عبدالقیوم صاحب نے اپنے عدالتی بیان ''اب منزل دور نہیں'' کو کتابی صورت میں شائع کرواتے وقت ان وحشیانہ مظالم کے تصویری خاکے شاملِ اشاعت کیے تھے۔ یہ خاکے اس کتاب میں بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔ کشمیری حریت پسندوں پر یہ شرمناک مظالم ڈھانے والے کس سلوک کے مستحق ہیں، یہ فیصلہ ہم وقت کی عدالت اور کشمیر کی نئی نسل پر چھوڑتے ہیں۔

(مرتب)

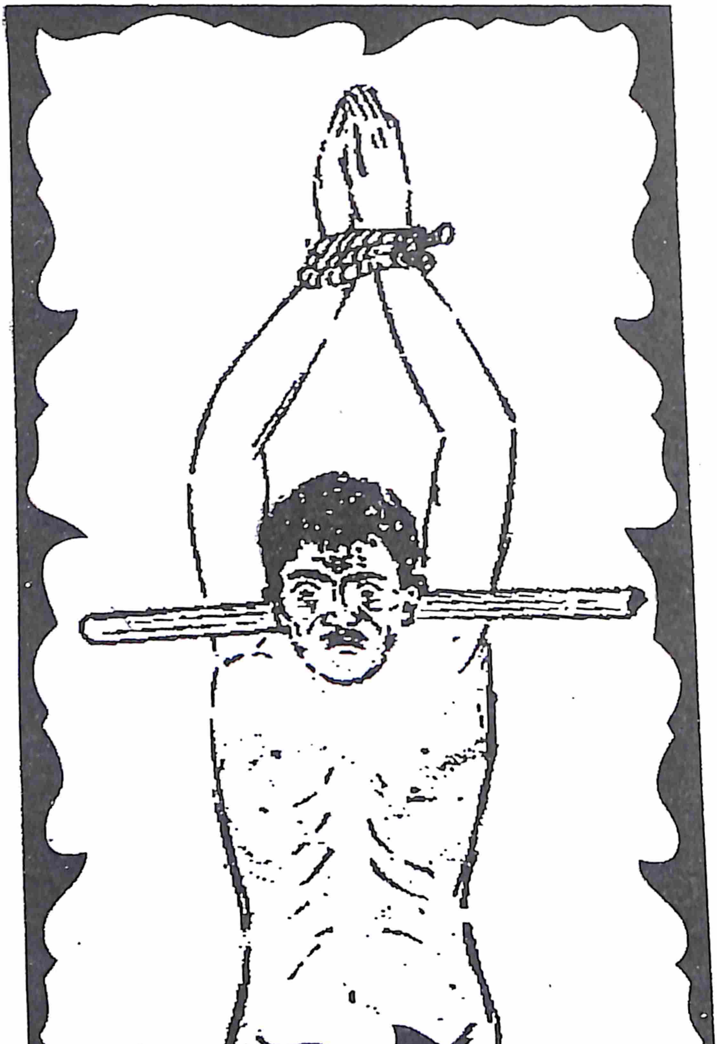
کے پاس میرے یا میرے رفقاء کے خلاف کوئی مواد موجود ہے تو اسے چاہیے کہ وہ عام قانون کے تحت ہم پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے۔ کسی شہری کو بدوں مقدمہ چلائے مہینوں حبسِ بے جا میں رکھنا ایک جمہوری اور اسلامی نظام کی دعویدار حکومت کو زیب نہیں دیتا۔ میں اپنے اوپر کیے گئے جبر و تشدد اور حبس بے جا کے دوران غیر انسانی سلوک کی پوری تفصیل اس وقت بیان کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ میری حبس بے جا کے درخواست دہندگان بھی اس وقت میرے ساتھ حبس بے جا میں ہیں۔ اور ہمیں ''دلائی'' سے مظفر آباد جیل لاتے وقت یہ بتایا گیا تھا کہ ہمیں پھر ''دلائی'' آنا پڑے گا۔ میں اپنے بیان کو اس آیت پر ختم کرتا ہوں۔

حَسبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیہِ تَوَکَّلتُ وَ ھُوَ رَبُّ العَرشِ العَظِیم۔

ملتمس

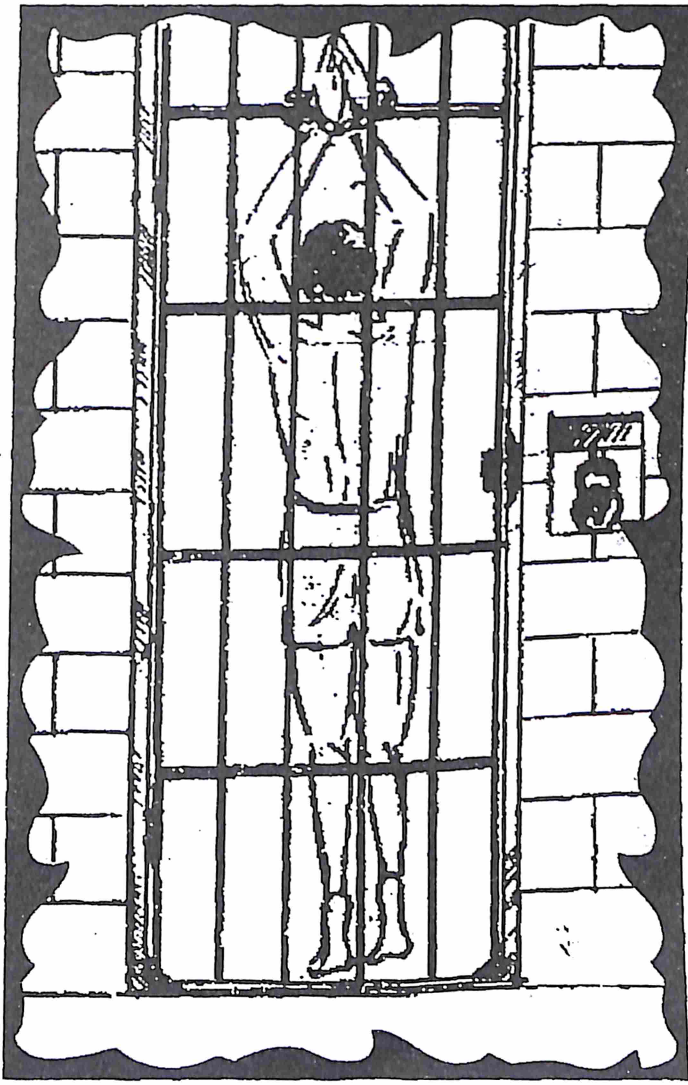
ظالم تمام میری تباہی پہ مُصر تھے
میں بھی تو اپنے عہدِ وفا کا اسیر تھا
(افضل ضیائی)

''او اشرف! توں اتھے کی لین آیا سیں ....''



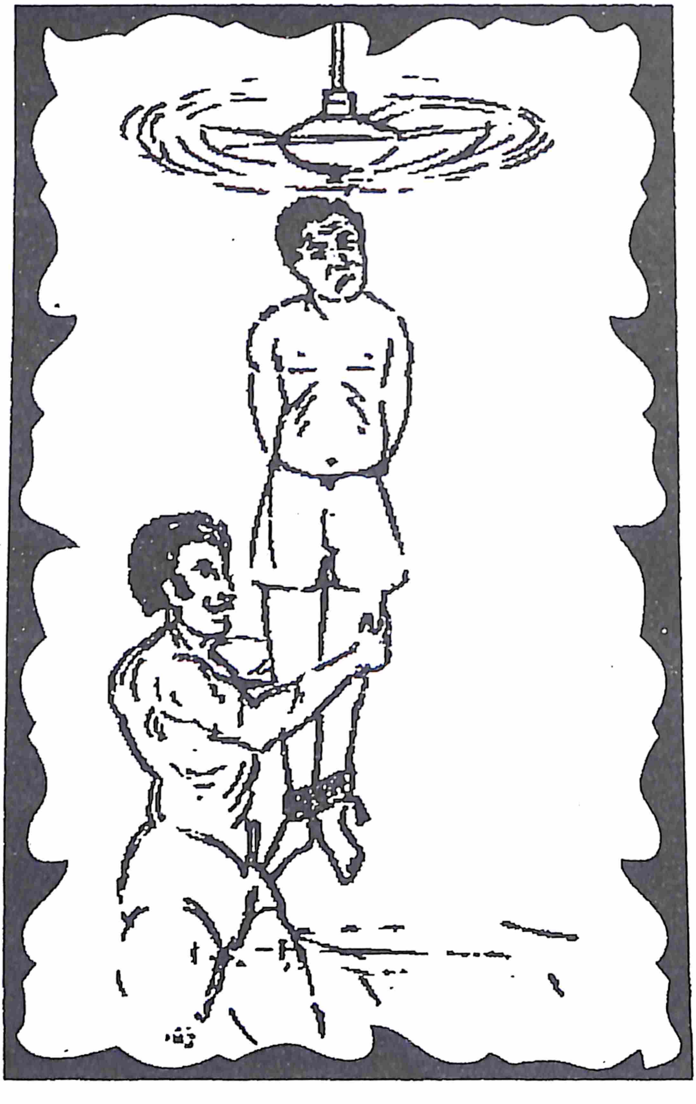
آپریشن نمبر ۲۔ ہاتھوں کو رسی سے کس کر اور ڈنڈا بازوؤں کے آگے رکھ کر گردن کے ساتھ کسا جاتا۔

"او ہاشم! توں آئندہ بھارت دا طیارہ اغوا کریں گا ...."



آپریشن نمبر ا ۔ اُلٹی ہتھکڑی لگا کر ایڑھیوں کا اُٹھا کر رات بھر دروازے کے ساتھ جکڑا جانا۔

''او کشمیریا! تیری ایسی تیسی حق اختیاری منگناں ایں ....''



آپریشن نمبر ۲۔ ٹانگوں اور بازوؤں کو باندھ کر ایک شخص کا اٹھا کر چلتے ہوئے پنکھے کی طرف لے جانا۔

"دکشمیر کشمیر کرن دا نتیجہ تکیا ای ...."



آپریشن نمبر ۳۔ چمٹی سے بال نوچنا۔

"دشمن دس آزادی دا سواد آیا ای ...."



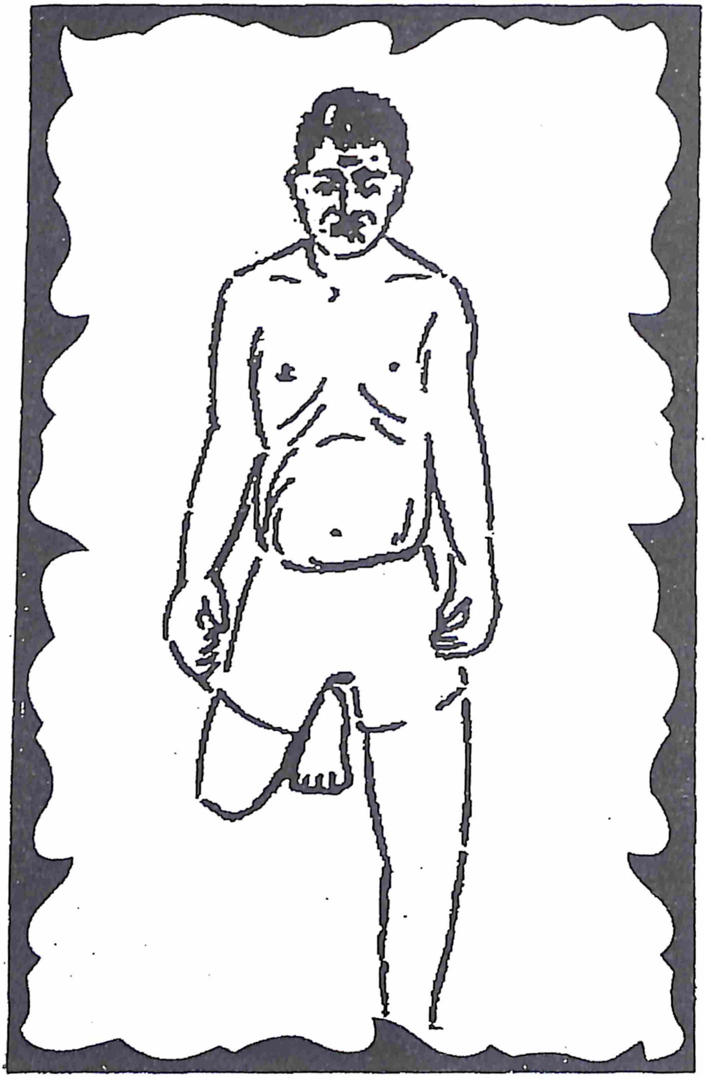
آپریشن نمبر ۶ ۔ غلاظت کا توبرہ گلے میں لٹکانا اور مادرزاد ننگا کر کے باہر گھمانا۔

''او پیر زادیا! سنا کی حال ای ....''



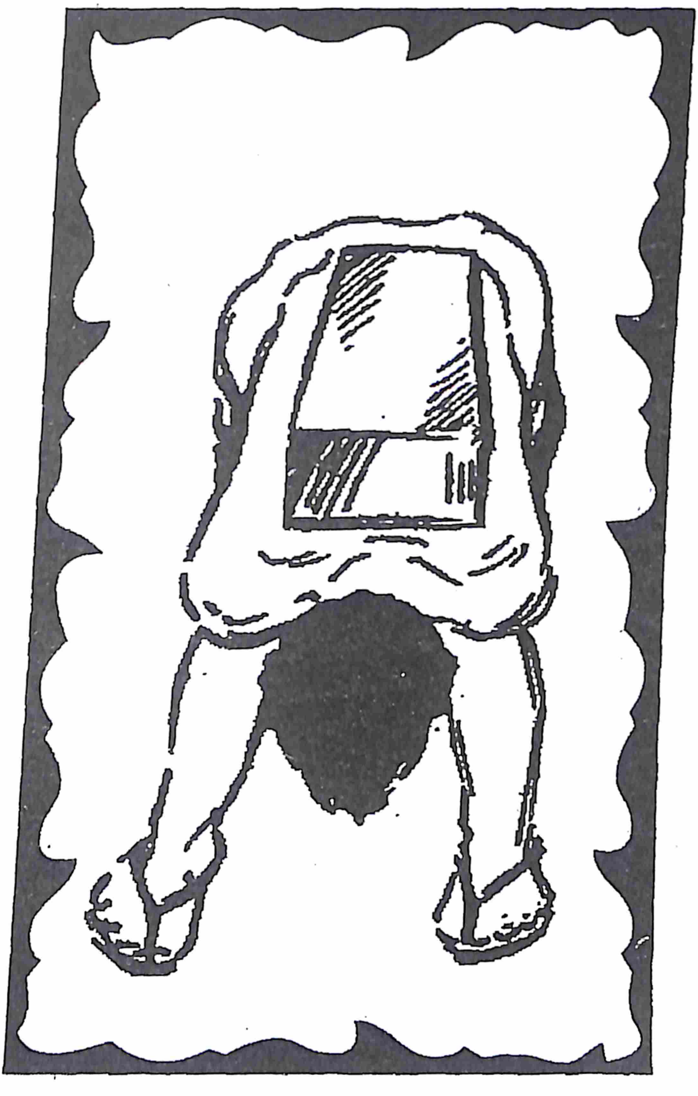
آپریشن نمبر ۵۔ زنبور سے ناک کا پکڑنا۔

''اوئے! گھبرائیں تینوں اساں کپڑے وی نہ پان دیاں گے ......''



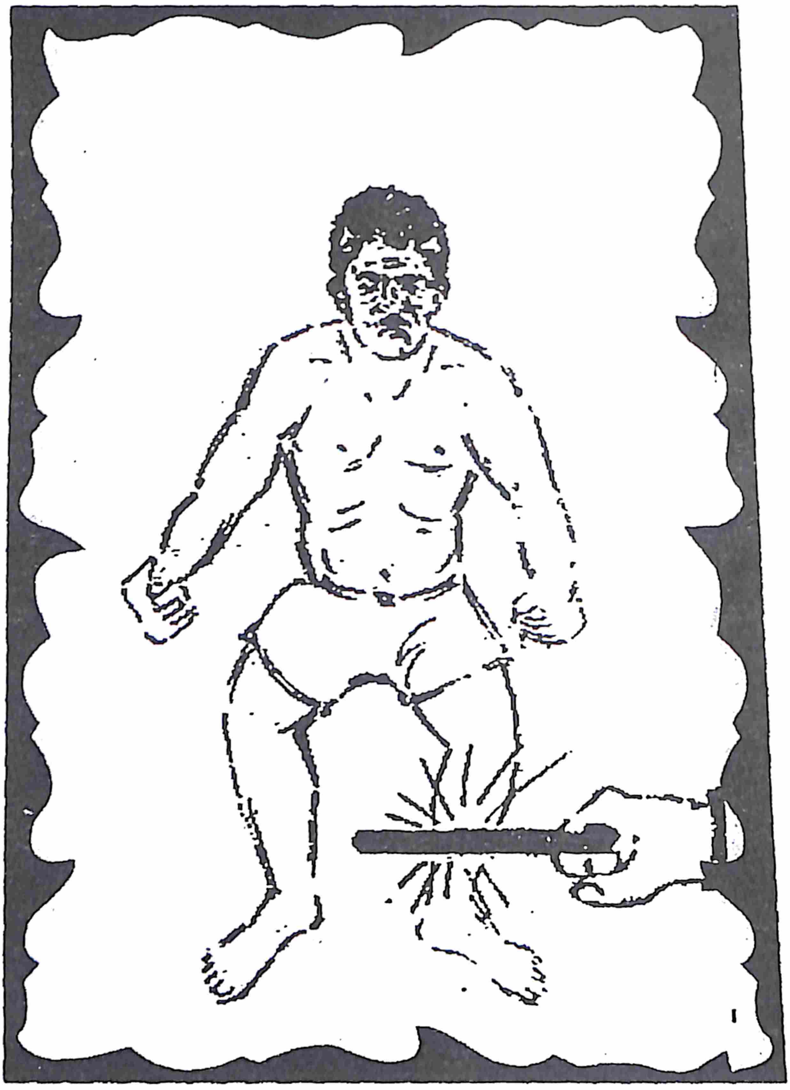
آپریشن نمبر ۸۔ ایک ٹانگ کے بل گھٹنوں دھوپ میں مادرزاد ننگا کھڑا رکھنا۔

''اوئے! اے کراچی نئیں ہُن لاہور ای ....''



آپریشن نمبر ۷۔ مرغا بنا کر پیٹھ پر پتھر رکھنا۔

''اوئے ! بھارت دے خلاف گل کیتی تے ٹُن کے رکھ دیاں گا ای ......''



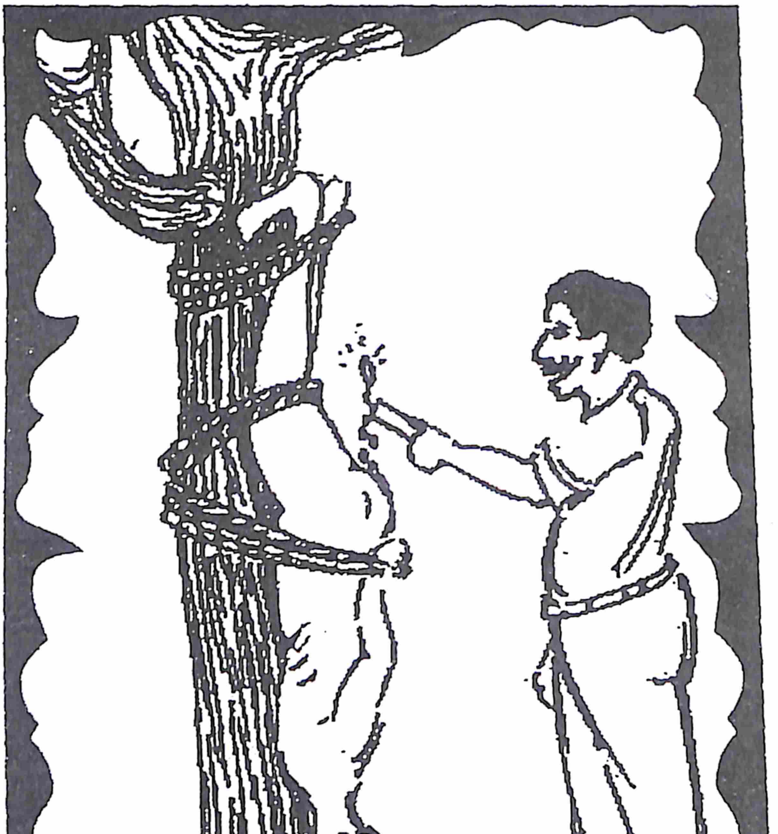
پریشن نمبر ۱۰۔ کرسی کی پوزیشن میں بٹھا کر پہروں اس پوزیشن میں رکھنا اور پوزیشن بدلنے کی صورت میں ڈنڈے مارنا۔

"آزادی منگو گے تے تہانوں چھتراں دے ہار پانواں گے ...."

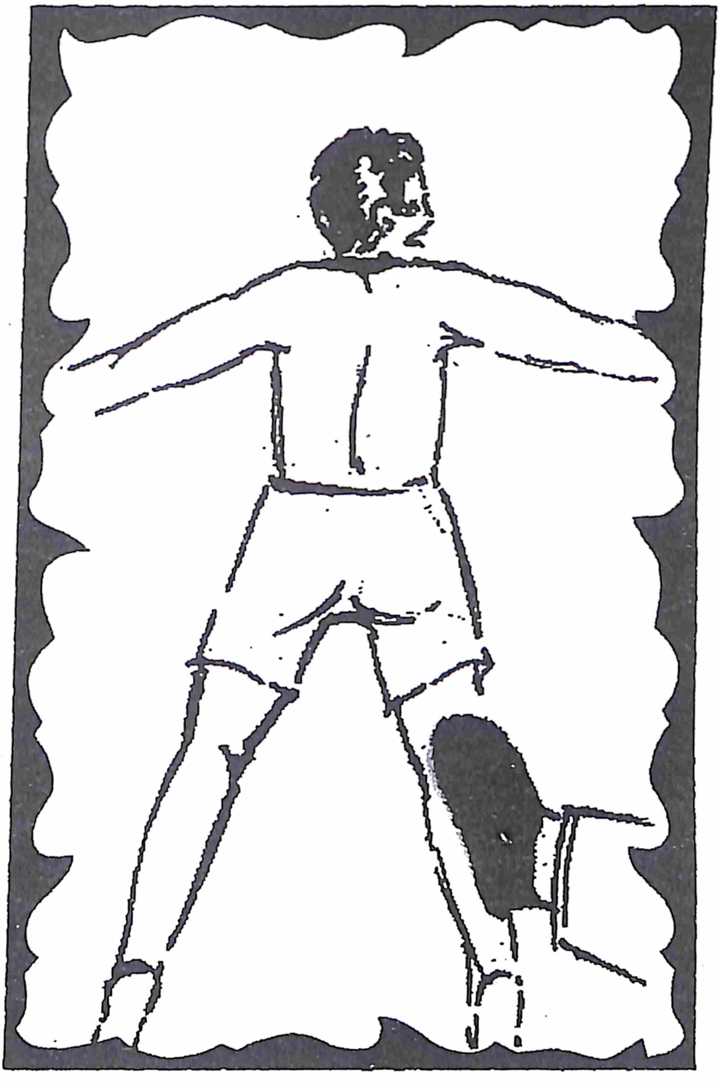


آپریشن نمبر ۹۔ گردن میں ڈنڈا کس کر جوتوں کا ہار پہنانا اور مادر زاد ننگا کر کے تپتی ہوئی ریت پر چلانا۔

"او کشمیریو! ہور منگو آزادی ......"



"آزادی منگن دا نتیجہ...... لتاں تے ٹھڈے........"



آپریشن نمبر ۱۱۔ مادرزاد ننگا کر کے وحشیوں کا اچھل اچھل کر ٹانگیں مارنا۔

کتابیات

اس کتاب کی تیاری میں حسب ذیل کتب، رسائل اور اخبارات سے مواد حاصل کیا گیا۔

1۔ ''عدالتی بیان، مقبول بٹ شہید'' شائع کردہ، ڈیفنس کمیٹی برائے ہائی جیکنگ کیس
2۔ ''آتشِ چنار'' عدالتی بیان، جی ایم لون، شائع کردہ، جموں کشمیر محاذ رائے شماری، مطبوعہ لاہور
3۔ ''اب منزل دور نہیں'' عدالتی بیان، میر عبدالقیوم شائع کردہ، ڈیفنس کمیٹی، مطبوعہ اکتوبر 1972ء
4۔ ''حدیثِ وفا'' عدالتی بیان، میر عبدالمنان، شائع کردہ، ڈیفنس کمیٹی، ستمبر 1972ء
5۔ ''گنگا، آمریت اور سامراج'' ہاشم قریشی، شائع کردہ، ڈیفنس کمیٹی برائے ہائی جیکنگ کیس
6۔ ''سوئے دار چلے'' عدالتی بیان، اشرف قریشی شائع کردہ، ڈیفنس کمیٹی برائے ہائی جیکنگ کیس
7۔ ''قولِ فیصل'' عدالتی بیان، عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ شائع کردہ، جموں کشمیر محاذ رائے شماری، میرپور
8۔ ''سخنِ فیصل'' عدالتی بیان پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی شائع کردہ، جموں کشمیر محاذ رائے شماری، میرپور
9۔ ''گنگا'' (ناول) ناصر ادیب مطبوعہ الجہاد اکیڈمی لاہور
10۔ ''فاتحینِ گنگا'' (ناول) ابو ناصر مطبوعہ فروری 1971ء لودھی پبلی کیشنز، لاہور
11۔ ''ہاشم قریشی کا قوم کے نام پیغام'' ہاشم قریشی مطبوعہ 2001ء، سری نگر
12۔ ہفت روزہ ''کہانی'' ایڈیٹر ضیاء شاہد جولائی 1972ء لاہور
13۔ ہفت روزہ ''جہاں نما'' ایڈیٹر طارق فاروق 15 مئی 1975ء لاہور
14۔ ہفت روزہ ''الفتح'' (متفرق شمارے) کراچی
15۔ روزنامہ ''مساوات'' فروری 1971ء لاہور
16۔ روزنامہ ''جمہور'' 17 مئی 1973ء لاہور
17۔ ہفت روزہ ''لیل و نہار'' ایڈیٹر ضیاء شاہد جون 1973ء لاہور
18۔ ماہنامہ ''منشور'' ایڈیٹر سبطِ اختر (متفرق شمارے) کراچی



گنگا ہائی جیکنگ کیس نے حکومتِ پاکستان کی کشمیر دوستی کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا۔ انٹیلی جنس اداروں، سیاست دانوں اور دانشوروں کے چہروں سے بھی نقاب اُلٹ گئے۔ یہ بات ثابت ہو گئی کہ تحقیقات کے نام پر جو عدالتی کمیشن بنایا گیا تھا اس کا مقصد صرف اور صرف کشمیر کی تحریک آزادی کی پیٹھ میں چھُرا گھونپنا اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے مخلص کارکنوں اور قائدین کو عوام کی نظروں میں مشکوک ٹھہرانا تھا۔

دوسری طرف اس واقعہ نے کشمیر کی نئی نسل کو غلط فہمیوں اور مغالطوں سے نکال کر انہیں باور کروا دیا کہ ایک غاصب دوسرے غاصب کا دوست تو بن سکتا ہے لیکن وہ مظلوم و محکوم قوم کا ہمدرد یا دوست کبھی نہیں ہوسکتا۔ لاہور کے شاہی قلعے میں کشمیر کے عظیم، جانباز اور باکردار حریّت پسندوں پر جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے وہ تاریخ کشمیر کا ایک شرمناک باب ہے۔ کشمیری محقّق و مصنف محمد سعید اسعد نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے یہ تاریخی ریکارڈ جمع کر کے کشمیر کی نئی نسل کے سامنے کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ ایک گراں قدر کارنامہ ہے جس کے لئے موصوف تحسین و آفرین کے حق دار ہیں۔

عبدالخالق انصاری ایڈووکیٹ

میر پور

Price Rs. 300

ISBN 978-969-9493-01-0